پرانی آنکھیں نئے خواب
امجد اسلام امجد

پرانی آنکھیں نئے خواب

(طنز و مزاح)

امجد اسلام امجدؔ

تجاوزات!

اخبارات میں چھپنے والی کچھ سرخیوں کے الفاظ ہمیں ہمیشہ مخمصے میں ڈال دیتے ہیں اور بہت غور کرنے کے بعد بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مخصوص الفاظ یا تراکیب کے استعمال کی اصل غایت اور مدعا کیا ہے؟ مثلاً آج ہی کے اخبار میں ہم نے پھر ''ڈاکے کی دلیرانہ واردات'' کی سرخی دیکھی ہے خبر کے متن میں درج ہے کہ چار ڈاکوؤں نے ایک خاتون خانہ اور اس کے بچوں کو اسلحے کے زور پر بے بس کر کے رسیوں سے باندھ دیا اور پھر گھر میں ڈیڑھ گھنٹے لوٹ مار کرنے کے بعد جو کچھ ہاتھ لگا' لے کر چلتے بنے اور جاتے ہوئے انتباہ کر گئے کہ اگر پولیس میں رپورٹ کی تو یہ معاملہ دہرایا بھی جاسکتا ہے۔

کسی معاشرے میں قانون شکن عناصر' پیشہ ور بدمعاشوں اور سنگدل قاتلوں کا نہتے اور معصوم شہریوں پر یہ ظلم اگر ''دلیری'' قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر ''کارطفلاں'' ہی نہیں ''کارقوم'' بھی تمام شد ہی سمجھنا چاہیے۔ ہم نے پہلے بھی اپنے کالموں اور ڈراموں میں اہل نظر کی توجہ اس طرح کی فروگزاشتوں کے تباہ کن اثرات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ کسی برائی کو گلوری فائی کرنے اور اسے نمایاں کرنے میں بہت باریک سا فرق ہوتا ہے اور اس فرق کو ضرور قائم اور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ جو آج شہر کی کوئی سڑک' گھر' موڑ اور انسانی زندگی ''ڈاکوؤں'' سے محفوظ نہیں ہے تو اس کی بے شمار وجوہات میں سے ایک بہت اہم وجہ الفاظ اور تراکیب کا یہ بے محل استعمال بھی ہے جو میڈیا کی ڈولی میں بیٹھ کر ہر آنگن میں جا اترتا ہے۔

گزشتہ کئی دنوں سے لاہور شہر کی سڑکوں کو تجاوزات سے پاک کرنے کا نعرہ لگایا جا رہا ہے لاہور کی انتظامیہ' میٹرو پولیٹن کارپوریشن اور ایل ڈی اے کے اشتراک سے شروع ہونے والا یہ منصوبہ اخباری اطلاعات کے مطابق اب عید کے بعد تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے البتہ میاں نواز شریف کے گھر کے قریب تجاوزات چونکہ بہت ہی زیادہ ''ناجائز'' تھے اس لیے ان کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ اول تو ہمیں ''تجاوزات کے ساتھ یہ ''ناجائز'' کا سابقہ بہت عجیب محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس سے جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ تجاوزات جائز بھی ہوتے ہیں اب یہ تجاوزات کون سے ہیں اور کیسے ہیں؟ ان پر اہل علم تو غالباً کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے البتہ اہل اقتدار کی وضاحت سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ وہ تجاوزات جو ان کی طرف سے یا ان کی اجازت اور آشیرباد سے ہوں انہیں ''جائز تجاوزات'' کہا جاتا ہے۔

مروجہ معانی میں تجاوز کا مطلب کسی مقرر کردہ حد یا قانونی پابندی سے آگے نکل جانا ہوتا ہے یعنی جب کوئی شخص یا گروہ کسی تسلیم شدہ حد کو توڑ دے یا اس سے باہر نکل جائے یا اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرے تو اسے ''تجاوز'' سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر ہماری پولیس کے کچھ اختیارات ہیں کہ جرائم کی روک تھام کے لیے وہ مختلف لوگوں یا مقامات کو چیک کر سکتی ہے اور معقول شبے کی صورت میں جانچ پڑتال بھی کی جا سکتی ہے۔ پولیس کی موجودہ ناکہ بندیاں اور رات کے وقت موٹر سائیکلوں پر دو مردانہ سواریوں کی ممانعت وغیرہ کا تعلق بھی انہیں اختیارات سے جا ملتا ہے۔ اب اس سے قطع نظر کہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کی صورت حال اس کے باوجود بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے ہم ان اختیارات سے تجاوز کی ایک حالیہ اور بدترین مثال کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

دی ''نیوز'' کے سینئر نیوز ایڈیٹر رانا جاوید کی پولیس والوں کے ہاتھوں مبینہ ہلاکت کی تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی لیکن اب تک ملنے والی اطلاعات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ شہر کی نسبتاً غیر آباد سڑکیں رات کے وقت بدمعاشوں اور پولیس والوں کی محبوب شکارگاہیں ہیں۔ کوئی ایسی گاڑی یا موٹر سائیکل جہاں ایک مرد اور ایک عورت نظر آ جائیں ان کی رال کے ٹپکنے کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ سو میں سے دو چار دس ایسے شکار ضرور مل جاتے ہیں جو محبت کے مارے کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو حال دل سنانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ باقی لوگوں کو نکاح نامے طلب کر کے یا انہیں کچھ دیر پریشان کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ محکمہ پولیس کے احباب اسے ناجائز تو کیا تجاوزات بھی ماننے کو تیار نہیں ہوں گے لیکن رانا جاوید کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا کسی مہذب معاشرے میں اس کو برداشت کیا جا سکتا ہے؟ گوجرانوالہ میں مسلمان بھائی اور دو تین مختلف مقامات پر مسیحی بھائیوں پر جو ظلم توڑا گیا کیا ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے؟ جو معاشرہ انسانی زندگیوں کے معاملے میں ''تجاوزات'' کے ایسے گھناؤنے مظاہرے کر سکتا ہو اس کے نزدیک سڑکوں اور عمارتوں کے تجاوزات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے!!

سنا ہے فیصل آباد شہر میں تجاوزات کو ختم کرنے کے سلسلے میں مثالی کام ہوا ہے اللہ کرے یہ خبر ٹھیک ہو لیکن لاہور میں سارے ''ناجائز تجاوزات'' کو جس طرح میاں نواز شریف کے گھر تک محدود کر دیا گیا ہے یہ محل نظر ہی سمجھا جائے گا۔ کچھ عرصہ قبل سابق گورنر پنجاب میاں محمد اظہر نے بھی یہ کام شروع کیا تھا اور لاہور کی تاریخ میں پہلی بار اس سمت میں مثبت پیش رفت بھی ہوئی تھی ہمارے نزدیک اس کامیابی (وقتی اور جزوی ہی سہی) کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میاں اظہر نے تجاوزات گرانے کا کام اپنے سگے بھائی اور اس وقت کے وزیر اعظم میاں نواز شریف کے ماموں کی طرف سے کیے گئے تجاوزات سے شروع کیا تھا۔ موجودہ حکومت بھی یہ کام اپنے

کسی مہربان یا جیالے کے گھر سے شروع کرتی تو یقیناً اس کا بہت مثبت اثر پڑتا۔ موجودہ حالات میں ہمارے اندازے کے مطابق یہ مہم اول تو شروع ہی نہیں ہوگی اور اگر دو چار قدم چلی بھی تو کسی کھلے مین ہول میں گر کر فوت ہو جائے گی کیونکہ لاہور کے ۹۸ فیصد تجاوزات انہی لوگوں کے کارنامے ہیں جو اپنے آپ کو سیاسی کارکن کہتے ہیں اور حکومت کو یا تو اپنے احسانوں' وفاداریوں اور سٹریٹ پاور کے رعب اور دباؤ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں یا پھر اپوزیشن کے حوالے سے دشمنی اور کینہ پروری وغیرہ کا پروپیگنڈہ کر کے اپنا مقصد پورا کر لیتے ہیں۔ ایسے میں اب یہ حکومت کے کارپردازوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنا کام بغیر کسی تعصب' تحریص اور خدشے کے پوری قوت اور ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیں اور ''تجاوزات'' کے تعین میں جائز اور ناجائز کی کسی تفریق کو روا نہ رکھیں کہ تجاوزات کے اندر ہی ان کا ناجائز ہونا ثابت ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ ان کا محرک زید ہے یا بکر یا عمر۔

◆◆◆

ڈاکٹر محبوب الحق کی باتیں

غالب نے کہا تھا:

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
کیوں شاہد گل' باغ سے بازار میں آوے!

معاشیات کے بارے میں ہمارا علم اور معلومات بھی کم وبیش اسی شعر کے گرد گھومتی ہیں باقی رہے اعداد وشمار اور اسباب وعلل تو وہ یقیناً ڈاکٹر محبوب الحق جیسے ماہرین معاشیات کا میدان ہے کہ اس وقت وہ غالباً پاکستان کی ان پہلی تین شخصیات میں سے ہیں جنکی ذہانت اور دانشوری کا اعتراف سچ مچ کے بین الاقوامی پلیٹ فارموں پر کیا جاتا ہے۔ذاتی طور پر ہمیں ان سے ہم وطنی اور ذوق شعری (ڈاکٹر صاحب نے فیض صاحب بہت سی نظموں کے انگریزی تراجم بھی کیے) کے علاوہ ایک اور نسبت بھی ہے اور وہ یہ کہ ہمیں انکے والد مرحوم ایم اے عزیز صاحب کا شاگرد ہونے کا فخر بھی حاصل ہے اور آج بھی مسلم ماڈل ہائی سکول کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی شفقت بھری آواز اور مخصوص لہجہ ذہن میں گونج گونج جاتا ہے۔

سیاست' تیسری دنیا کے ملکوں کی سیاست اور پھر پاکستان کی سیاست' ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر لباس اور صاحب لباس کو ننگ وجود بنا دیا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کو بھی اس شوق منزل کا بھرپور تاوان ادا کرنا پڑا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگ تو ان کے علم وفضل سے استفادہ کرتے ہیں مگر خود ہمارے معاشرے میں ان سے کسب فیض کی راہ میں دیواریں ہی دیواریں ہیں۔علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں غنی کاشمیری کے جس شعر کی تضمین کی ہے وہ اس صورت حال کا بہترین عکاس ہے کہ

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

ترجمہ: غنی! حضرت یعقوب کی بدنصیبی دیکھ کہ ان کی آنکھوں کا نور (حضرت یوسف علیہ السلام) ان کی بجائے زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر رہا ہے۔

گذشتہ دنوں ہمیں برادرم جمیل الدین عالی کے توسط سے ''جنوبی ایشیا میں انسانی ترقی ۱۹۹۷ء'' کے عنوان سے لکھی ہوئی محبوب الحق صاحب کی ایک مفصل رپورٹ کے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ اس رپورٹ کو انہوں نے ''اقتصادی وسائل اور مسائل کا مشاورتی جائزہ'' کا نام دیا ہے۔ یہ رپورٹ ابتداء انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی اور اپریل ۹۷ء میں اس کی تقریب رونمائی اسلام آباد سمیت جنوبی مشرقی ایشیا کے کئی ایک ممالک میں ہو چکی ہے اب باہمی صلاح مشورے سے اسے اردو' ہندی' بنگلہ اور سری لنکن زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفیض ہو سکیں۔ اردو ترجمہ عالی صاحب کی نگرانی میں محمد احمد سبزواری صاحب نے کیا ہے جو علمی تحریروں کے ترجمے میں برسوں پر محیط شہرت کے حامل ہیں۔

اس جائزے میں جنوبی ایشیا کے مسائل اور وسائل کی جو منظر کشی کی گئی ہے اور حوالے اور ثبوت کے طور پر جو اعداد و شمار پیش کیے گئے سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر ہاتھوں کے تو کیا ہر طرح کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ اسے ہماری کوتاہ نظری کہیے یا مغربی میڈیا کی تشہیر کہ ہم اپنے تئیں معاشی اور انسانی وسائل کے اعتبار سے ایشیا کو افریقہ سے بہت بہتر سمجھتے رہے ہیں بلکہ ان تک سمجھتے ہیں جبکہ جدید تحقیق اور اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم عملی طور پر ہر میدان میں ان سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ شرح خواندگی ہو یا شرح تعلیم! قومی پیداوار ہو یا غربت کی سطح! ہر شعبے میں ان کی کارکردگی (جو اگرچہ باقی دنیا کے مقابلے میں اب بھی افسوسناک ہے) ہم سے بہتر ہے۔ چین' جاپان اور مشرقی ایشیاء کے ممالک کوریا' سنگاپور' تائیوان' ملائیشیا' انڈونیشیا وغیرہ کی ترقی کے باوجود یہ خطے جو آج کل سارک ممالک کہلاتے ہیں دنیا بھر میں سب سے نچلی صف میں آتے ہیں اور ان میں بھی نیپال اور بھوٹان کو چھوڑ کر پاکستان کا نمبر آخر میں آتا ہے۔

اتفاق سے ڈاکٹر محبوب الحق نے بھی اس اجتماعی اور ہمہ گیر زوال کی کیفیت کا اصلی سبب اسی ''فیوڈل ازم'' کو قرار دیا ہے جس کی چیرہ دستیوں کا ذکر ہم اپنی تحریروں میں اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے فیوڈل ازم کو ایک مخصوص طبقے کے بجائے امیر اور زور آور کے غریب اور بے کس پر کیے جانے والے ظلم اور استحصال کے رویئے کا نام دیا ہے جو تھیوری کے اعتبار سے بالکل درست ہے لیکن پاکستان کے تناظر میں اگر اس کو اس مخصوص ''حاکم طبقے'' کے حوالے سے ہی دیکھا اور سمجھا جائے تو غالباً بات زیادہ واضح اور شفاف ہو سکتی ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات ہے اصل مسئلہ یہی ہے کہ تاریخی طور پر پاکستان بننے کے بعد زمام اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو ہمارے سابق آقاؤں کے نمائندے' مددگار اور یادگار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے کبھی بھی پاکستان کے عوام کو اپنا دوست اور بھائی نہیں سمجھا اور ہمیشہ ان کے ساتھ رعایا کا سا سلوک کیا ہے اور انہیں ''رعایا'' کی سطح پر رکھنے کے لیے علم' شعور'

تعلیم اور معاشی ترقی کی طرف کھلنے والے ہر راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی ہیں ور انسانی ترقی سے مراد ہمیشہ اپنے مخصوص طبقے کی ترقی ہی لی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک حالیہ گفتگو میں ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا کہ ساٹھ کی دھائی کے ابتدائی عشروں میں جب وہ پلاننگ کمیشن میں ایک نوجوان افسر کے طور پر ملازم ہوئے تو مغربی پاکستان کے بجٹ کے حوالے سے ان کی ملاقات ہر سال ملک امیر محمد خاں مرحوم (گورنر) سے ہوتی تھی ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ مرحوم بجٹ کی ساری شقوں سے اتفاق کرتے جاتے مگر جونہی تعلیم کا نمبر آتا جیب سے سرخ روشنائی والا قلم نکال کر اس پر پھیر دیتے۔ ایک بار جب ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے گورنر صاحب سے اشارہ کہا کہ وہ خود بھی آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے ہیں اور یہ تعلیم کی برکت ہی سے ہے کہ وہ پورے صوبے کا نظام چلا رہے ہیں تو ملک صاحب مرحوم نے مسکرا کر کہا۔

”ایک صوبے کے لیے تمھیں ایک ہی گورنر چاہیے نا! سو وہ ہے! کیا ضرورت ہے ان سب گدھوں کو پڑھانے لکھانے کی!“

ایک زمانے میں ہمارے ڈرامے ”وارث“ کے مرکزی کردار ”چودھری حشمت“ کو ملک امیر محمد خاں صاحب سے تشبیہہ دی جاتی تھی۔ ہم نے اس وقت بھی کہا تھا اور اب بھی کہتے ہیں کہ فیوڈل کلاس کی پہچان شخصی نمائندے نہیں بلکہ اس کا وہ اجتماعی انسان کش رویہ ہے جس کے باعث ملک کے ۹۰ فیصد عوام افتادگان خاک بننے پر مجبور ہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کے معاشی نظریات سے اختلاف ممکن ہے۔ بلاشبہ ان کے تجزیوں سے مختلف اور جزوی طور پر بہتر معاشی نظریات بھی ہو سکتے ہیں مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ ایک بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیے جانے والے ماہر فن کی خدمات سے ہم نے اپنے آپ کو کیوں محروم کر رکھا ہے؟ ہم ان کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ اگر رشوت، ٹیکس چوری اور حاکم طبقے کے ہضم کیے ہوئے قرضوں اور مراعات سے متعلق دولت کو واگزار کر کے ملکی معیشت میں داخل کر لیا جائے اور تعلیم، صحت اور معاشرتی بہبود کو اولین قومی ترجیحات میں شامل کر کے سنجیدگی سے ان کی بہتری اور بحالی کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان ایک مضبوط اور خوش حال ملک اور معاشرہ نہ بن سکے۔ ہمارے ہاں کمی وسائل کی نہیں ان کی جائز منصفانہ اور صحیح تقسیم کی ہے۔

◆◆◆

چلو کچھ آج حساب زیان جاں کرلیں!

کہتے ہیں کہ اپنی بنیاد میں وقت ایک نا قابل تقسیم اکائی ہے۔اس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ کوئی حال اور نہ مستقبل۔شاید اسی لیے اقبال نے بھی اسے ''ایک زمانے کی روجس میں نہ دن ہے نہ رات'' سے تعبیر کیا تھا لیکن اپنے دنیاوی کام چلانے کے لیے ہم نے جس کیلنڈر کو وقت کا پہریدار مقرر کیا ہے وہ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ ایک اور سال ختم ہو گیا۔اب آئندہ سے ذاتی خطوں اور سرکاری کاغذوں میں ۳۶۵ دنوں باون ہفتوں ور بارہ مہینوں تک ۱۹۹۵ء کے بجائے ۱۹۹۶ء لکھا جائے گا اور اسی کے حساب سے لوگ سالگرہیں اور برسیاں منائیں گے۔

وقت آگے سے پیچھے کی طرف چلتا ہے یا پیچھے سے آگے کی طرف.......!یا سرے سے چلتا بھی ہے یا نہیں؟اس کا جواب کم از کم ہمارے پاس نہیں ہے کہ مختلف اوقات میں ہمیں یہ تینوں ہی باتیں سچ نظر آتی ہیں۔شب و روز اور مہ و سال کی اس تبدیلی کے گمان میں افراد اور انسانی گروہ کس طرح پھیلتے سکڑتے اور بنتے مٹتے ہیں اس کا مطالعہ تمام انسانی علوم کی بنیاد ہے کہ یہ کائنات اسی ''انسان'' کے لیے پیدا کی گئی ہے جو خدا' کائنات اور وقت کی اس مثلث کے تینوں سروں پر ایک الگ صورت اور حالت میں موجود نظر آتا ہے۔

ہندسوں اور تاریخوں کے اس الٹ پھیر میں کہیں وہ روشن لمحہ بھی ہے جس نے انسانوں کے ایک گروہ کو ایک نئی صورت اور قوم میں ڈھلتے دیکھا۔اس معجزے کو رونما ہوئے اگرچہ اب ۴۸ برس ہو چکے ہیں اور اس دوران میں تاریخ کے صفحات اور یو این او کے ریکارڈ میں وطن عزیز کے جغرافیے کو ایک بار تقسیم اور ترمیم کر کے بھی درج کیا جا چکا ہے لیکن اب بھی ہمارا حال ان آبی پرندوں کی ڈار سے مختلف نہیں جو شکاری کی گولی کی آواز سن کر اڑتے ہیں مگر چند لمحوں بعد پھر اگلی گولی سے بے نیاز ہو کر اسی حالت میں وہیں کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔

آج کل آپ جس محفل میں بھی جائیں لوگ یہیں باتیں کرتے نظر آئیں گے کہ ''اب کیا ہوگا؟'' ''ہمارا کیا بنے گا؟'' ''ہم کس طرف جا رہے ہیں؟'' ''ہمیں کون بچائے گا؟'' وغیرہ وغیرہ ایک لکھنے والے کی حیثیت سے ہمیں ان سوالوں کا کچھ زیادہ ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔صبح کی سیر سے لے کر رات گئے تک کسی تقریب کے دوران بہت سے اجنبی اور شناسا چہرے یہی استفسار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کے لہجے اور آنکھوں میں ایک ایسے جواب کی طلب ہوتی ہے جو ان کے خدشوں اور وسوسوں کو روک کر امید اور خوش

گمانی کا کوئی ایسا سلسلہ شروع کر دے جس سے ان کے چاروں طرف بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں ور دھواں بادلوں میں تبدیل ہو جائے۔

ہم اگرچہ بنیادی طور پر رجائیت پسند واقع ہوئے ہیں اور ہمیشہ چیزوں کا روشن رخ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم حقیقت یا روبرو کھڑے منظر سے آنکھیں چرا لیں اور لوگوں کو ایسے خواب دکھائیں جو خوش فہمیوں سے تراشے اور خواہشوں سے رنگے گئے ہوں۔ سو خواب اور حقیقت کے اس دوراہے پر جاری کشمکش کو ایمانداری سے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہم اپنی سی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ.......

جو کچھ دیکھا' جو سوچا ہے' وہی تحریر کر جائیں
جو کاغذ اپنے حصے کا ہے وہ کاغذ تو بھر جائیں

لیکن اس کاغذ کے بھرنے کے دوران جن جن مشکلوں اور رکاوٹوں سے گزرنا پڑتا ہے ان کا ذائقہ اس قدر تلخ ہے کہ میٹھے سے میٹھا لفظ بھی ان کی کڑواہٹ کو چھپا نہیں پاتا۔

چند سال قبل ۱۴ اگست کے لیے ہمیں ایک خصوصی کھیل لکھنے کو کہا گیا۔ ہم نے ''سوال'' کے نام سے جو کھیل لکھا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

''ایک محلے کے بازار کی سڑک پر کارپوریشن کے بنائے مین ہول کا اوپری لوہے کا ڈھکنا چوری ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کیچڑ اور گندا پانی چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ سڑک کے کنارے ایک پکوڑے والے کی ریڑھی نما دکان ہے جہاں مختلف لوگ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہیں اور اس پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور ارد گرد واقع قالینوں کے مختلف شوروموں میں نسبتاً امیر طبقے کے مختلف لوگ بھی اسی صورتحال پر بات کرتے دکھائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نوجوان نو دولتیے اور بگڑے ہوئے بچے اس کیچڑ میں موٹر سائیکلوں کی دوڑ لگا کر چاروں طرف کیچڑ پھیلاتے اور لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ کرتے ہیں جبکہ ان کے بڑے مختلف طریقوں سے بجلی' ٹیلی فون اور دیگر واجبات کی چوری کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں مصروف ہیں۔ بالآخر ایک میٹنگ کی جاتی ہے جس میں فیصلہ ہوتا ہے کہ محلے کے معززین کا ایک وفد شہر کے میئر سے ملاقات کرے اور متعلقہ جگہ پر مین ہول کا نیا ڈھکنا لگوائے۔ اس میٹنگ میں اس پکوڑے والے کو بولنے تک کا موقع نہیں دیا جاتا۔ مقررہ وقت پر یہ معززین محلہ جمع ہوتے ہیں اور فوٹو گرافر کو ساتھ لے کر مین ہول والے مقام پر جاتے ہیں تاکہ وہاں پر کھنچوائی ہوئی تصویر اگلے دن کے اخبارات میں شائع ہو سکے مگر وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے راتوں رات وہاں نہ صرف ایک پرانا سا ڈھکنا رکھ دیا ہے بلکہ ارد گرد کی صفائی بھی کر دی ہے۔

تفتیش پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اسی غریب پکوڑے والے اور اس کے بیٹے کا ہے۔ جب ان سے اس ''حرکت'' کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو پکوڑے والا عاجزی سے کہتا ہے۔

''جناب میں نے سوچا کہ بیس برس سے اس سڑک کے کنارے بیٹھ کر میں روزی کما رہا ہوں تو میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے کہ اس کے مسائل کے حل میں اپنا حصہ ادا کروں سو میں نے کہیں سے یہ ڈھکنا حاصل کیا اور پھر بیٹے کے ساتھ مل کر صفائی کر دی کہ اس گندگی کی وجہ سے اہل محلہ کو تکلیف ہو رہی تھی۔'' اس پر معززین محلہ پہلے تو گم سم سے ہو جاتے ہیں مگر پھر اس پکوڑے والے پر برسنا شروع کر دیتے ہیں کہ تمہی جیسے لوگوں کی وجہ سے کوئی کام ترتیب اور سلیقے سے نہیں ہوتا۔ اب ہم لوگوں نے اپنا وقت صرف کیا' کام چھوڑے اور میئر سے ملنے کے لیے جمع ہوئے مگر تم نے سارے پروگرام کا بیڑا غرق کر دیا۔ وہ سب لوگ کچھ دیر اسی طرح بکنے جھکنے کے بعد فوٹو گرافر سمیت منتشر ہو جاتے ہیں۔ پکوڑے والا کھیل کے ایک کردار کی طرف (جو اس سارے واقعے کا گواہ ہے) مڑتا ہے اور بڑی پریشانی اور بے بسی کے عالم میں پوچھتا ہے۔

''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے جناب؟''

اسی سوال پر کھیل ختم ہو جاتا ہے اور اسی سوال کے ساتھ ہم 1995ء کے اس آخری کالم کو ختم کرتے ہوئے تمام اہل دل اور ارباب فکر و نظر سے درخواست کرتے ہیں کہ ۱۹۹۶ء کے پہلے سورج کا استقبال کرنے سے پہلے اس گزرتے ہوئے سال کی سرحد پر رک کر ایک نظر پیچھے کی طرف ضرور ڈالیں اور صرف یہ دیکھیں کہ ان ۳۶۵ دنوں میں ہم نے کیا کچھ ایسا کیا ہے جو نہیں کرنا چاہیے تھا اور وہ کیا کچھ نہیں کیا جو کرنا ضروری تھا۔

خاموش اکثریت

پاکستان کے ۶۰ فیصد خاموش شہریوں کے فورم کی طرف سے اس کے کنوینز اور منتظم جاوید طارق صاحب نے اپنے خط کے ساتھ کچھ مطبوعہ لٹریچر بذریعہ ڈاک ہمیں بھجوایا ہے اور اپنے ارادے اور مشن کے بارے میں ہماری بے لاگ رائے طلب کی ہے۔ چونکہ اس خط کا تعلق جس ۶۰ فیصد خاموش اکثریت سے ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک ہم اور ہمارے قارئین بھی شامل ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر کھل کر اور برسر عام گفتگو کی جائے تو سب سے پہلے فورم کے منتظم صاحب کا خط پیش خدمت ہے کہ فٹ بال کھیلنے کے لیے پہلی شرط فٹ بال کا موجود ہوتا ہے۔

گزشتہ دنوں میں ''۶۰ فیصد خاموش اکثریت'' کے فورم کے اشتہارات مختلف اخبارات میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے ......اب تک یہ عمل صرف ایک انفرادی عمل تھا جس کا احساس خداوند بزرگ و برتر نے دلایا کہ اس کربناک تاریکی میں روشنی کا ایک ننھا سا دیا بھی جلانا جہاد ہے' پاکستان کی مقدس سرزمین ذات باری نے صرف اس خطہ کے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے مشعل راہ بننے کے لیے عطاء کی تھی مگر ہوس پرستوں' خائنوں اور بخیلوں نے اسے پستی کی آخری گہرائیوں میں ظالمانہ بے دردی سے ایسے دھکیل دیا جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کو'' دنیا کی دوسری سب سے بے ایمان اور رشوت خور قوم'' کا بدنما تمغہ دلانے میں ہم سب کا ہاتھ ہے۔ اس جرم کا ازالہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم سب مل کر پاکستان کو ایک ایسی مثالی مملکت بنائیں جو باقی تمام دنیا کے لیے مشعل راہ ہو۔

......میرے اس عمل کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ پاکستان کی ۶۰ فیصد خاموش اکثریت' بے بس اکثریت' صرف تماشائی نہ بنی رہے بلکہ اپنی آواز اور پہچان ارباب اختیار اور ہم خیال لوگوں تک پہنچائے۔

فورم کے منتظم کا کہنا ہے کہ ان اشتہارات کی اشاعت کے بعد انہیں سینکڑوں کی تعداد میں خطوط' فیکس اور تاریں موصول ہوئی ہیں جن میں ان کے بنیادی مقصد یعنی ''احتساب' منطقی انجام تک پہنچائے جانے سے قبل انتخابات بے معنی ہوں گے'' کی تائید کی گئی ہے کہ ایسا کرنے سے ''اس غریب قوم کا نہ صرف ۵۰ بلین روپیہ خرچ ہوگا بلکہ وہی خود ساختہ سیاستدان خود یا چہرے بدل کر پھر اس

مملکت خداداد کے کفن میں آخری کیل گاڑ دیں گے....... خدانخواستہ''

ایسی اچھی' خوش' آئند' نیک نیت اور بظاہر انتہائی مثبت سوچ سے کون اختلاف کر سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انتخابات سے پہلے احتساب کے عمل کو اس کے جس ''منطقی انجام'' تک پہنچانے کا تقاضا کیا گیا ہے وہ کیا ہے اور اسے کون مکمل کرے گا؟ اگر یہ نگران حکومت اس کی اہل نہیں تو کوئی اور نگران حکومت کس طرح اس کی اہل ہو سکے گی؟ اگر آج فوج یا کسی اور ذریعے سے انتخابات کو ملتوی کر بھی دیا گیا تو اس سے عوام کے مسائل کے حل میں کیا مدد ملے گی؟ ملک کے ہر شعبے کا دیوالہ پن کیسے رکے گا؟ بے چینی' مایوسی' افراتفری' افراط زر' مہنگائی اور کرپشن کیسے ختم ہوگی؟

ہمیں جاوید طارق صاحب کے اس خدشے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ اگر انتخابات پر اتنی رقم اور وقت خرچ کرنے کے بعد بھی انہی یا اسی طرح کے سیاستدانوں کو واپس لانا ہے جن کے جانے پر لوگ مٹھائیاں بانٹتے ہیں و پھر اس سری ''مشق ہنر کا فائدہ کیا ہے؟

مکمل انصاف کا حصول اور تمام مسائل کا حل دراصل ایک آئیڈیل صورتحال ہے جس کا فی الوقت تصور بھی ناممکن کی حد تک مشکل ہے لیکن اگر ہم اس سارے معاملے کو اضافی نقطہ نظر سے دیکھیں تو شاید بات کسی حد تک سمجھ میں آجائے۔ ہمارے خیال میں ہمارے ۶۰ فیصد اکثریت کا بنیادی مسئلہ یہ نہیں کہ وہ خاموش ہے' ووٹ یا تو ڈالتی نہیں یا سوچ سمجھ کر نہیں ڈالتی۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب دو برائیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو بعض اوقات ان کا چھوٹا بڑا ہونا بے معنی ہو جاتا ہے یعنی جب تک موجودہ نظام جس کی ریڑھ کی ہڈی فیوڈل ازم ہے بدلا یا ختم نہیں کیا جائے گا ہم اسی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے اور بات کسی کنارے نہیں لگے گی۔

اب یہ آگے کنواں پیچھے کھائی' والی صورتحال ہے کہ کم و بیش تمام قابل ذکر سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی حوالے سے برسر اقتدار آ کر اپنی ناکارکردگی کا مظاہرہ کر چکی ہیں اور چونکہ ان کی حالت میں کوئی اقداری تبدیلی رونما نہیں ہوئی اس لیے مستقبل میں بھی ان سے کوئی توقع کرنا ایک خیال کام سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پارلیمانی جمہوریت کا نظام ہمارے ملک کے لیے نہ صرف یہ کہ سودمند اور مناسب نہیں بلکہ یہ ایک سے زیادہ دفعہ ناکام ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کی جگہ صدارتی لیکن غیر آمرانہ نظام کے تحت جمہوریت کی کسی اور شکل کو آزمانا چاہیے! ہمارے نزدیک یہ سب باتیں ایک نامکمل تاش کے پتوں کو بار بار پھینٹنے کے برابر ہیں کہ جہالت' استحصال' جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اور برادری سسٹم کی موجودگی اور سیاسی تربیت کی کمی اور خلوص عمل کے بغیر اختیار کیا جانے والا کوئی بھی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک پڑھے لکھے اور باشعور لوگ اپنا ووٹ ڈالنے کے لیے گھروں سے

نہیں نکلیں گے اور متوسط اور نچلے طبقوں سے صحیح اور موزوں امیدوار انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیں گے یہ ڈرامہ یونہی چلتا رہے گا۔

لیکن یہ سارے کام اور نئی مردم شماری کے بعد کی جانے والی انتخابی حلقہ بندی اور احتساب کے عمل کی اس کے منطقی انجام تک رسائی تو آئندہ تین ہفتوں میں ممکن نہیں ہے جبکہ دوسری طرف انتخابات کا التواء ایک ایسے سیاسی تعطل کا پیش خیمہ بن سکتا ہے جس کے نتیجے میں ایک سے ایک نئی پیچیدگی جنم لے سکتی ہے سوفی الوقت ہماری آپ کی اس ۶۰ فیصد خاموش اکثریت کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ میں بولنے اور پھر سچ بولنے کی صلاحیت اور عادت پیدا کرے کہ یہی وہ انٹی بائیوٹک ہے جس سے ہمارے اندر کی انفیکشن ختم ہو سکتی ہے اور جب یہ ختم ہو گی تو پھوڑے اور دوسرے داغ دھبے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

◆◆◆

جائز......ناجائز

ایک سردار جی کسی گیٹ پر بطور گیٹ کیپر کھڑے تھے ایک صاحب نے ان سے پوچھا۔

''کیا میں اندر جا سکتا ہوں؟''

سردار جی بولے۔''نو''(No)

''لیکن یہ جو اتنے بہت سے لوگ آگے گئے ہیں انہیں تو آپ نے نہیں روکا۔''

''انہوں نے مجھ سے پوچھا ہی کب تھا۔''سردار جی بولے۔

بعض اوقات پرانے لطیفے محض اپنے محل استعمال کی وجہ سے بالکل نئے ہو جاتے ہیں۔گزشتہ دنوں ایف اے کے رزلٹ کے حوالے سے ہمارے کچھ احباب کو اسی طرح کی ایک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جس نے اس لطیفے کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ہوا یوں کہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن والے گزشتہ کئی مہینوں سے ایف اے کا رزلٹ تیار کر رہے تھے اور کم و بیش ایک ڈیڑھ مہینے سے''شیر آیا' شیر آیا'' والی صورتحال چل رہی تھی۔(اب تو شیر آ چکا ہے)یعنی ہر ہفتے پتہ چلتا کہ رزلٹ اب آیا کہ آیا۔والدین اپنے بچوں کی بے صبری' پریشانی' انتظار اور سسپنس سے مجبور ہو کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے تھے کہ کہیں سے کوئی اطلاع یا خبر مل جائے۔ان دنوں مختلف احباب نے بتانا شروع کیا کہ انہیں اپنے بیٹے یا بیٹے کے نمبر معلوم ہو گئے ہیں۔اب ان بچوں کی بے چینی اور اصرار میں مزید اضافہ ہو گیا جنہیں اب تک اپنی کارکردگی کے نتائج سے آگاہی نہیں ہوئی تھی۔ہمارے ایسے ہی ایک مہربان نے جب بار بار اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ چونکہ خود تعلیم کے شعبے سے متعلق ہیں اور بورڈ کے چیئرمین بھی تمام عمر شعبہ تعلیم سے ہی وابستہ رہے ہیں اس لیے آپ براہ راست ان سے درخواست کیجئے کیونکہ آپ خدانخواستہ نمبر بڑھوانا نہیں صرف معلوم ہی کرنا چاہ رہے ہیں۔

یہاں سے راوی کا بیان شروع ہوتا ہے کہ جب تین دن کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر ان کا چیئرمین صاحب سے مواصلاتی رابطہ قائم ہوا تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس''ناجائز کام''میں ان کی مدد کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے پروفیسر صاحب کہ میری موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ رزلٹ کسی طرح آؤٹ ہو جائے۔میں نے اس بات کا

مکمل انتظام کررکھا ہے کہ کسی کورزلٹ کے باقاعدہ اعلان سے پہلے اس کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔''

جب ان سے عرض کیا گیا کہ بے شمار لوگوں کو نہ صرف یہ ہوا لگ چکی ہے بلکہ مسلسل لگ رہی ہے اور جب رزلٹ ہی مرتب ہو چکا ہو تو اس میں کسی بیشی کی گنجائش نہیں رہتی اس لیے آپ مہربانی کیجئے اور ہمیں بھی پتہ کروا دیجئے تا کہ ہم اپنی اولاد کے سامنے روازانہ شرمندہ ہونے سے بچ جائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جواب دیا۔

''میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ میرے ہوتے ہوئے یہ بات ممکن ہی نہیں اور اگر کچھ لوگ اس کا دعوی کرتے ہیں کہ انہوں نے نمبر معلوم کروالیے ہیں تو جان لیجئے کہ انہیں کسی نے بہکایا ہے اور غلط اطلاع دی ہے۔''

راوی نے کہا........

''کچھ لوگوں نے دو تین مختلف ذرائع سے نمبر کراس چیک کروائے ہیں اور ہر بار انہیں ایک ہی نمبر بتائے گئے ہیں' آپ کہیں تو ہم نمونے کے طور پر دو تین رول نمبر اور ان کے حاصل کردہ نمبر آپ کے گوش گزار کردیتے ہیں اگر ہماری بات صحیح نکلے تو پھر آپ ہماری درخواست پر بھی غور فرما لیجئے گا کہ یہ بات نامناسب تو یقیناً ہے مگر موجودہ صورتحال میں ناجائز ہرگز نہیں ہے۔''

اس پر چیئرمین صاحب تھوڑے سے نرم پڑے اور کہنے لگے کہ تقریباً ڈیڑھ سو کلرک اس رزلٹ کی تیاری سے متعلق ہیں' ممکن ہے کوئی تھوڑی بہت لیکج Leakage ہوگئی ہو مگر ان کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ کسی کو رزلٹ پہلے سے بتادیا جائے۔

اس پر راوی مجبوراً خاموش ہوگیا یہ اور بات ہے کہ اس کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد اسے اپنے بچے کے حاصل کردہ نمبر معلوم ہو گئے جو بعد میں بالکل صحیح نکلے۔ اب اگر توجہ سے دیکھا جائے تو اس سارے واقعہ میں بہت سی قابل غور باتیں ہیں۔ چیئرمین بورڈ کا جواب اپنی جگہ بالکل درست' معقول اور قانونی تھا اور اصولاً ہمارے دوست کو ان سے اس طرح کی فرمائش کرنی ہی نہیں چاہیے تھی کہ اس سے ایک ادارے کی اس سیکریسی پر حرف آتا جس کی حفاظت اس کا فرض ہے لیکن اگر صورتحال یہ ہو کہ ہر صاحب رسوخ اور اہل معاملہ اس ''راز'' تک کھلی رسائی رکھتا ہو اور منظر کچھ ایسا ہو کہ بقول غالب

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

یہاں ''خط'' کی جگہ ''نمبر'' کا لفظ رکھ دیجئے اور پھر سوچیے کہ ایسے میں چیئرمین صاحب کی بیان کردہ ''ایمانداری'' اور ''اصول پسندی'' کس کھاتے میں پڑتی ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون کو سب کے لیے ایک جیسا ہونا چاہیے اور اگر کوئی ''رعایت''

ہوتو وہ بھی سب کو ایک ہی طرح اور ایک جیسی ملنی چاہیے۔

پی آئی اے کے ایک سابق چیئر مین کے پاس' جو اپنی ''اصول پسندی'' پر بہت فخر کیا کرتے تھے'ان کا ایک بہت پرانا اور عزیز دوست گیا اور کہا کہ مجھے ایمرجنسی میں لاہور جانا پڑ گیا ہے کسی سے کہہ کر کراچی سے لاہور کی ایک ٹکٹ منگوا دیجئے' چیئر مین صاحب نے چپڑاسی کو کافی بنانے کے لیے کہا اور خود اپنے سامنے رکھے ہوئے سات آٹھ ٹیلی فونوں کو باری باری گھمانے لگے اس کام میں ان کا پی اے بھی ان کا شریک تھا۔ کوئی دس منٹ بعد انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا اور کہا کہ میں نے سب جگہ سے پتہ کر لیا ہے چانس میں تمہارا نمبر ستر ہے۔

ان کے دوست نے جل کر کہا....... ''یہ اطلاع تو میں ٹکٹ کاؤنٹر سے بھی لے سکتا تھا بلکہ لے کر آیا ہوں تمہارے پاس آنے کا مطلب اور مقصد تو یہ تھا کہ تم اپنے ذاتی اختیارات استعمال کر کے مجھے ٹکٹ دلوا دو۔''

اس پر متعلقہ چیئر مین نے بھی ان سے محترم ڈاکٹر سردار محمد کی زبان میں گفتگو کی اور بتایا کہ وہ اپنے دوست کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن اپنے بنائے ہوئے اصول نہیں توڑ سکتے۔ یہ سن کر ان کا دوست کافی پیئے بغیر رخصت ہونے کے لیے اٹھا اور قریب تھا کہ چیئر مین موصوف اس سے الوداعی مصافحہ کرتے کہ ان کے چپڑاسی نے جھک کر ان کے کان میں کہا۔

''صاحب جی....... آپ کے دوست ناراض ہو کر جا رہے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کو ٹکٹ لا دوں.......؟''

سید ضمیر جعفری کا ایک شعر ہے جو لکھا تو انہوں نے ایک خلیجی شہر کے بارے میں تھا لیکن اس سے بھی زیادہ فٹ یہ اس کالم میں پیش کی گئی صورتحال پر ہو رہا ہے....... شعر کچھ یوں ہے!

اک طرف پہاڑی ہے، اک طرف سمندر ہے
اس کے بعد جو کچھ ہے بس اسی کے اندر ہے

◆◆◆

ایک تھا بادشاہ...... ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

ایک وقت تھا کہ بڑی بوڑھیاں اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو کہانی سناتے وقت انہی دو جملوں سے سٹارٹ لیا کرتی تھیں۔ یہ کہانیاں مافوق الفطرت عناصر اور کرداروں سے تو پر ہوتی ہی تھیں لیکن ان کے انسانی کردار بھی عام آدمیوں کے لیے کم و بیش مافوق الفطرت ہی ہوتے تھے کہ شہنشاہ' ملکہ' شہزادے' شہزادیاں' وزیر' سپہ سالار اور ان کے بچے سب کے سب ایک ایسی دنیا میں رہتے تھے جس کے بارے میں عام آدمی صرف تصور ہی کر سکتا تھا۔ ان کہانیوں کے حوالے سے ماضی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایک عجیب و غریب اور بہت خوفناک صورتحال سامنے آتی ہے یعنی یوں لگتا ہے جیسے پرانے وقتوں میں صرف یہی طبقہ بالا وجود رکھتا تھا اور باقی کے سب انسان حشرات الارض کی طرح تھے جن کے ہونے یا نہ ہونے سے تاریخ یا کہانی' کسی کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے سے بڑی اور Larger than life چیزوں اور کرداروں سے نہ صرف زیادہ متاثر ہوتا ہے بلکہ ان کے بارے میں جاننے کا خواہش مند بھی رہتا ہے کہ اس عمل میں اسے حقیقت اور فینٹسی دونوں کا مزا ایک ہی ٹکٹ میں مل جاتا ہے۔

لیڈی ڈیانا کی زندگی اور موت کا زمانہ اگرچہ انسانی تاریخ کے اس دور میں وقوع پذیر ہوا ہے جب انسانی ذہن ان تاریخی کرداروں کی کہانیوں سے نکل کر حقوق انسانی' سوشلزم اور جدید شہری معاشروں کے حوالے سے ایک ایسے عہد میں داخل ہو چکا ہے جہاں مندرجہ بالا کردار نہ صرف اپنے مخصوص سحر سے محروم ہو چکے ہیں بلکہ عام طور پر انہیں محبت اور عقیدت کے بجائے نفرت اور سرد مہری کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ بیسیوں صدی کے آغاز سے ہی دنیا بھر میں بادشاہتوں اور ان کے متعلقات کی جگہ گلیمر کے نئے علاقے اور کردار دریافت ہو رہے ہیں اور آج کی دنیا کسی بادشاہ یا ملکہ سے زیادہ کھلاڑیوں' گلوکاروں' اداکاروں' ڈانسروں ور شو بزنس کے دیگر شعبوں میں اپنے ہیروز تلاشتی اور تراشتی ہے یعنی آج عام آدمی کا آئیڈیل نسلی رتبے اور مقام کے بجائے کسی شخص کی اس پرفارمنس سے متعین ہوتا ہے جو اسے ''خواص'' میں شامل کراتی ہے' چاہے اس کا خمیر کتنے ہی عام لوگوں کے طبقے سے کیوں نہ اٹھا ہو۔

لیڈی ڈیانا' اس بدلتی ہوئی دنیا کے نئے رشتوں اور راستوں کے درمیان انسان کے اجتماعی ماضی اور لاشعور کا ایک حیرت انگیز

استعارہ اور نمائندہ تھی' اگرچہ اس کا براہ راست تعلق اشرافیہ کے اس گروہ سے نہیں تھا جو پیدا ہوتے ہی ''بڑے آدمی'' ڈیکلئر ہو جاتے ہیں لیکن اپنے آیا گیری اور سکول ٹیچنگ کی نوکریوں کے باوجود اس کا خاندانی پس منظر بہر حال ''عام آدمیوں'' سے بہت مختلف اور بلند تھا۔

انگلستان کی بادشاہت کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ مستقبل میں صرف پانچ بادشاہ دنیا میں رہ جائیں گے' چار تاش کے اور ایک انگلستان کا...... لیکن گزشتہ چند برسوں میں جو صورتحال بنی ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگلستان میں ''بادشاہت'' تو شائد رہ جائے لیکن بادشاہ یا ملکہ اور شاہی خاندان کے ساتھ جو تصورات وابستہ ہوا کرتے تھے' وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے اور اس ساری تبدیلی کی لہر کے پیچھے جو نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے' وہ لیڈی ڈیانا کا ہے۔

شرم وحیا' وفاداری اور ازدواجی رشتوں کی پاسداری کے مشرقی تصورات کی اچھائیاں اور برائیاں اپنی جگہ لیکن یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ ان معاملات کے بارے میں مغرب کے قائم کردہ معیارات کو ہضم کرنا ہمارے لیے عمومی طور پر اب بھی انتہائی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ شہزادہ چارلس اور ڈیانا کے اپنی زندگیوں' رویوں اور ایک دوسرے سے وفاداری بلکہ بے وفائی کے اعترافات وہ تلخ نوالے ہیں جنہیں آج بھی آسانی سے نگلا نہیں جا سکتا لیکن مغرب کے معاشرے نے ان تمام تبدیلیوں کو نہ صرف قبول کر لیا ہے بلکہ وہ اپنے اس جدید اقداری نظام پر کچھ ایسے فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا معرکہ مار لیا ہو...... کمیلا پارکر سے شہزادہ چارلس کے تعلقات ہوں یا لیڈی ڈیانا سے منسوب مختلف صاحبان...... یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان معاملات کو اچھالنے میں میڈیا کا حصہ کتنا ہے اور خود شاہی جوڑا اس کا کس حد تک ذمہ دار ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتحال کچھ ویسی ہی ہے جس کے پیش نظر کسی شاعر نے کہا تھا۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

فرق صرف یہ ہے کہ مغرب کے معاشرے میں ''محبت'' کے جنون کو اس قدر وسعت دے دی گئی ہے کہ بہت سے دوسرے لفظوں کے معنی گڑ بڑ ہو گئے ہیں۔

لیڈی ڈیانا تو اپنی مختصر زندگی کو انتہائی بھرپور طریقے سے گزارنے کے بعد اب مٹی کا ایک ڈھیر بن چکی ہے جس میں آہستہ آہستہ اس کا حسن' مسکراہٹ' اس سے وابستہ قصے' کہانیاں اور اس کی ناگہانی موت پر دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ عامہ کی کارروائیاں' سب کچھ

تحلیل ہوتا چلا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی شائد یہ سوال بھی کہیں گم ہو جائے کہ اگر وہ برطانیہ کی شہزادی کا مقام حاصل نہ کرتی تو کیا پھر بھی اسی طرح لاکھوں کروڑوں دلوں کی ملکہ ہوتی.......!!

آزادوں کی غلام گردشیں

ایک صاحب نے اپنے میزبان کے بچے کے سرخ وسفید رنگ کی تعریف کچھ اس طرح سے کی۔

''ماشاء اللہ بہت پیارا بچہ ہے آپ کا...... بالکل کسی انگریز کا لگتا ہے۔''

بیشتر اچھے لطیفوں کی طرح اس بات میں بھی مزاح کے پس منظر میں ایک بہت تلخ حقیقت رواں دواں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ جب ذہن مرعوب اور غلام ہو جائیں تو پھر انسان کو ہر دیسی اور لوکل بات بری اور حاکموں یا وروالوں کی ہر بات اچھی لگنے لگتی ہے اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی تقلید کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

اس ذہنی غلامی کے مظاہر تو ہماری روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں انگریز کے زمانے میں دکانوں کے سائنس بورڈوں یا ناموں کا انگریزی میں ہونا تو کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے مگر آزادی کے پچاس سال بعد بھی اس روش کا قائم رہنا بلکہ مزید فروغ پا کر ایک فیشن اور روایت بن جانا یقیناً غور کا مقام ہے۔ غیر ملکی کمپنیاں یا تجارتی ادارے اپنی مصنوعات کے نام اگر اپنی ملکی زبانوں میں رکھیں تو یہ بات جائز اور قابل فہم ہے مگر جب پاکستان کے تاجر اور صنعتکار بھی اپنی مصنوعات کے نام ان کے ناموں یا ان سے ملتے جلتے ناموں پر رکھنے لگیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ نصف صدی کی اس آزادی کا جشن منایا جائے یا اس ذہنی غلامی پر آنسو بہائے جائیں!!

موبائل فون بنانے والی کمپنی کے نام پر واشنگ مشین' انگریزی ناولوں سے لیے گئے ناموں والے بڑے بڑے گھر' مینشن اور لاجز...... ڈبل روٹی اور آئس کریموں کے نام...... ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانوں اور ڈیپارٹمنٹل سٹورز کے نام' ہوٹلوں اور سگریٹوں کے نام' غرض یہ کہ اپنے اردگرد جدھر بھی نظر ڈالیے آپ کو یہی صورتحال نظر آئے گی۔ کوکا کولا' باٹا' پیزا ہٹ' مرسیڈیز' سوزوکی' شیرٹن' سینٹ مائیکل' سٹے بینک' کینٹکی فرائڈ چکن' اور بوئنگ کے ناموں کو ان کی اصل شکل میں قائم رکھنا تو مجبوری ہے کہ یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں یا ان کے برانڈز اور ماڈلز کے نام ہیں مگر اسی نوع کی پاکستان میں بنی ہوئی ملکی کمپنیوں یا ان کی تیار کردہ مصنوعات کے اس طرح کے نام رکھنے کی تک سمجھ میں نہیں آتی۔

تجارتی ادارو یا ان کی بنائی ہوئی ''اشیاء'' کے حوالے سے اس سارے عمل کی معنویت یہی بنتی ہے کہ ان کا مسئلہ کاروبار اور منافع

کمانا ہے مگر جب ہم اپنے شہروں کے مختلف علاقوں اور چھوٹی چھوٹی گلیوں میں عجیب وغریب انگریزی ناموں والے انگلش میڈیم سکولوں کے بورڈ دیکھتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا تعلیم ان لوگوں یعنی سکولوں کے مالکان کے لیے اسی طرح کا کاروبار ہے جیسے باٹا والے اپنے جوتے بیچتے ہیں یا ریستورانوں اور ہوٹلوں والے اپنی دکانیں چمکاتے ہیں؟

کتنے شرم اور افسوس کی بات ہے کہ محض فیسیں بٹورنے کے لیے پہلے دن سے ہی طلبہ کو قومی تشخص اور اپنی پہچان کی علامتوں سے دور کر دیا جاتا ہے۔ مشنری سکولوں کے اس نوع کے نام تو گوارا کیے جا سکتے ہیں کہ ان میں ان کا تشخص پایا جاتا ہے مگر یہ دیسی مالکان کے ولایتی سکولوں والے نام دیکھ کر سوائے قومی بے حسی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے اور کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔

انگریزی لکھنا' پڑھنا' بولنا' جاننا سب اچھی باتیں ہیں۔ اس جدید اور تیزی سے سکڑتی ہوئی دنیا میں انگریزی یقیناً بین الاقوامی سطح پر ہمارے لیے موزوں ترین زبان ہے لیکن اس ضرورت کو ضرورت ہی کی سطح پر رہنا چاہیے۔ جب یہ قومی وقار اور ملی تشخص سے بھی آگے نکل کر ایک ایسے منطقے میں داخل ہو جاتی ہے جہاں اسے علم' تہذیب' ملازمت' ترقی' اشرافیہ اور حکومت سب ہی کا امتیازی نشان سمجھ لیا جاتا ہے تو پھر یقیناً اہل فکر ونظر کو اپنا احتجاج ریکارڈ پر لانا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ ہم فی الوقت ان کی بنائی اور ایجاد کی ہوئی ٹیکنالوجی کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں (اور ہمارے ذاتی خیال میں اس کی کوئی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں کہ ٹیکنالوجی کی زبان اور اصطلاحات کے تعین پر یقیناً انہی لوگوں کا حق بنتا ہے جن کے گھرانے میں یہ جنم لیتی ہے) لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ہر بات میں آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کرتے چلے جائیں کہ یہ راستہ کچھ ایسی غلام گردشوں کی طرف کھلتا ہے جہاں چکر کاٹتے کاٹتے آزادی کا شعور اور سمتوں کا احساس دھندلا جاتا ہے اور یوں صرف نام کی آزادی باقی رہ جاتی ہے اور یہ وہی آزادی ہے جس پر احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنے ایک شعر میں کچھ یوں تبصرہ کیا ہے کہ

بے وقار آزادی' ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھتے ہیں' بیڑیاں ہیں پاؤں میں

◆◆◆

ملکہ برطانیہ اور ہمارا ٹی وی

عنوان میں ہم نے ملکہ برطانیہ اور ٹی وی کو ساتھ ساتھ رکھا ہے تو اس سے یہ مغالطہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ملکہ برطانیہ کے حالیہ دورہ پاکستان کے حوالے سے ٹی وی کی کوریج پر کوئی تبصرہ کرنے والے ہیں...... ملکہ' ملکہ ہے اور ٹی وی' ٹی وی....... ظاہر ہے یہ دونوں اپنا اپنا الگ مقام اور پہچان رکھتے ہیں گذشتہ دنوں اخبارات میں ملکہ کے مختلف مواقع پر پہنے جانے والے ملبوسات کی جو تفصیلات آئی ہیں ان کے حوالے سے دیکھا جائے تو ٹی وی اور ملکہ میں ایک تعلق ''رنگ'' کا ضرور نکلتا ہے کیونکہ دونوں پرانے ہونے کے باوجود بہت ''کلرفل'' ہیں' آپ اسے ہماری کم علمی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ابھی تک اس وجہ کا پتہ نہیں چل سکا جس کے حوالے سے ملکہ معظمہ کو پاکستان آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ جو وجہ بتائی جاتی ہے وہ حلق سے نہیں اترتی کہ آزادی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر سابق آقاؤں کی اتنی ٹہل سیوا کرنے سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے لیے یہ سابق آقا ہماری آزادی سے بھی زیادہ محترم اور پیارے ہیں۔

اپنے غیر ملکی مہمانوں کا پر جوش استقبال بلاشبہ ہماری قومی روایت اور سیاسی ذمہ داری ہے لیکن جس طرح سے گذشتہ دنوں ہم نے ملکہ اور ڈیوک آف ایڈنبرا کے رستے میں آنکھیں بچھائی ہیں ان کے گزرنے کے راستوں کو بند کر کے کئی کئی گھنٹے عام شہریوں کے ساتھ ساتھ بیماروں' بچوں' عورتوں اور سکولوں کے طلبہ کو عذاب میں مبتلا رکھا گیا ہے اس کے لیے نرم سے نرم لفظ ''افسوسناک'' ہوسکتا ہے۔ شاہی مہمانوں کی پاکستان میں یہ دوسری آمد ہے۔ آج سے ۳۶ برس قبل فیلڈ مارشل ایوب خان کے مارشل لاء کے دنوں میں بھی یہ ''مہربان'' ہماری مہمانداری سے لطف اندوز ہوئے تھے۔ اس وقت کے پاکستان اور موجودہ پاکستان میں اگرچہ آدھے ملک کا فرق ہے لیکن ہمارے ذوق وشوق کی فراوانی سے کم از کم ملکہ کے لیے یہ اندازہ کرنا یقیناً مشکل ہوگا کہ اس بار وہ آدھے پاکستان کے دوسرے پر آئی ہیں؟ ایک بہت اہم شخصیت کے حوالے سے یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ انہوں نے ملکہ کے استقبال کے موقع پر اپنے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو (جو رشتے میں ملکہ کے چچا یا ماموں لگتے ہیں) ایک عظیم شخصیت' ہمارے قومی محسن اور انتہائی انصاف پسند انسان کے طور پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم اور مسئلہ کشمیر کی تخلیق کا کریڈٹ دینے کے لیے ہمیں اپنی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ اس چکر

میں ہمارے کچھ اور دشمن بھی ہمارے محسن اور مربی نکل آئیں۔ ملکہ کے پہلے دوسرے کی کچھ باتیں سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ مشتے از خروارے کے طور پر دو دانے آپ بھی چکھ لیجئے۔

ایک لاہوریئے سے جو ملکہ کا جلوس دیکھ کر آیا تھا کسی نے پوچھا۔

''کیسی ہے ملکہ؟''

''بس گزارے لائق ہے۔'' لاہوریئے نے جواب دیا۔

اس وقت کے میئر لاہور کا ملکہ کو پیش کیا گیا سپاسنامہ بھی اب ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے کہ میئر صاحب نے اپنے مخصوص تلفظ کی وجہ سے ایک جملے میں جتنے لفظوں کا حلیہ بگاڑا اس کے لیے ٹی وی والوں کو کم از کم دس شوقیہ اداکاروں کا آڈیشن لینا پڑتا ہے اصل جملہ تھا۔

''۲ (دو) اکتوبر کو ملکہ معظمہ ڈیوک آف ایڈنبرا کی معیت میں تشریف لائیں۔'' میئر صاحب نے جو کچھ کہا وہ کچھ یوں تھا۔

''بارہ کبوتر کو مکہ معظمہ ڈیوک آف انڈا برا کی میت میں تشریف لائیں۔'' کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ملکہ کے ان دو دوروں کے درمیان گزرے ہوئے ۳۶ برسوں میں ہم اپنے قومی وقار کی حرمت میں پہلے سے بھی زیادہ غیر محتاط اور بے فکرے ہو گئے ہیں کہ اتنی آؤ بھگت تو اس عزیزہ کی اس کے کالونیل عوام بھی کم کم ہی کرتے ہوں گے ہمارے دوست انور مغل جو گذشتہ تیس برس سے انگلستان میں مقیم ہیں ہمیں ملنے کے لیے ۹ بجے صبح گلشن راوی سے نکلے اور تقریباً گیارہ بجے تھکن اور غصے سے بھرے ہوئے ہمارے دفتر پہنچے کہ ملکہ کے گزرنے کی سڑکوں سے ملحقہ تمام سڑکوں پر ٹریفک بند تھی جس کی وجہ سے انہیں پندرہ منٹ کا سفر دو گھنٹے میں کرنا پڑا۔ ان کی سمجھ میں باوجود ہمارے بے حد سمجھانے کے آخر تک یہ بات نہیں آئی کہ ایک ملکہ برطانیہ کی آسانی کے لیے ہزاروں لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کرنا ہمارے لیے بہت ہی معمولی بات ہے کہ ہمارے یہاں تو عام آدمی کی بات صرف اس وقت سنی جاتی ہے جب اس کے افراد خانہ میں سے کسی کے ساتھ گینگ ریپ کیا جائے یا اسے کھلی کچہری میں حاضری پانے کا موقع مل جائے۔

ملکہ کی بات تو اس کی حکومت کی طرح لمبی ہی ہوتی جائے گی اب چلتے چلتے کالم کے عنوان کے دوسرے حصے یعنی ٹی وی پر بھی گفتگو ہو جائے۔ گذشتہ کچھ دنوں سے وزیر اعظم کے پریس سیکرٹری صدیق الفاروق صاحب کے بیانات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ عنقریب پی ٹی وی کی حالت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے اور اس صورت حال کا کوئی نہ کوئی سدباب ضروری تھا لیکن اب تک کی اطلاعات کے مطابق جو رویہ اختیار کیا گیا ہے شبہ ہے کہ یہ ایک غلطی کا علاج ایک دوسری غلطی سے کرنے کے مترادف ہوگا۔ ٹی وی کے

پروگراموں کو بہتر دلچسپ مثبت اور بامقصد بنانے کے لیے اصلاحات یقیناً ضروری ہیں لیکن جس طرح گذشتہ کچھ عرصے میں باپ موسیقی غیر موزوں لباس اور بے ہنگم اچھل کود پر مبنی پروگراموں کو غلط طور پر چھٹی دے دی گئی تھی اسی طرح اب انہیں یکلخت بالکل بند کر دینا اور نوجوان نسل کی پسند اور بدلتے ہوئے ذہنی رجحانات کو سرے سے تسلیم نہ کرنا بھی ایک انتہائی مہلک اور غیر حقیقت پسندانہ فیصلہ ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے اور نوجوان نسل کے لیے ایسے پروگرام تیار کروائے جائیں جو ان کی ذہنی تسکین کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی کریں اور یوں بتدریج انہیں تفریح اور میوزک کے ایک ایسے شعور سے بہرہ ور کیا جائے جس کی وساطت سے وہ از خود اپنی پسند کے نئے معیارات قائم کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ موثر اور صحیح حکمت عملی کے استعمال سے اس مسئلے پر بہت حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ باقی رہی بات ڈراموں سے رومانی مکالموں کو ختم کرنے یا گذشتہ کی طرح نسوانی کرداروں کو موقع محل کا خیال کیے بغیر احمقانہ انداز میں دوپٹے اوڑھائے جانے کی' تو اس کا نتیجہ نہ پہلے اچھا نکلا تھا نہ اب نکلے گا۔ اصلاح کے جذبے کی اچھائی اور ضرورت اپنی جگہ' لیکن اگر اس کے لیے صحیح' موزوں اور دور رس اثرات کا حامل لائحہ عمل نہ بنایا جائے تو یہ ایک ایسی دلدل بن جاتا ہے جس میں سے نکلنے کے چکر میں معاشرہ ہو یا ٹی وی' دھنس اگلے ہوئے نوالوں کو دوبارہ نگلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

براڈ کاسٹنگ کے نئے چیئرمین پرویز رشید صاحب کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ یہ ایک سمجھدار' معاملہ فہم اور حقیقت پسند انسان ہیں اور پاکستانی معاشرے کو اپنے مخصوص تہذیبی تشخص سمیت جدید خطوط پر ترقی دینے کی دلی آرزو رکھتے ہیں امید ہے کہ وہ ٹی وی کی نئی پالیسی بناتے وقت پھوڑوں کے آپریشن سے زیادہ اس انفیکشن کو دور کرنے پر توجہ دیں گے جو اندر ہی اندر ٹی وی کے پورے ڈھانچے میں سرایت کر کے اسے کھاتی اور ڈھاتی جا رہی ہے۔

◆◆◆

ہے لہو کا قافلہ اب تک رواں

اس میں کوئی شک نہیں کہ جوں جوں انسانی زندگی مقداری اعتبار سے بہتر' آرام دہ اور اشیاء کی فراوانی سے پر ہوتی جارہی ہے' اقداری اعتبار سے اس کی سطح روز بروز گرتی چلی جارہی ہے۔ وہ خصائص' جن کی وجہ سے انسانی معاشرہ جنگل کے معاشرے سے الگ پہچانا جاتا تھا ایسی شکلوں میں ڈھلتے جارہے ہیں کہ ان کے ناموں اور کاموں کا باہمی تعلق نابود ہوتا جارہا ہے۔ پوری دنیا حرص و ہوس کے ایک جہنم کا ایندھن بنتی جارہی ہے۔ طاقتور قومیں' پسماندہ اقوام کو ان کے جینے کے بنیادی حق سے بھی محروم کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور زیردست قوموں میں باہمی نفاق اور انتشار کا یہ عالم ہے کہ ہر کوئی اپنی اپنی خواہش' عقیدے اور ہوس کے چکر میں اندھا ہو کر ایک دوسرے کی لاش پر پاؤں جمانے کی کوشش کررہا ہے۔

اہل علم کہتے ہیں کہ گزشتہ ایک صدی میں انسانی ذہن نے مختلف علوم کے حوالے سے جس قدر ترقی کی ہے وہ گزشتہ تقریباً دس ہزار سال کی مجموعی ترقی سے زیادہ ہے کہ ان سو برسوں میں انسان نے اپنے اندر اور کائنات کی وسعت دونوں میں تحقیق و جستجو کے ایسے ایسے چراغ جلائے ہیں کہ جن کو ضو سے اندر باہر ہر طرف روشنی ہی روشنی ہورہی ہے۔ ستاروں پر سچ مچ کی کمندیں ڈالی جارہی ہیں اور زمین ایک کھلی کتاب کی طرح ہر صاحب توفیق کے مطالعے کے لیے حاضر ہے۔ سائنس کی ترقی نے فاصلوں کے روایتی تصور کو ختم کر دیا ہے اور وہ صلاحیتیں جو داستانوں کے جنوں میں ہوا کرتی تھیں اب خوردسال بچوں کی دسترس میں ہیں۔

غور کیا جائے تو یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ناقابل تردید سچ ہیں' یعنی نہ تو انسانی ترقی سے انکار ممکن ہے اور نہ ہی آدمیت کے زوال کو غلط قرار دیا جاسکتا ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم ارتقاء کہتے ہیں وہ اصل میں ہے کیا؟ کیا اس سے مراد صرف مادی ترقی ہے یا یہ محض روحانی سکون کا ایک تصور ہے! عقل سلیم کہتی ہے کہ اصل انسانی ترقی ان دونوں کا آمیزہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مادی ترقی کی حیثیت ذریعے اور وسیلے کی ہو اور روحانی تسکین ''مقصد'' کا مقام حاصل کرے۔ اب اگر یہی بات کوئی اسلام کے حوالے سے کرے اور یہ بتائے کہ اسلام کا اصل پیغام ہی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کے درمیان اعتدال کا رشتہ قائم کرنا ہے تو اس کی بات سننے اور سمجھنے کی بجائے اسے ''بنیاد پرست'' قرار دے کر بحث سے خارج کر دیا جاتا ہے اور میڈیا کی طاقت اور پروپیگنڈے کی شدت کے ساتھ ایسی فضا قائم کردی جاتی ہے کہ بیشتر اہل اسلام نہ صرف اس الزام کے قائل ہو جاتے ہیں بلکہ ان

کے چہروں پر معذرت طلبی ایک اشتہار کی طرح چسپاں ہو جاتی ہے۔

اہل فرنگ کی دانش کا کمال یہ ہے کہ وہ مسلمان معاشروں کو پسماندگی' جہالت' منشیات' فساد پسندی' بدنظمی اور بے قدری کے ساتھ اس طرح منتھی کر دیتے ہیں جیسے یہ سب کی سب برائیاں ہمارے وجود کا حصہ ہیں اور یوں مسلمانوں کی اصلی اور الحاقی خرابیوں کو بنیاد بنا کر انہیں ''اسلام'' کے ساتھ اس طرح خلط ملط کر دیتے ہیں کہ اور تو اور خود ہمارے دانشور بھی بڑے آرام سے اس دام کے اسیر ہو جاتے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ آج بحیثیت امت ہم جس آشوب میں مبتلا ہیں وہ محض اہل مغرب کا پروپیگنڈہ اور سازش ہے۔ بلاشبہ اس عبرتناک منظر کے بیشتر رنگ خود ہمارے اپنے ہی پیدا کردہ اور تراشیدہ ہیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ اسلام اس زمین پر بھیجا جانے والا خدا کا آخری حتمی اور مکمل پیغام اور نظام ہے اور اس سے بہتر کوئی نظام یا طرز حیات ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ مخلوق کا ذہن محدود اور خالق کی ذات لامحدود ہے' سو جزو کو بہرحال کل کا تابع اور حصہ ہی رہنا ہے اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے تو پھر یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اسلام کی حقانیت کے رد میں مسلمانوں کے کسی گروہ کو مثال بنانا اصل میں کوتاہ نظری اور بدنیتی ہے۔ اگر سائنس کے کسی طالب علم کے نالائق یا غلط ہونے سے سائنس کے کسی فارمولے کی سچائی پر اثر نہیں پڑتا تو مسلمانوں کے کسی گروہ کی کمزوریوں کو اسلام کے خلاف دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے کہ جس کے نام کا مفہوم ہی بنی نوع آدمی کی ''سلامتی سکون اور امن'' ہے۔

سائنس کی تمام تر ترقی انسان پر انسان کے ظلم کے ضمن میں خاموش اور غیر جانبدار نظر آتی ہے یعنی جس کے ہاتھ میں یہ قوت ہو اسے سفید و سیاہ کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور اس کی بربریت اور انسان کشی کی صلاحیت کو روکنے کے لیے کسی اصول' قانون یا ضابطے کو پرکاہ کی بھی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم انسانی تاریخ پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو قدم قدم پر اسلام' روشنی کے ایک مینار کی طرح انسانی حرمت' اقدار' سچائی' حق اور عظمت کی پاسداری کرتا نظر آتا ہے۔ روشنی کے اس سفر میں یوں تو ایک سے ایک جگمگ پڑاؤ ہے مگر اس کا روشن ترین استعارہ شہداء کا وہ قافلہ ہے جو چودہ سو برس قبل کربلا کے میدان میں اترا اور اپنے لہو سے ایک ایسی داستان لکھ گیا جس نے عظمت آدم کا سر ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا ہے۔ یہ وہ حسینی قافلہ تھا جسے بظاہر یزید کی سپاہ نے بزور شمشیر روک لیا تھا اور ان بہتر (۷۲) سروں کو تنوں سے جدا کر دیا تھا جن میں اللہ کی عظمت اور حق کی پاسداری کا نشہ بھرا ہوا تھا۔ لیکن کیا حقیقت میں وہ سر کٹ گئے تھے اور وہ قافلہ رک گیا تھا؟ تاریخ کا شعور رکھنے والے جانتے ہیں کہ دراصل واقعہ اس کے بالکل الٹ ہے

کہ آج یزید کا ایک بھی نام لیوا نہیں اور شہیدوں کے لہو کی خوشبو صدیوں کا سفر طے کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

ہے لہو کا قافلہ اب تک رواں
اور قاتل کربلا میں رہ گئے

کربلا کسی فرقے کا نہیں پوری امت مسلمہ کے تصور زندگی کا ایک روشن استعارہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ ہونے کی سعادت جناب امام کا ایک ذاتی اختصاص تھا مگر ان کی شہادت پوری ملت اسلامیہ کا ایک ایسا قیمتی ورثہ ہے جس کا بار امانت نسل در نسل رہتی دنیا تک اسلام کے تمام نام لیواؤں کو اٹھانا ہے یہ ایک ایسا تحفہ ہے جو ابد تک ہمیں ظلم کے مقابلے میں صف آراء ہونے کا عزم عطا کرتا رہے گا۔

خون میں ڈوبی ہوئی ریت پہ بے گور و کفن
ان شہیدوں کے بدن تھے کہ جنہیں
آسمان سینکڑوں صدیوں میں جنم دیتا ہے
ان کے جلتے ہوئے خیمے تھے جنہیں
اپنے دامن کی پناہ باب حرم دیتا ہے
وقت کا کام گزرنا ہے گزر جاتا ہے
کیسا منہ زور بھی طوفان ہو اتر جاتا ہے
وہ عجب شام تھی لیکن جس کا
ایک اک لمحہ زمانوں پہ جہانگیر ہوا
لوح تاریخ پہ جس کا ہر لفظ
بولتے خون سے تحریر ہوا
اہل ایمان کی تقدیر ہوا
آج تک گزری نہیں
چشم خورشید کی تقویم میں اس رنگ کی شام

خون سے لکھتا تھا اک شخص وفا کا پیغام
ابن آدم کی ہر اک نسل کے نام
اے حسین ابن علی تجھ پہ سلام
اے حسین ابن علی تجھ پہ سلام

دریا اور کشتی

کہتے ہیں کہ ایک بار خلیفہ ہارون الرشید مصاحبین کے ساتھ دجلہ کی سیر کر رہا تھا۔شاہی کشتی موجوں پر بہتی جارہی تھی اور دریا کی ٹھنڈی ہوا سے سب لوگ لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اتنے میں ایک طرف سے کسی آدمی کے رونے' چلانے اور بلبلانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔خلیفہ نے شور کا سبب پوچھا تو بتایا گیا کہ ایک حبشی غلام پہلی بار کشتی میں بیٹھا ہے اور پانی کی طغیانی سے خوفزدہ ہو کر واویلا کر رہا ہے اور سمجھانے کے باوجود اس کا خوف کم نہیں ہو رہا...... خلیفہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا جائے۔حکم کی تعمیل کی گئی۔جب مذکورہ حبشی غلام آٹھ دس غوطے کھا چکا اور ڈوبنے کے قریب ہوا تو خلیفہ نے کہا اب اسے باہر نکال لو۔تیراکوں نے دریا میں کود کر غلام کو سنبھالا اور اسے کشتی میں لے آئے جہاں وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔اور کشتی کے ساحل سے لگنے تک اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ایک مصاحب نے استفسار کیا کہ ''اے خلیفہ! آپ تو بہت رحمدل انسان ہیں۔ایسا ظالمانہ حکم آپ نے کیسے اور کیوں دیا؟...... اس کے خوف یا بزدلی کے لیے سزائے موت بہر حال بہت زیادہ ہے......'' خلیفہ نے کہا۔''میرا مقصد اسے مارنا نہیں تھا۔میں نے تو اسے صرف یہ احساس دلایا ہے کہ دریا کی نسبت وہ کشتی میں کس قدر محفوظ اور آرام سے ہے۔''

آج کل ملک کی ہر بات پر تنقید کرنا' ہر چیز میں کیڑے نکالنا' ہر تعمیر میں تخریب دیکھنا' مایوسی کی فی سبیل اللہ تشہیر کرنا اور بات بات پر ملک کے (خدانخواستہ) ٹوٹنے کی پیش گویاں کرنا' ایک فیشن سا بن چلا ہے۔ہمارے نزدیک یہ صورتحال مندرجہ بالا حکایت یا روایت ہی کا ایک عکس ہے کہ مسائل کا دجلہ کتنا بھی طوفانی اور خوفناک کیوں نہ ہو' پاکستان کا وجود ایک کشتی کی طرح ہمارے لیے سلامتی' تحفظ اور تسلی کا استعارہ ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام تر معروضی تجزیوں اور حقیقت پسندی کے تقاضوں کے باوجود یا ان کے ساتھ ساتھ لوگوں کو یہ بھی باور کرایا جائے کہ یہ وطن عزیز ہی ہماری پہلی اور آخری جائے پناہ ہے۔یہ سبز رنگ کا پاسپورٹ جس کے ساتھ ہم نے دنیا بھر کی بدنامی وابستہ کر دی ہے یہی دنیا کے اس بازار میں ہمارا تشخص اور پہچان ہے۔اس کی قدر جاننی ہے تو استانوں کے ان گرہوں کو دیکھئے جو بے وطنی اور مہاجرت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔اپنا ملک اور آزادی کتنی بڑی نعمتیں ہیں ان کی اہمت کا قرار واقعی احساس نہ ہمارے بزرگوں نے کیا' نہ ہم کر رہے ہیں اور نہ ہی مستقبل کے معماروں کو اس ضمن میں مناسب رہنمائی فراہم کی جارہی ہے۔

گزشتہ ۷۴ برس میں وقت کے خلیفہ ہارون الرشید نے کئی بار ہمیں کشتی سے اٹھا کر دریا کی طوفانی اور بلاخیز موجوں کے سپرد کیا ہے ہمیں ڈبکیاں اور غوطے دیئے جا رہے ہیں لیکن ہم نے شاید ان تجربات سے بھی کچھ نہ سیکھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں

(دیکھنے اور سمجھنے والوں کے لیے حادثوں کا طوفان ایک سکول اور درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور موجوں کے تھپیڑے استاد کی اس چھڑی کی مانند ہیں جو وہ سرزنش کے لیے شاگرد کو مارتا ہے۔)

ہمارا مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ مایوسی گناہ ہے....... امید اور اللہ کی رحمت پر بھروسہ وہ ڈھالیں ہیں جو وقت کے شدید سے شدید وار کو روک سکتی ہیں۔ تاریکی سے نبرد آزما ہونے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ رات سے خوف کھانے کے بجائے آنے والے دن کے سورج کی آرزو کی جائے' اس کو تلاش کیا جائے اور دشت شب کی مسافت کو سورج کے سفر کا حصہ سمجھ کر اے تیز قدموں سے طے کیا جائے۔

امجد نہ قدم روک کہ وہ دور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گرد سفر سے!

ہمارے اردگرد اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے' یقیناً اچھا نہیں ہو رہا....... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اچھا کیوں نہیں؟ کیسے ہو سکتا ہے!! اور اس کے ایسا ہونے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے!!! اگر ہماری ناکردہ کاری اور غلفت کا یہی عالم رہا تو ہو سکتا ہے وہ حالات جو ہمیں اس وقت بظاہر قابو سے باہر نظر آتے ہیں سچ مچ ہی قابو سے باہر ہو جائیں یعنی جھوٹ موٹ کا ''شیر آیا....... شیر آیا'' کہتے کہتے کہیں سچ مچ شیر آ ہی نہ جائے۔ یہ ایک ایسی ممکنہ صورت حال ہے جس پر ہم سب کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ وقت اور زمانہ کبھی کسی سے رعایت نہیں کرتے فرد تو فرد ہیں قابل کے بقول:

یہ کاروان ہستی ہے' تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی روا روی میں

تو ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اپنی بقا اور قومی سالمیت کے تحفظ کے لیے ہمیں کہاں کہاں لڑنا ہے.......! کس کس سے لڑنا ہے! .... کب کب لڑنا ہے.......! کیسے لڑنا ہے اور کیوں لڑنا ہے! ظاہر ہے ان باہم دست و گریباں سوالات کا ایک مکمل' حتمی اور شافی

جواب ممکن نہیں لیکن کوشش اور عمل سے ان الجھنوں کو کم تو کیا جا سکتا ہے جو تارِ عنکبوت کی طرح سارے منظروں پر لپٹتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک پنجابی محاورے کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ "ہاتھوں سے دی ہوئی گرہیں آگے چل کر دانتوں سے کھولنا پڑتی ہیں" اور انگریزی ضرب المثل کہتی ہے کہ

"اگر تم مسئلے کے حل کا حصہ نہیں بنو گے تو خود مسئلے کا حصہ بن جاؤ گے۔"

اقبال نے کہا تھا۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہ دعا پوری تو ہوئی مگر اس طرح نہیں جیسے اقبال نے سوچا اور چاہا تھا۔ وقت اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے طوفان سے آشنائی بھی ہو چکی اور اضطراب کی موجیں بھی سر سے گزرا چاہتی ہیں لیکن اس عمل کے پردے میں جس اقداری تبدیلی' بیداری' خود شناسی اور حرکیت کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اس کی تعبیر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وقت ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ ہمارے نزدیک اس صورتحال سے نبرد آزما ہونے کا بنیادی طریقہ خواہش اور عمل کے بعد کو کم سے کم کرنے میں پوشیدہ ہے اور اس کے لیے پہلی اور آخری شرط خود اعتمادی اور خود انحصاری کی ہے۔ اپنی خودی اور عزت نفس کے تحفظ کا احساس ہی افراد اور اقوام کی تقدیروں کا میزان بنتا ہے اور زمانہ انہی بیجوں کو پھل پھول دیتا ہے جن کی حفاظت اور آبیاری تن من دھن سے کی جاتی ہے۔ "زمانہ" تو صاف کہہ رہا ہے کہ.......

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

ہر ایک سے آشنا ہوں' لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب' کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ

◆◆◆

سائنس دانوں سے ایک اپیل

کوئی ایک ماہ قبل ہمیں ڈاکٹر عبدالقدیر خانہ صاحب کا بہت محبت بھرا اور خوشنما انداز میں لکھا ہوا ایک خط معہ ان کی منتخب اشعار پر مشتمل دیدہ زیب کتاب کی شکل میں ملا تھا۔ اس تعلق خاطر کے باعث ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم سائنس دانوں سے مشترکہ اپیل کرنے کی بجائے براہ راست ڈاکٹر قدیر خان صاحب ہی کو مخاطب کرتے لیکن پھر خیال آیا کہ آج کل وہ اپنے عظیم کارنامے کے اس تاریخی عمل اور ردعمل میں مصروف ہوں گے جس نے ایک طرف پوری قوم اور عالم اسلام کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے اور دوسری طرف ایک نامعلوم ہاتھ ان کی محبوب اور غیر متنازعہ شخصیت کو ایک ایسے سکینڈل میں الجھانے پر تلا ہوا ہے جو حکومت' پریس اور قوم سب کے لیے مقام فکر ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی ان سے اس درخواست کی راہ میں حائل ہوئی اور وہ یہ کہ کہیں ہماری اس بات کو غلط رنگ میں نہ لے لیا جائے اور ایک ہنسی اور خوشدلی پر مبنی بات بدتمیزی یا ٹھٹھول پن کی آلہ کار نہ بن جائے۔

بات کی تمہید بات سے لمبی ہوتی جا رہی ہے دراصل جس مسئلے کی طرف ہم اس وقت توجہ دلانا چاہ رہے ہیں اس سے سوائے چھپکلیوں کے' سب کو یکساں دلچسپی ہے۔ چھپکلیوں کے استثنا یا اختلاف کی وجہ صرف اتنی ہے کہ یہ بات براہ راست ان کے' یعنی ان کی زندگی کے خلاف ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ چھپکلیوں سے نجات کیسے حاصل کی جائے؟

تمام حشرات الارض اور چرند' پرند' درند کے بارے میں آپ کو حفاظتی تدابیر یا انہیں تلف کرنے کے طریقے' دوائیاں اور ہتھیار وغیرہ مل جاتے ہیں لیکن بہت تلاش و جستجو اور تحقیق کے باوجود اب تک ہمیں کوئی ایسا نسخہ یا طریقہ نہیں ملا جس کے ذریعے چھپکلیوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہو۔ قصص الانبیاء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں درج ہے کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے شکایت کی کہ چھپکلی آپ نے کیوں اور کس لیے پیدا کی ہے؟ کہ یہ بدصورت' قابل نفرت اور کراہت انگیز بھی ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تو انہیں جواب دیا گیا کہ کچھ دیر پہلے چھپکلی نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہی سوال ''انسان'' کے بارے میں کیا تھا۔

اس سے اور کچھ ہو نہ ہو کم از کم انسانی تاریخ میں چھپکلی کی اہمیت اور قدامت ضرور واضح ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چھپکلی آج ہی نہیں کسی بھی دور میں پسندیدہ نہیں سمجھی گئی۔

اگرچہ شفیق الرحمن نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اسے ''چھپ کلی'' بنا کر اور پھر ایک کردار سے اس کا ترجمہ ''پوشیدہ غنچی'' کرا کے اس کی ادبی حیثیت اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ چھپکلی انسان کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو جاتی ہے۔ کمرے کی اتنی بڑی دیوار پر ایک چھپکلی کے نمودار ہونے سے باقی کی سار چیزوں پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور آپ کا دھیان مستقلاً چھپکلی میں لگا رہتا ہے کہ کب وہ ٹیوب لائٹ کے پیچھے سے نکل کر جلوہ آرا ہوگی اور کب پھر کسی چیز یا تصویر کے پیچھے چھپ کر آپ کے صبر کا امتحان لے گی۔

ہم نے اس کے بارے میں (چھپ کلی کے علاوہ) تقریباً ہر مکتبہ فکر اور کار حیات کے لوگوں سے بات کی ہے مگر کسی نے بھی اسے فتنے کا کوئی موثر اور قابل عمل سد باب ہمیں نہیں بتایا جراثیم کش اور کیڑے مار دوائیاں بنانے والی کسی کمپنی نے بھی اب تک کوئی ایسا سپرے پاؤڈر یا گولیاں وغیرہ مارکیٹ نہیں کیں جن سے چھپکلیاں ختم کی جا سکتی ہوں اب تک کا سب سے ''بہتر'' مشورہ یہی ہے کہ ایک ائیر گن خریدی جائے اور پھر نشانہ پختہ کرنے کے بعد ایک ایک کر کے Shoot at Sight ((تھاں مار دیتا جائے)) کے اصول کے تحت انہیں مار گرایا جائے۔ اب اس عمل میں نشانہ بازی کے امتحان' دیواروں پر پڑنے والے نشانات اور چھپ کلیوں کے باقیات کو اٹھنے اور پھینکنے کی کراہت آمیز کاروائی کی تکمیل میں جو کچھ گزر سکتی ہے اسے سوچ کر ہی انسان کا حوصلہ اور ارادہ پست ہو جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہماری طرح کے گرم مرطوب بے شمار ملکوں میں یہ جنس کثیف بافراط پائی جاتی ہے لیکن کہیں بھی اس کے سد باب کا کوئی موثر طریقہ دریافت نہیں ہو سکا اور اگر ایسا ہے تو کم از کم پاکستان میں اب تک اس کی اطلاع نہیں پہنچی۔

اب ایک ایسے ملک کے سائنس دانوں سے جو ابھی ابھی ایٹم بم کا کامیاب دھماکہ کر کے فارغ ہوئے ہیں یہ درخواست کرنا کہ ہمیں چھپ کلی سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد کر دیں بظاہر بہت ہی معمولی اور مضحکہ خیز سی بات لگتی ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چھپکلی کے جملہ کشتگان ناز (جن میں یقیناً ہمارے محترم سائنس دان بھی شامل ہیں کہ یہ اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے ایک قومی مسئلہ ہے) ہماری اس بات کی تائید کریں گے اور یقیناً ایک ایسا دن بھی طلوع ہوگا جب ہم اپنے گھر کی دیواروں کو بلا کھٹکے دیکھ سکیں گے۔

کہتے ہیں کہ ہاتھی سے مٹر کا دانہ نہیں اٹھوانا چاہیے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ بعض اوقات اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا سو ہم وطن عزیز کے تمام متعلقہ سائنس دان حضرات سے ملتمس ہیں کہ وہ کچھ وقت نکال کر اس مسئلے پر بھی توجہ فرمائیں کہ یہ کام بہر حال ایٹمی دھماکہ کرنے سے تو مشکل نہیں ہے۔

◆◆◆

سیر پر بھی ٹیکس!

صحت اوراس سے متعلقہ مسائل کے حوالے سے پاکستانی معاشرے کی حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ بین الاقوامی تحقیق اور اعداد و شمار کے مطابق اس حوالے سے ہمارا شمار دنیا کے پسماندہ ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے دن سے لے کر اب تک کسی بھی حکومت کی ترجیحات میں (عملی طور پر) صحت اور تعلیم کے شعبے شامل نہیں رہے۔ سو ہمارے سکول' کالج اور یونیورسٹیاں یا ڈسپنسریاں' ہیلتھ یونٹ اور ہسپتال! سب کی حالت اور آؤٹ پٹ انتہائی ناقص اور افسوسناک ہے۔ عمومی صحت کے اس زوال کے نتائج معاشرے کی مجموعی کارکردگی پر کس کس طرح سے پڑتے ہیں' اس کی اہمیت اور تفصیل جاننے کے لیے منشی فاضل یا پی ایچ ڈی ہونا ضروری نہیں۔ بابا فرید نے یہ بات اگرچہ بہت وسیع اور فلسفیانہ تناظر میں کہی تھی مگر غور کیجئے تو اس کا اطلاق صحت کے مسئلے پر بھی ہوتا ہے کہ

فریدا میں جانوں دکھ مجھ کو دکھ سبھائے جگ
اچے چڑھ کے دیکھیا تے گھر گھر ایہو اگ

(ترجمہ: اے فرید! میں تو یہ سمجھا تھا کہ دکھ صرف مجھے ہی ہے مگر جب میں نے اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ آگ تو ہر گھر میں لگی ہے اور ساری دنیا میں دکھوں میں گھری ہوئی ہے)

آج کل ورلڈ کپ فٹ بال کے میچ ہو رہے ہیں اور ٹی وی کوریج کی وجہ سے پہلی بار پاکستان میں فٹ بال کو اس وسیع سطح پر کوریج اور پذیرائی مل رہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ پاکستان' بنگلہ دیش اور بھارت کی تقریباً ایک ارب بیس کروڑ کی آبادی میں سے ایک بھی ٹیم ان مقابلوں میں حصہ لینے کی ابتدائی شرائط بھی پوری نہیں کر پائی۔ ٹی وی سکرین پر نظر آنے والے کھلاڑیوں کی جسمانی فٹ نس کو دیکھ کر جب ہمارے بچے اور نوجوان بار بار یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ لوگ کس چکی کا پیسا آٹا کھاتے ہیں اور ان کی اور عام یورپی اور دیگر براعظموں کے لوگوں کی عمومی عمدہ صحت کا راز کیا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیا جواب دیا جائے۔ اگر موسم' آب و ہوا' خوراک اور بلند تر معیار زندگی اور سپورٹس کے اداروں کو بطور دلیل پیش کیا جائے تو نائیجیریا' مراکو' کیمرون' چلی' ارجنٹائن' پیراگوئے' برازیل' کروشیا' یوگوسلاویہ' رومانیہ' کولمبیا اور اسی نوع کی کچھ اور ٹیموں کی کارکردگی کو کس خانے میں رکھا جائے گا کیونکہ ان ملکوں کے مسائل

اور وسائل بھی کم وبیش وہی ہیں جو مارے ہیں بلکہ کئی چند ایک تو ہم سے بھی گئے گزرے ہیں۔

چند برس پہلے ہمیں ایک ادبی وفد کے ساتھ چین جانے کا موقع ملا' پندرہ دن کے قیام میں جب بھی ہمیں علی الصبح باہر نکلنے کا موقع ملا۔ہم نے یہی دیکھا کہ جیسے پورا چین گھروں سے نکل کر باغوں اور ہر طرح کی کھلی جگہوں پر ورزش میں مصروف ہے۔ چار پانچ سال کے بچوں سے لے کر اسی نوے سال کے بوڑھوں تک عورتیں اور مرد اپنی اپنی عمر کے مطابق جسمانی فٹنس کے لیے کسی نہ کسی طرح کی ورزش کر رہے ہیں' عام زندگی میں بھی وہ زیادہ تر پیدل چلتے یا سائیکلوں پر سفر کرتے ہیں۔ ہمارا چینی شاعر دوست چانگ شی شوان عرف انتخاب عالم اپنی ملازمت پر آنے جانے کے لیے روزانہ بیس کلومیٹر سائیکل چلاتا تھا اور ہم نے کبھی اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں دیکھے۔اتنی کثیر آبادی اور شہروں کے گنجان ہونے کے باوجود چینیوں نے اپنے باغات' کھیل کے میدانوں اور سیر گاہوں کو نہ صرف محفوظ رکھا ہے بلکہ ان میں مسلسل اضافے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک قدیم شہر ''سوچو'' جو زمانہ قدیم سے باغوں کا شہر کہلاتا ہے آج بھی اپنے باغوں کے ساتھ قائم ودائم ہے مگر ہم نے اپنے باغوں کے شہر لاہور کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ گزشتہ ۵۰ برس میں اس شہر کی آبادی تقریباً آٹھ گنا بڑھی ہے مگر کھیل کے میدان' باغات اور سیر گاہوں کی تعداد پہلے سے بھی کم ہو گئی ہے۔ پرانے لہور میں بچوں کے کھیلنے اور بڑوں کے سیر کرنے کی جگہیں مسلسل تجاوزات کی زد میں رہنے کے باعث تقریباً نابود ہو چکی ہیں۔سابق گورنر ملک غلام جیلانی کے زمانے میں اس کی طرف تھوڑی بہت توجہ دی گئی تھی جس سے صورتحال قدرے بہتر بھی ہوئی تھی مگر اب پھر اسی پہلے والی روش کی طرف مراجعت ہو رہی ہے۔کھیل کے میدانوں کی کمی کی وجہ سے بچے اور نوجوان گلیوں اور سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔سکولوں اور کالجوں کے طلبہ وطالبات مطلوبہ سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے کھیلوں کی طرف رخ ہی نہیں کرتے۔ایک مدت تک ''فطری جوہر اور اصلاحیت'' کی بنیاد پر ہم نے کرکٹ' ہاکی' سکواش' باکسنگ اور کشتی رانی میں کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیا اور کچھ غیر معمولی کامیابیاں بھی حاصل کیں مگر بنیادی سہولتوں کی کم یابی اور مناسب منصوبہ بندی کی نایابی کے باعث اب ہم ان متذکرہ بالا کھیلوں میں بھی مسلسل نشیب کا سفر کر رہے ہیں۔اولمپک' ایشن اور سارک کھیلوں کے مقابلوں میں اپنے سے کئی گنا چھوٹے ملکوں کے مقابلے میں ہمارے میڈلز کی تعداد شرمناک حد تک کم ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو سرے سے ہوتی ہی نہیں۔

باغ جناح (لارنس گارڈنز) لاہور کا تاریخی باغ ہے' اس کی وسعت' خوبصورتی اور رنگا رنگی لاہور کے حسن کا ایک اہم حصہ ہے۔ اگرچہ اقبال پارک' جلو پارک' ماڈل ٹاؤن پارک' گلشن اقبال پارک اور ریس کورس گراؤنڈ جیسی سیرگاہیں بھی موجود ہیں مگر انہیں باغ جناح کے مقابلے میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا' روزانہ صبح اور شام کے اوقات میں ہزاروں لوگ (بچے' بوڑھے' جوان' عورتیں) یہاں سیر

کرنے کے لیے آتے ہیں۔ گزشتہ تقریباً دس برس سے ہم بھی روزانہ صبح واک کے لیے ایک گھنٹہ اس کی فضا میں گزارتے ہیں اور یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ڈاکٹر مشورے کے مطابق سیر کرنے والے امراء اور درمیانے طبقے کے ساتھ ساتھ ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ بھی یہاں آتے ہیں جنکی مالی حالت واضح طور پر بہت پتلی ہوتی ہے۔

تعلیم کی کمی اور غربت کی افراط کے باوجود ان لوگوں کا سیر کے لیے آنا اور بچوں کا کھیلنا بہت اچھا لگتا ہے کہ اس میں قوم کی اجتماعی صحت کی بہتری کے آثار اور امکانات نظر آتے ہیں مگر گزشتہ چند دنوں سے اس کے داخلے کے تمام راستوں پر لوہے کے بڑے بڑے گیٹ لگائے جا رہے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ کسی بزرجمہر نے صوبائی حکومت اور لاہور کی انتظامیہ کو اس میں داخلے پر ٹکٹ لگانے کا مشورہ نہ دے دیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بڑے ظلم اور زیادتی کی بات ہے کہ ٹیکسوں کے بوجھ سے ہانپتی ہوئی اس قوم سے سانس ٹھیک کرنے کی جگہ بھی چھین لی جائے۔ اس طرح کے ٹکٹ سے حکومت کے خزانے میں تو حسب معمول کچھ نہیں جائے گا البتہ چوری اور کرپشن کا ایک اور راستہ ضرور کھل جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ہزاروں لوگ ایک ایسی سہولت سے عملی طور پر محروم ہو جائیں گے جس کی فراہمی ہر معاشرے اور حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہوتی ہے۔

باغ جناح کے ذکر سے یاد آیا کہ کئی ماہ قبل ہم نے اسی کالم میں ''گلستان فاطمہ'' کی آرائش اور دیکھ بھال کے سلسلے میں کچھ گزارشات کی تھیں۔ اگر بحث مہم کے تحت متعلقہ لوگوں کے دفتروں میں اخبارات کی فراہمی بند نہیں ہوئی تو ہم یہی عرض کریں گے کہ

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ''ادھر'' بھی

◆◆◆

سائنس کی ترویج اور ہمارا میڈیا

سائنس اور سائنسی علوم کی تاریخ ماضی میں اتنی دور تک جاتی ہے کہ کیلنڈر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ہمیں ق م یا بی سی کا ایک ایسا سہارا لینا پڑتا ہے جہاں وقت آگے کی بجائے پیچھے کی طرف چلنے لگتا ہے اور لوگوں کی عمریں بڑھنے کی بجائے گھٹنا شروع ہو جاتی ہیں لیکن جہاں تک سائنس کا انسانی ذہن اور زندگی کے ساتھ ارتقاء اور رابطے کا تعلق ہے اس میں جو کام گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں ہوا ہے اس کے مقابلے میں تاریخ اور ماقبل تاریخ کے سارے ادوار ہیچ اور معمولی نظر آتے ہیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ چھ ہزار سال قبل تعمیر ہونے والے اہرام مصر اور کم و بیش تین ہزار سال پہلے کے یونانی عہد کے سائنس بنیاد افکار' انسان کے اجتماعی ماضی کا ایک عظیم سرمایہ ہیں اور یہ کہ آٹھویں سے بارھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں اور تیرھویں صدی سے نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب کے دنوں تک اہل یورپ نے تحقیق اور ایجادات میں بہت نام کمایا ہے لیکن موجودہ دور سے ان سب باتوں کا رشتہ کم و بیش خواب اور تعبیر خواب جیسا ہے کہ وہ سائنس جو دو سو بارس تک محض چند ''سر پھرے سوچنے والوں'' کا مشغلہ اور Passion ہوا کرتی تھی ہمارے اردگرد اور ہماری زندگیوں کے ہر شعبے میں اس طرح نفوذ کر چکی ہے کہ اب اس کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو چکا ہے۔

لیکن تیسری دنیا کے ممالک اور بالخصوص پاکستان یا اسلامی دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس سارے منظرنامے میں ہمارا رول ناظرین اور سامعین ہی کا بنتا ہے' سنٹر سٹیج پر جاری کھیل میں نہ تو ہمارا کوئی کردار ہے اور نہ ہی کہانی کے ارتقاء میں ہم کسی شمار میں آتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم لوگ سائنس سے بہرہ ور تو ضرور ہیں لیکن اس سے ہمارا رشتہ صرف استفادے کی حد تک ہے۔ سائنسی علوم ہمارے یہاں زیادہ تر ''علوم'' کی حد تک ہی ہیں یعنی عملی طور پر ان کے فروغ میں ہمارا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے یہی وجہ ہے کہ سائنس کے فروغ سے حاصل ہونے والی ٹیکنالوجی بھی ہمارے یہاں صرف امپورٹ ہوتی ہے' تخلیق نہیں کی جاتی۔

ہمارے ادارے اردو سائنس بورڈ نے چند برس قبل ''دنیا کے عظیم سائنس دان'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں ایک سو دس ایسے سائنس دانوں کو جگہ دی گئی ہے جن کی فکر' تحقیق اور ایجادات کے باعث آج یہ دنیا سائنس کی برکات سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ عہد یونان کے چھ سائنس دانوں (۴۶۰ قبل مسیح سے ۱۳۰ عیسوی تک) بقراط' ارسطو' ارشمیدس' بطلیموس اور جالینوس کے بعد آٹھویں صدی عیسوی تک اس کرہ ارض پر کسی قابل ذکر سائنس دان کا ظہور نہیں ہوا۔ اس کے بعد ہمیں اس فہرست میں یکے بعد

دیگر ے دس مسلمانوں کے نام (جابر بن حیان' ابوعثمان' جحظ' محمد بن موسیٰ خوارزمی' ابومحمد زکریا الرازی' الفارابی' ابوالاقاسم الزہراوی' ابن الہیثم' البیرونی' عمر خیام اور ابن النفیس) نظر آتے ہیں۔ ابن النفیس جو اس فہرست کا آخری آدمی ہے ۱۲۸۸ء میں فوت ہوا اور اس کے ساتھ ہی تاریخ عالم سے کم ازکم سائنس کی حد تک مسلمانوں کا پتہ کٹ گیا۔ اس کے بعد کی پانچ صدیوں یعنی انیسویں صدی کے آغاز تک کے ۴۳ سائنس دان اور سن ۱۸۰۰ء سے ۱۹۲۸ء تک پیدا ہونے والے ۵۱ عظیم سائنس دانوں میں سے کسی ایک کا بھی تعلق اسلامی دنیا سے نہیں ہے۔ اقبال نے تو کہا تھا۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

لیکن اسلامی دنیا میں علوم کی اس قحط سالی کی عمر کم وبیش سات سو سال بنتی ہے اور اب جبکہ وقت کی رفتار گولی کی رفتار سے تیز تر ہوتی جارہی ہے سات صدیوں کی یہ نیند اور بھی زیادہ لمبی اور گہری محسوس ہورہی ہے جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہم ابھی تک غنودگی کے عالم میں ہیں اور آدھے سوئے آدھے جاگے کے انداز میں کاروان حیات کے ساتھ چلنے کی کوشش کررہے ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جب ہم اپنے موضوع یعنی "مستقبل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے حوالے سے میڈیا کے رول" کی طرف آتے ہیں تو کئی ایک سوال دامن گیر ہوتے ہیں۔

۱۔ سائنس سے ہماری مراد کیا ہے؟

۲۔ سائنس کی تحقیق اور ترقی میں ہمارا رول کیا ہے؟

۳۔ ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہونے والی ترقی میں ہمارا اپنا حصہ کتنا ہے؟

۴۔ کیا ہم ایک کنزیومر سوسائٹی کی جگہ مینوفیکچر رکا مقام حاصل کرسکتے ہیں؟

۵۔ کیا سائنس کی تعلیم صرف سائنس کے طلبہ کے لیے ضروری اور مفید ہے؟

۶۔ معاشرے میں سائنسی شعور کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے؟

۷۔ ہماری قومی ترجیحات میں سائنس اور اس کا فروغ کس نمبر پر آتے ہیں؟

سوال تو کچھ اور بھی ہیں لیکن ہم ان کی تفصیل اور گنتی میں جانے کی بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ اب تک ہمارے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے ان کے سلسلے میں کیا کچھ اور کس طرح سے کیا ہے اور یہ کہ اس شعبے میں اور کیا کیا کچھ کیا جاسکتا ہے؟

یوں تو کہنے کو پی ٹی وی نے ایجوکیشنل ٹی وی کے نام سے ایک پورا چینل کھول رکھا ہے اور بلیک اینڈ وائٹ پروگراموں کے زمانے سے ناظرین کو تعلیم کے حوالے سے مختلف انداز اور معیار کے سائنسی پروگرام دکھائے جارہے ہیں لیکن مستثنیات سے قطع نظر یہ پروگرام کبھی بھی دلچسپی سے نہیں دیکھے گئے۔ ان پروگراموں کو نوعیت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تعلیمی اسباق پر مشتمل نصابی اور امدادی پروگرام

۲۔ سائنس کوئز

۳۔ حیاتیات' نباتایات' وائلڈ لائف اور ارضیات وغیرہ کے شعبوں سے متعلق انگریزی فلمیں۔

۴۔ کارل ساگاں کے Cosmos ٹائپ معیاری پروگرام اردو ترجمے کے ساتھ۔

۵۔ نیشنل جیوگرافک اور دیگر عالمی سطح کے اداروں کی تیار کردہ تحقیقاتی فلمیں

بظاہر ان سارے پروگراموں کی موجودگی میں ٹی وی پر یہ الزام دھرنا بہت مشکل اور نامناسب ہے کہ اس نے سائنس' سائنسی افکار' علوم اور شعور پھیلانے کے سلسلے میں اپنا حصہ معیار اور حصول مقصد کا تعلق ہے وہاں مقامات جنبش ابرو نکلنے کی قدم قدم پر گنجائش موجود ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں میٹرک سے آگے تعلیم حاصل کرنے والوں کی اوسط کل آبادی کا تقریباً ۳ فیصد رہ جاتی ہے اعلیٰ تر علمی سطح کے تیار کردہ یہ غیر ملکی پروگرام باقی کے ۹۷ فیصد عوام الناس کے کس کام آسکتے ہیں؟ اس موازنے سے ہماری مراد ان پروگراموں یا ان کی افادیت پر تنقید کرنا نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اجتماعی سطح پر اس سے ہماری قوم کا صرف ایک مخصوص اور محدود طبقہ ہی فائدہ اٹھا پاتا ہے اور عام آدمی کے سائنسی شعور میں یہ پروگرام کسی قسم کا اضافہ کیے بغیر آتے اور چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک ان پروگراموں کا تعلق ہے جو عام آدمی کے استفادے اور سائنس کے بارے میں بنیادی معلومات پر مبنی ہوتے ہیں تو ان کے بارے میں ہمارے ٹی وی کے ارباب بست وکشاد آج تک کوئی موزوں اور بامقصد لائحہ عمل طے نہیں کر پائے۔ یہ پروگرام عام طور پر انتہائی بے رس' غیر دلچسپ' Unimaginative

اور ایک ایسی غیر پیشہ ورانہ بے دلی سے تیار کردہ ہوتے ہیں جس کے باعث یہ ناظرین میں سائنسی شعور کے فروغ کی بجائے الٹا سائنس کے بارے میں ایک ایسا رویہ پیدا کردیتے ہیں کہ اس کا Defenece Mechinisim غیر ضروری طور پر الرٹ ہو کر کسی اچھے پروگرام کو قبول کرنے سے بھی انکار کردیتا ہے' عام طور پر ایسے مخصوص نوعیت کے پروگراموں کے پروڈیوسر کا انتخاب کرتے وقت بھی احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا اور ترجیحات میں نچلے درجے پر ہونے باعث سائنس اور تعلیم کے پروگرام اکثر ایسے پروڈیوسرز کو

دیئے جاتے ہیں جو کوئی بھی پروگرام کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

پروگرام کے مواد، انداز، پیشکش اور پیش کاروں کی صلاحیت کے تعین کے سلسلے میں بھی جدت' توجہ اور تحقیق سے کام نہیں لیا جاتا جس کے نتیجے میں یہ پروگرام ٹی وی کی کتابی کاروائی کا حصہ تو بن جاتے ہیں مگر ان سے سائنس اور سائنسی شعور کے فروغ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ریڈیو اور پرنٹ میڈیا میں یہ صورتحال اور بھی تکلیف دہ ہے کہ اگرچہ تمام قومی اخبارات نے سائنس اور تعلیم کے لیے صفحات مخصوص کر رکھے ہیں مگر یہاں بھی سوائے انگریزی اخبارات میں چھپنے والی کچھ تحریروں کے 'بیشتر مواد اتنا ہی سطحی' غیر دلچسپ اور بھرتی کا ہوتا ہے جس کا اشارہ ٹی وی پروگراموں کے ذکر میں کیا گیا ہے یعنی اگر بنظر غور دیکھا جائے تو ہمارا میڈیا پڑھے لکھے لوگوں اور سائنس کے طلبہ کے لیے تو کچھ نہ کچھ مثبت اور بامقصد کام کر رہا ہے مگر جہاں تک سائنس کو مقبول اور پاپولرائز کرنے کا تعلق ہے ظاہر ہے اس بہت محدود اقلیت سے کام نہیں چلایا جاسکتا۔ فی الوقت ہم ایک معمول کی طرح اپنے غیر ملکی عاملوں کی آواز پر بچے جمہورے کی ''گھوم جا' گھوم گیا'' کے ایک بے معنی عمل میں مبتلا ہیں۔ ہم خود اپنے ہی معاشرے اور اس کے مسائل کے بارے میں ان غیر ملکی عاملوں کی تحقیق اور ہدایات کے محتاج رہتے ہیں جونہی وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہمارا مسئلہ فیملی پلاننگ ہے ہم اپنے گلوں میں ڈھول ڈال کر نکل پڑتے ہیں اور گلی گلی اس کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں۔ پھر چند برس بعد ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اب سے ہمارا مسئلہ ماحولیات ہو گیا ہے اس لیے اگر امداد چاہیے تو فوراً اپنے ڈھول بدل لو اور ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔

ہماری غلامی کی انتہا یہ ہے کہ ہم اپنی فصلیں بھی انہی عاملوں کے حکم پر اگاتے اور ایکسپورٹ کرتے ہیں کیونکہ ہماری ایکسپورٹس کا کوٹہ کہیں اور بیٹھ کر طے کیا جاتا ہے۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھتے ہیں بیڑیاں ہیں پاؤں میں

لیکن دیکھنے اور سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں ان بیڑیوں کو آئندہ بھی اسی طرح پہنے رکھنا ہے؟ یا تیسری دنیا کے نئے وژن کے حامل' اپنے کچھ دور و نزدیک کے ہمسایہ ملکوں کی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنی اولین قومی ترجیحات میں شامل کر کے ۲۱ ویں صدی میں ایک سچ مچ کے آزاد' جدید' ترقی پسند اور زندہ معاشرے کی شکل میں داخل ہونا ہے!

دیکھا جائے تو اس ساری سستی' غلط حکمت عملی' اجتماعی جہالت اور سیاسی درماندگی کے باوجود آج پاکستان ہر میدان میں نہ صرف

واضح ترقی کر چکا ہے بلکہ مزید ترقی کے ایسے غیر معمولی اور بے شمار امکانات بھی رکھتا ہے جنہیں سوائے تحفۂ غیبی کے شائد کوئی اور نام نہ دیا جا سکتا ہو۔ دیگر کئی شعبوں کی طرح ہمارے پاس سائنس کے شعبے میں بھی اتنی صلاحیت یقیناً موجود ہے جس کے صحیح اور منضبط استعمال سے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے اس خسارے کو بے حد کم کیا جا سکتا ہے جو ہمیں اپنی تاریخ سے ورثے میں ملا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اقوام عالم کی صف میں آئندہ بھی ایک صارف معاشرے (Consumer Society) کی طرح دوسروں کے اشارہ ابرو پر چلتے رہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اوپر اعتماد کرنا سیکھیں' اپنے اہل علم و ہنر کی قدر کریں' اپنی قومی ترجیحات کے تعین میں عقل و دانش اور تسلسل کی پالیسی سے کام لیں اور سائنسی شعور کو معاشرے میں پھیلانے اور عام کرنے کے لیے ان تمام ذرائع سے کام لیں جو فی الوقت موجود ہیں یا آئندہ مہیا ہو سکتے ہیں۔

اس سارے تناظر میں اگر سائنس کی ترویج و ترقی کے لیے میڈیا کے رول کا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ میڈیا سائنس اور اس کے فروغ کو اپنی ترجیحات میں اس کا مناسب مقام دے۔

۲۔ سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کو سائنسی فکر اور شعور سے بہرہ ور کرنے کے لیے ایک باقاعدہ پالیسی بنائی جائے۔

۳۔ میڈیا میں سائنس کی ترویج و ترقی کے حوالے سے یہ کام ایسے لوگوں کو دیا جائے جو اسے انجام دینے کی معقول صلاحیت رکھتے ہوں۔

۴۔ T.V کی Presentation یعنی پیشکش کے انداز میں ایسی تخلیقی اور دلکش تبدیلیاں کی جائیں کہ یہ پروگرام ناظرین کی توجہ اور پسندیدگی حاصل کر سکیں

۵۔ دلچسپ اور معلوماتی سائنسی مواد کو لیکچرز' ڈس کشنز اور سائنس کوئز کے پامال اور روایتی Formats سے نکال کر انہیں عمومی دلچسپی کے پروگراموں مثلاً ڈرامے اور موسیقی کے رنگ میں بھی پیش کیا جائے۔

۶۔ عام سائنسی معلومات پر مشتمل مواد کو آسان' خوبصورت اور باتصویر انداز میں زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

۷۔ غیر ضروری رسم و رواج اور جہالت پر مبنی انداز فکر کو دور کرنے اور اپنے اردگرد کی زندگی کو سائنسی اور حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھنے کے رویئے کو فروغ دیا جائے اور لوگوں کے دماغوں میں اس بات کو راسخ کیا جائے کہ مذہب اور سائنس دو علیحدہ علیحدہ راستے

نہیں بلکہ یہ اصل میں ایک ہی وجود رکھتے ہیں اور یہ کہ سائنس کا سارا نظام بھی اسی رب واحد کا تخلیق کردہ ہے جس نے انسان کے لیے دین اور مذہب وضع کیے ہیں۔

۸۔ سائنس کے مختلف شعبوں کے ان لوگوں کے کارناموں کو سامنے لایا جائے جو اپنی شبانہ روز محنت اور غیر معمولی خدمات سر انجام دے رہے ہیں اور اس ضمن میں اسلامی تاریخ کے اس دور کو بھی اجاگر کیا جائے جب آٹھویں سے بارہویں صدی عیسوی تک کی تاریخ سائنس صرف انہی کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی تھی۔

۲۰ ویں صدی کے ان آخری پچاس برسوں کو بجا طور پر میڈیا کا زمانہ کہا جا سکتا ہے اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ برسوں میں اس کی وسعت اور طاقت میں مزید اضافہ ہوگا سو ایسے میں اگر سائنس کو مقبول عام بنانے کے لیے میڈیا کا صحیح اور موثر استعمال کیا جائے تو یہ ایک ایسے راستے پر قدم رکھنا ہوگا جس کی حدود حد لا مکاں کو چھونے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں ایسی معیاری تبدیلی کا بھی احاطہ کرتی ہیں جس کے باعث یہ زمین رشک ارم بن سکتی ہے اور جس کے حصول اور تکمیل کا سفر ہی دراصل تخلیق نوع آدم کا باعث حقیقی ہے۔

اقبال نے روح ارضی کے حوالے سے زمین پر آدم کا استقبال کچھ ان لفظوں میں کیا تھا۔

کھول آنکھ' زمین دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ

اب وقت ہے کہ ابن آدم اس حقیقت ازلی کے ان رازوں سے آشنا ہو جو اس کے لیے اس چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات میں چھپا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ ہم اس وقت اس کارواں کی پچھلی صفوں میں سہی لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ سائنس کے فروغ میں میڈیا کے صحیح اور موثر استعمال سے ہم اپنے معاشرے میں موجود صلاحیتوں کو اس حد تک آگے لے جا سکتے ہیں کہ آنے والے کل میں اس کارواں کے لوگ اپنی ایڑیوں پر کھڑے ہو ہو کر اس گرد سفر کو دیکھتے نظر آئیں جس سے آگے محو سفر ہوں۔

◆◆◆

آنکھ کیا کچھ دیکھتی ہے

باغ جناح (لارنس گارڈنز) یقیناً باغوں کے اس تاریخی شہر لاہور کا ایک نشان امتیاز ہے اور اس ہمہ جہت اور ہمہ گیر زوال کی فضا میں بھی اس کی موجودہ حالت اگر مثالی نہیں تو کم از کم تسلی بخش ضرور کہی جا سکتی ہے لیکن روزانہ صبح سیر کے دوران جب ہم ''گلستان فاطمہ'' کے قریب سے گزرتے ہیں تو ایک عجیب سی بدمزگی اور الجھن کا احساس ہوتا ہے کہ اس انتہائی خوبصورت قطعہ باغ کو ہم نے کور ذوقی اور بدمذاقی کا ایک اشتہار بنا رکھا ہے' یعنی جہاں جہاں قدرت کی تخلیقی عطا میں انسانی تعمیر کا دخل ہوا ہے بات آسمان سے زمین پر آپڑی ہے' خاص طور پر اس کے مختلف حصوں میں جو تزئینی ڈیزائن اینٹوں سے تعمیر کیے گئے ہیں ان پر لگایا ہوا رنگ آنکھوں کو اس قدر برا اور ذوق سلیم کو ایسا ناگوار لگتا ہے کہ گلستان کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے یہ ایک ایسا رنگ ہے جس کے لیے رنگوں کی زبان کا کوئی ایک لفظ کام نہیں دے سکتا کیونکہ نہ یہ سرخ ہے نہ پیازی نہ گچ کا رنگ ہے اور نہ ہی ہے کوئی میرون کا شیڈ ہے۔ ایک عجیب بدھا سا کچا اور بے معنی سا رنگ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس نے تجویز اور پسند کیا تھا اور اب اتنے برسوں سے متعلقہ افسران میں سے کسی کو بھی اسے دیکھ کر الجھن کیوں محسوس نہیں ہوتی! باغ کے قدرتی سبز رنگ کے مختلف شیڈز اور بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ ساتھ پولوں کے خوشنما رنگوں کے درمیان اس رنگ کی بدرنگی آنکھوں کے لیے ایک عذاب بن جاتی ہے۔

آنکھوں کی بات چلی ہے تو ہمارا دھیان ایک ایسے واقعے کی طرف جا رہا ہے جس کا خوشگوار تاثر ہم تمام اہل وطن تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ معاشرے کی بدنمائی کے مظاہر کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہمیں ان اچھی باتوں کا ذکر بھی کرتے رہنا چاہیے جو بے شک تعداد میں کم ہوں لیکن ان کے ہونے سے دل کو سہارا سا رہتا ہے کہ صحرا کے اس سفر میں کئی نخلستان بھی ہماری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ ہمارے عزیز دوست پروفیسر جاوید احمد شیخ جو پولیٹیکل سائنس کے استاد ہیں اور آج کل گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور وائس پرنسپل فرائض سرانجام دے رہے ہیں بچپن کے ایک حادثے اور اس وقت مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بینائی سے تقریباً محروم ہو چکے تھے اور ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ جو ۲ یا ۳ فیصد بصارت باقی ہے وہ بھی آئندہ ایک دو سال میں ختم ہو جائے گی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ان کی ایک آنکھ میں موتیا بھی اتر آیا جس کا آپریشن ناگزیر تھا عام حالات میں موتیے کا یہ آپریشن اب ایک بہت عام اور معمولی بات ہے لیکن جاوید شیخ کے کیس میں ان کی آنکھ کو چھیڑنا ایک ایسا رسک کا کام تھا جسے نہ لینے کا مشورہ میرا

کیوس (نیویارک) کے اپ سٹیٹ میڈیکل سنٹر کے بورڈ کے علاوہ امریکن ماہرین چشم کا ایک پرویئویٹ بورڈ بھی دے چکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جاوید شیخ کی آنکھ کا کارنیا (Cornia) اس حالت میں ہے کہ آپریشن کی کامیابی کے چانسز صرف ۳۰ فیصد ہیں لیکن اس کے بعد بھی یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ ان کی بینائی میں کوئی قابل ذکر اضافہ ہوگا جبکہ ۷۰ فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے مکمل طور پر بینائی سے محروم ہو جائیں گے۔

اندریں حالات انہوں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں الشفاء آئی ٹرسٹ ہاسپٹل راولپنڈی سے رابطہ قائم کیا کہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جاسکے' جاوید شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ دس سال امریکہ میں رہنے اور اتنے مہنگے اور نامور ماہرین چشم کے مشورے کے بعد ان کا یہ فیصلہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق تھا لیکن ہسپتال کے قائم' آپریشن کے دوران اور بعد از آپریشن دیکھ بھال کا جو انتہائی خوشوار اور کامیاب تجربہ انہیں ہوا وہ ان کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ ان کے معالج ڈاکٹر واجد علی نے ساری رپورٹوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان کی آنکھ کے مختلف ٹیسٹ کیے تو کارنیا تبدیل کرنے سے پہلے یہ مشورہ دیا کہ انہیں اپنی اس آنکھ کے آپریشن کا چانس اس لیے لے لینا چاہیے کہ یوں بھی اب اس کی بنیائی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ سو یہ رسک لیا گیا اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپریشن کی ابتدائی کاروائی کے دوران ہی کچھ ایسی صورتحال بن گئی کہ آنکھ کا وہ حصہ جو بالکل چر مرہو کر ایک ملبے کی شکل اختیار کر چکا تھا اس میں واضح اور مثبت تبدیلی کے آثار پیدا ہو گئے اور ہسپتال والوں نے انتہائی محنت اور مہارت سے بہت کم جراحی کے ساتھ اسے اس حد تک ٹھیک کر دیا کہ اب وہ آنکھ تقریباً ۵۰ فیصد تک بالکل صحیح کام کر رہی ہے۔

اس ساری تفصیل کا مطلب امریکن ڈاکٹروں کی ''نالائقی'' یا پاکستانی ڈاکٹروں کی ''قابلیت'' کا موازنہ کرنا اور پھر بغلیں بجانا نہیں ہے کہنے اور دیکھنے والی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بھی جواہر قابل کی کمی نہیں اور ایسے ادارے بھی موجود ہیں جہاں بین الاقوامی معیار کا علاج' سہولتیں اور ماحول موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں علاج کی فیس اور اخراجات میں مریض کی مالی حالت کو نہ صرف پیش نظر رکھا جاتا ہے بلکہ بہت سے لوگوں کا مفت علاج بھی کیا جاتا ہے۔

اللہ کی دی ہوئی اس عظیم نعمت' یعنی آنکھوں کی حفاظت' بینائی سے محروم لوگوں کے غم میں شرکت' اور ان کے لیے بینائی کو قابل حصول بنانے میں ہم سب کی معاونت' ایک ایسا اہم فریضہ ہے جس کی ادائی ہمارے معاشرے کو حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پر لانے کا باعث بن سکتی ہے۔ کیونکہ کسی باغ کے اندر گلستان فاطمہ والی صورتحال دیکھنے کے لیے بھی سب سے پہلی شرط تو بینائی ہی ہے ''چشم بینا'' اپنی جگہ پر ایک الگ موضوع ہے کہ اس کا تعلق بصیرت سے ہے۔ میر صاحب نے کہا تھا۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

لیکن وہ لوگ کیا کریں جنہیں آئینوں میں بھی اپنے چہرے دکھائی نہیں دیتے!!

◆◆◆

دانی ہمہ دانی

پروفیسر احمد حسن دانی وطن عزیز کے ان چند سکالرز میں سے ہیں جن پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ' آرکیالوجی اور مطالعہ تمدن میں ان کے نظریات اور خیالات وافکار کا ایک زمانہ معترف ہے اور ایک استاد ہونے کے ناتے سے انہیں اپنے نقطہ نظر کی ترسیل پر جو غیر معمولی گرفت ہے وہ ایک ایسا اضافی وصف ہے جو انہیں ''خواص'' کے ساتھ ساتھ ''عوام'' میں بھی مقبول ومحترم بناتا ہے۔

گزشتہ دنوں انہوں نے لاہور میں ہمارے دوست' معروف ماہر قانون' سیاستدان' سابقہ وزیر مال وممبر سینٹ اعتزاز احسن کی انگریزی کتاب کی تقریب رونمائی کے حوالے سے جو صدارتی خطبہ نما ایک لیکچر دیا اس کی بازگشت اور خوشبو ان سامعین کے دل ودماغ میں تو ہے ہی جو اس تقریب میں موجود تھے لیکن جو باتیں انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران کیں' وہ ایسی قیمتی' وقیع' دوررس' تخلیقی اور چونکا دینے والی ہیں کہ ان پر تمام اہل فکر کو بھرپور سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ سوچنا چاہیے۔

اعتزاز احسن کی کتاب کا موضوع وادی سندھ اور تشکیل پاکستان کے گرد گھومتا ہے لیکن تہذیبی اور جغرافیائی دونوں اعتبار سے اس میں بیان کی گئی دریائے سندھ کی کہانی دراصل اس پورے خطے کی کہانی ہے جسے اس وقت پاکستان کہا جاتا ہے اور تشکیل پاکستان کے عمل کی تفصیلات کے بیان میں پورے برصغیر پاک وہند کی تاریخ کو تناظر اور پس منظر کے طور پر برتا اور رکھا گیا ہے۔ دانی صاحب نے اپنی گفتگو میں بہت عالمانہ خوبصورت کے ساتھ کتاب کی خوبیوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ جہاں اعتزاز احسن کی تحریر کے کچھ تسامحات کی نشاندہی کی وہاں کچھ ایسے مسائل اور تاریخی مغالطوں کی طرف بھی توجہ منعطف کروائی جو مغربی دانشوروں اور تاریخ نگاروں کے بعض مخصوص سیاسی مصالح کے تحت لکھی گئی تحریروں کے ذریعے ہمارے علمی اور تاریخی تصورات میں راہ پا گئی ہیں اور جن کی موجودگی کے باعث ہم اپنی تاریخ کے بہت سی ایسی الجھنوں کا شکار رہتے ہیں جن کا اثر نہ صرف ہماری اجتماعی سوچ کو گمراہ کرتا ہے بلکہ ہماری درسی کتابوں کی وساطت سے یہ غلط تصورات' من گھڑت باتیں اور مفروضات ہماری آئندہ نسل کو بھی حقیقت اور حقائق سے دور لے جا رہے ہیں۔ مشتے از خروارے دیکھیے.......

ا۔ درہ خیبر کو برصغیر کی شمال مغربی سرحد ۱۸۹۷ء میں انگریز نے قرار دیا اور یوں پاکستانی علاقوں کے ساتھ صدیوں پر محیط سنٹرل

ایشیا' افغانستان اور ایران کے ہمہ جہت روابط کے درمیان ایک ایسی مصنوعی دیوار کھڑی کر دی ہے کہ اپنی رگوں میں ۶۲ فیصد سنٹرل ایشین خون ہونے کے باوجود ہم ان علاقوں کو اجنبی' غیر یا زیادہ سے زیادہ ہمسایہ تصور کرتے ہیں۔

۲۔ تاریخ کی تمام کتابوں میں شیر شاہ سوری کے حوالے سے جی ٹی روڈ کلکتہ سے پشاور تک بیان کی جاتی ہے جبکہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس وقت نہ تو کلکتہ ایک شہر کے طور پر کوئی وجود رکھتا تھا اور نہ ہی پشتون ہونے کے باوجود' بوجوہ شیر شاہ سوری کبھی پشاور پر اپنا اقتدار قائم کر سکا تھا۔

۳۔ امیر تیمور اور نادر شاہ درانی جنہیں ہماری تاریخوں میں طالع آزما' جنگجو' حملہ آور اور لوٹ مار کرنے والے ظالم اور سفاک کرداروں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اصل میں اس زمانے کے معروضی حالات کے پیش نظر ان علاقوں میں آئے جنہیں اب پاکستان کہا جاتا ہے لیکن برٹش راج سے پہلے یہ سارا علاقہ بے شمار حوالوں سے ان علاقوں سے جڑا ہوا تھا جنہیں آج وسطی ایشیائی ریاستوں' افغانستان اور ایران کے حوالوں سے علیحدہ ملکوں کے طور پر جانا جاتا ہے۔

۴۔ کشمیر اور شمالی علاقہ جات پر دہلی سرکار کا تسلط اکبر اعظم کے زمانے میں پہلی بار ۱۵۸۶ء میں ہوا لیکن اصل میں یہ قبضہ امیر تیمور کے ایک جانشین سلطان سعید (جو کہ کاشغر کا بادشاہ تھا) کے ایک جرنیل نے کیا تھا جس کو بعد میں رشوت دے کر اکبر نے اپنے ساتھ ملا لیا اور یوں یہ علاقے مغل سلطنت کا حصہ بن گئے۔

۵۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو دبانے میں مددگار بننے پر جہاں پنجاب کے کچھ گھرانے انگریزوں کے نمائندوں کے طور پر جاگیردار بن کر ابھرے اور پھر تاریخ میں سفر کرتے ہوئے آج ہماری اسمبلیوں میں براجمان ہیں وہاں انہی کے فراہم کیے ہوئے سپاہیوں کی ''وفاداری'' ہی تھی جس کے باعث انگریز اپنی حکومت کے اختتام تک ۸۰ فیصد انڈین آرمی یہیں سے بھرتی کرتا رہا۔

۶۔ پاکستان کے نام اور تصور کی تشکیل میں بعض تاریخی حقائق سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد اور چودھری رحمت علی کے ۱۹۳۳ء والے نقشے سے پہلے صوبہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے موقع پر' یہ دونوں باتیں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں اس وقت زیر بحث آئی تھیں جب قائداعظم سیاسی حالات سے برگشتہ ہو کر انگلستان جا چکے تھے اور سر شفیع والی مسلم لیگ ہی کام کر رہی تھی۔

اسی طرح یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظم کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی' معاشی' مذہبی اور تہذیبی تحفظ فراہم کرنا تھا اور اس کے لیے کیبنٹ پلان کے حوالے سے ۱۹۴۶ء تک وہ کسی ایسے حل کر لیے تیار تھے جس میں برصغیر کو

تقسیم نہ کرنا پڑتا۔

دانی صاحب کے تجزیئے اور ان کے نتائج سے جزوی اختلاف تو شاید ممکن ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ان تمام مسائل اور عوامل پر کھلے دل ودماغ کے ساتھ غور اور ڈائیلاگ کرنا چاہیے تاکہ ہم اپنے ماضی کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور دیکھ سکنے کا رویہ اپنا سکیں اور یوں مستقبل کی طرف کھلنے والے راستوں پر نعروں' بڑھکوں اور غلط فکری کے بجائے ایسے حقائق کے سائے میں سفر کر سکیں جو ہمیں امن' ترقی' سلامتی اور فرزانگی کی اس منزل تک لے جائیں گے جو ہم سب کا مشترکہ خواب ہیں.......

ویل ڈن اعتزاز احسن....... شکریہ دانی صاحب

◆◆◆

ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کرسکو!

آج وطن عزیز کے قیام کی سینتالیسویں سالگرہ ہے' آدمی کی عمر 47 برس ہو جائے تو اسے ادھیڑ عمر' تجربہ کار' زمانہ دیدہ اور قابل اعتبار تصور کیا جاتا ہے۔ ملکوں اور قوموں کے ضمن میں البتہ تقویم کا یہ حساب ذرا مختلف انداز میں چلتا ہے۔ کام کرنے والی' زندہ' باعمل اور مستعد قومیں اس سے بھی کہیں کم عرصے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں جبکہ بیمار' بے عمل' منتشر اور دن میں خواب دیکھنے والے معاشرے اولڈ پیپلز ہوم میں پڑے ہوئے بوڑھوں کی طرح دن رات اپنی عمر رفتہ کا ماتم اور مرگ ناگہاں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

تاریخ عالم کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب کوئی معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے اور اس کے افراد کے سامنے کوئی اجتماعی نصب العین نہیں رہتا تو تاریخ اسے دامن پر گرے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح جھاڑ کر روز و شب کی تیز ہوا کا رزق بنا دیتی ہے اقبال نے کہا ہے۔

فطرت افراط سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

پاکستان ہم نے کیوں بنایا تھا؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر ہم اس پستی اور انتشار کے عمل کو سمجھ ہی نہیں سکتے جس میں ہم مسلسل مبتلا چلے آرہے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی' تصور کی سطح پر اضافی حیثیت رکھتے ہیں کہ دونوں کا حساب اس نصب العین کے حوالے سے ہوتا ہے جہاں تک پہنچنا یا جس کی طرف بڑھتے رہنا مقصد حیات قرار دیا گیا ہو۔ یوں دیکھا جائے تو ہمارا 47 سالہ قومی ریکارڈ کسی بھی طرح قابل تعریف یا اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسا کیوں ہوا اور اس طرح کیوں نہیں ہوا جیسا ہم نے چاہا تھا! یہ بحث کا وہ حصہ ہے جہاں ہم ہمیشہ کج بحثی سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے یا تو مسائل کو تسلیم نہیں کرتے یا پھر ان کی ساری ذمہ داری کچھ اور لوگوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی حوالے سے یہ ''اور لوگ'' ہمیشہ موجودہ حکومت سے پہلے کی حکومت یا حکومتیں ہوتی ہیں۔ کسی زمانے میں ایک لطیفہ بہت مشہور ہوا تھا کہ مرحوم ضیاء الحق کے ابتائی دنوں میں سعودی عرب کے حکمران پاکستان سے بہت ناراض تھے اور امداد کی طرف سے بھی انہوں نے ہاتھ کھینچ رکھا تھا۔ بھٹو صاحب پر کیس بھی چل رہا تھا' جس کی وجہ سے بھی ماحول میں خاصا کھچاؤ تھا' ایسے میں سابق صدر اور اس وقت کے ماہر معاشیات غلام اسحاق خان کو ایک پاکستانی وفد کا

قائد بنا کر حالات کی بہتری اور امداد کی فراہمی کی خاطر سعودی عرب بھجوایا گیا۔ کاروباری گفتگو' معاہدوں اور دستاویزات کی ادلا بدلی کے بعد رخصت ہوتے وقت شاہ فہد نے غلام اسحاق خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

''ایک بات آف دی ریکارڈ آپ سے پوچھنی ہے' آپ نے کہا ہے گزشتہ حکومتوں کی غلط منصوبہ بندی اور نا اہلی کی وجہ سے سعودی امداد کو پاکستان میں ٹھیک طرح سے استعمال نہیں کیا گیا اور یہ کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا' مین آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ گزشتہ نا اہل حکومتیں کون سی ہیں کیونکہ پندرہ برس میں جس حکومت کا جو بھی وفد یہاں آیا ہے آپ ہمیشہ اس میں شامل رہے ہیں۔''

ہمارے ذرائع ابلاغ کا بنیادی المیہ بھی یہی ہے کہ حاضر حکومت ہمیشہ اچھی اور گزشتہ ہمیشہ بری ہوتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں' اپنے عمل کا حساب

ہم بھی حساب کرتے تو ہیں لیکن ہمیشہ دوسروں کا....... اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کی بیلنس شیٹ آدھے کوائف کے ساتھ تو مکمل نہیں ہوسکتی' ہمارے خیال میں 14 اگست جہاں یوم آزادی کے حوالے سے خوشیوں کا پیغامبر ہے وہاں اہل فکر کے لیے ایک یوم احتساب بھی ہے کہ سفر کے ہر مرحلے کا احساب اگر ساتھ ساتھ نہ کیا جائے تو چیزیں آپس میں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں اور پھر وہی ہوتا ہے جو ہم اتنے برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس صورتحال پر ہم نے کئی برس قبل ایک نظم لکھی تھی جو کچھ یوں ہے۔

مولا۔ اس بستی کی آنکھیں کب تک سپنے دیکھیں!

ایسا بھی اک سورج جس میں چہرے اپنے دیکھیں

رت آئے رب جائے مولا خالی اپنے ہاتھ

ہر موسم میں پچھلی رت کے زخم چلے ہیں ساتھ

ان زخموں کی خوشبو میں ہیں جینے کے ارمان

کئی کروڑ انسان

اسی بستی کی خاک ہمارے ہونے کی پہچان

جینے کا سامان

تیرے عرشوں سے اب ہم پر بن برسے یا کال
مولا ہم بے نام پرندے کیسے چھوڑیں ڈال!

گزشتہ دنوں اپنے حکیم محمد سعید صاحب نے ایک محفل میں بڑی دلسوزی سے کہا کہ حالات اب ایسے ہو گئے ہیں کہ کبھی کبھی اس ڈال کو چھوڑنے کو جی چاہتا ہے جس کے ایک ایک پھول اور پتے کے لیے ہم نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے اور جس کی مہک چشم تصور میں سجا کر ہم 47 برس پہلے ایک ایسے سفر پر نکلے تھے جس کے رستے میں کہکشائیں ہمارے قدم چومنے کو بے تاب نظر آتی تھیں۔ کاش ایسا ہو کہ آج کے دن سے ہم اپنا کوڑا کرکٹ ایک دوسرے کے صحنوں میں پھینکنے کے بجائے مل جل کر اسے صاف کرنے اور اپنے ماحول کو پاک اور خوشگوار بنانے کا عہد کرلیں اور پھر اس پر قائم بھی رہیں کہ زبانی کلامی عہد تو ہم اٹھتے بیٹھتے کیا ہی کرتے ہیں غالب نے کہا تھا۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

لیکن آج ہمیں غالب کا یہ شعر نسبتاً کم پریشان کر رہا ہے اور اصل پریشانی ایک اور شعر نے پیدا کر رکھی ہے جی تو نہیں چاہتا کہ اس خوشی کے موقع پر آپ کو وہ شعر سنایا جائے لیکن اندر سے کوئی ہمیں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تلخ حقائق سے آنکھیں چرانے اور دنیاداری کے گریزاں سایوں میں زندگی گزارنے کا یہی وہ غلط رویہ ہے جس کی بدولت آج ہم اس آشوب میں مبتلا ہیں۔ سو معزز اور عزیز قارئین ہماری طرف سے اس یوم آزادی پر صوفی تبسم کا یہ شعر قبول فرمائیے کہ

ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لادوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو!

◆◆◆

کس رات کی آنکھوں میں.......

پنجابی کی ایک ضرب المثل کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ہاتھوں سے دی ہوئی گرہیں (آگے چل کر) دانتوں سے کھولنا پڑتی ہیں۔ اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات پر ایک نظر ڈالیں تو ہر الجھی ہوئی گتھی کے پس منظر میں نہیں صورتحال کارفرما نظر آتی ہے۔ رائی کا پہاڑ بننا اب ایک محاورہ نہیں روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ قائد نے ہمیں تنظیم' اتحاد اور یقین محکم' تین باتوں پر عمل کرنے کی تاکید کی تھی ہم نے تینوں سے پہلے اغماض برتا' پھر ان کے بے حرمتی کی اور اس کے بعد انہیں سربازار رسوا کیا اور اب یہ حالت ہے کہ ان کی شکلیں پہچاننا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

مدرسہ اور استاد ہماری اجتماعی زندگی کے دو ایسے پہلے تھے جہاں ظالم سے ظالم اور جاہل سے جاہل اہل زر اور فیوڈل لارڈز بھی کسی قسم کی زیادتی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ الٹا جاگیرداری معاشرے میں استاد کو خصوصی عزت اور رعایت کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ پرانی کہانیوں میں بھی ہارون الرشید کے بیٹوں مامون اور امین کے حوالے سے استاد کی جوتیاں سیدھی کرنے کے واقعے کو ہمیشہ بطور مثال کے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن حال ہی میں فیصل آباد میں طلبہ کے ہاتھوں پروفیسر افتخار علی ملک کے قتل اور لاہور میں گورنمنٹ کالج کے ایک سینئر استاد پروفیسر شاہد حسن کو بے تحاشا زدوکوب کرنے کی اطلاعات نے پورے معاشرے کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ اس پر پنجاب بھر کے کالج اساتذہ نے احتجاجی مظاہروں کا ایک بھرپور سلسلہ شروع کیا تاکہ معاشرے کے مختلف طبقوں کو بالعموم اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بالخصوص اس صورتحال کی سنگینی سے آگاہ کیا جا سکے اور مستقبل میں اس نوع کے انتہائی افسوسناک واقعات کی روک تھام کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جا سکیں۔ اساتذہ کی مختلف تنظیموں نے ''پروفیسر افتخار علی ملک کے بہیمانہ قتل کے محرکات اور واقعات'' کے زیر عنوان ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''یکم فروری ۹۵ء کو گورنمنٹ کالج سمن آباد فیصل آباد میں شعبہ کیمسٹری کے پروفیسر افتخار علی ملک کا قتل تعلیمی اداروں میں سیاسی مداخلت کا براہ راست نتیجہ ہے۔ پروفیسر موصوف کالج ہاسٹل کے عرصہ دراز سے سپرنٹنڈنٹ چلے آ رہے تھے اور کالج ہاسٹل سے منسلک اقامت گاہ میں رہائش پذیر تھے اور اس کا انتظام و انصرام بحسن وخوبی انجام دیتے آ رہے تھے۔ کچھ عرصہ قبل طلبہ کے ایک گروہ نے ایک طالب علم کو ہوسٹل میں کمرہ الاٹ کرانے کی درخواست دی جسے بعض وجوہات کی بنا پر رد کر دیا گیا۔ ایف آئی آر میں درج تین

ملزمان نے صوبائی وزیر تعلیم کو درخواست دی اور پروفیسر موصوف کے فوری تبادلے کی منظوری درخواست پر ہی لے لی۔ کالج میں اس ضمن میں انکوائری عمل میں لائی گئی۔ دریں اثناء ہاسٹل میں مقیم بورڈرز نے اصل حقائق پیش کرتے ہوئے پروفیسر موصوف کے تبادلے کے احکامات منسوخ کرالیے جس کا ملزمان کو بڑا قلق تھا اور انہوں نے پروفیسر موصوف کو اپنے راستے سے ہٹانے کی منصوبہ بندی کی۔"

اس کے بعد اس واردات کی تفصیل درج کی گئی ہے جس کے نتیجے میں پروفیسر افتخار علی ملک کو دن دہاڑے پندرہ سولہ لڑکوں کے ایک گروپ نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ فائرنگ کی زد میں آ کر کالج کے ایک ملازم الیاس مسیح کی نوعمر بچی شبانہ لیاس بھی ماری گئی جبکہ قاتل پروفیسر صاحب کی لاش پر بھنگڑا ڈالتے رہے۔ اتفاق سے ایک پولیس پارٹی کا ادھر سے گزر ہوا اور پولیس مقابلے کے دوران ایک ملزم ہلاک ایک زخمی اور سات گرفتار ہوئے جبکہ باقی مبینہ قاتل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس المناک واقعے کا مزید افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بااثر ملزمان اپنے سیاسی اثر ورسوخ کے باعث اس سارے واقعے کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں اور اس واضح اور بہیمانہ قتل کو طلبہ کے دو گروہوں کی باہمی چپقلش کے دوران پیش آنے والا ایک حادثہ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بیان میں آگے چل کے کہا گیا ہے کہ:

"اس بہیمانہ قتل نے واضح کر دیا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے دہشت گردوں کے رحم وکرم پر ہیں اور سیاسی طالع آزما اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے بعض نام نہاد طالب علم دہشت گردوں کو استعمال کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ملزمان مبینہ طور پر ایک طلبہ تنظیم سے متعلق ہیں جسے ایک سیاسی جماعت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تعلیمی اداروں میں سیاسی طالع آزماؤں کی مداخلت کا مستقل سدباب کرنے کے ٹھوس اقدامات عمل میں لائے جائیں۔"

ہمارا سوال یہ ہے کہ ایسا وقت آنے ہی کیوں دیا گیا! تعلیمی اداروں میں مختلف سیاسی جماعتوں کے عمل دخل اور دلچسپی کا حال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ یہ صورتحال گزشتہ چند برسوں میں مسلسل بگڑتے بگڑتے اب ایک ایسے موڑ پر آ چکی ہے جہاں سے واپسی کا راستہ نظر آنا بند ہو گیا ہے۔ جو بھی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے وہ اپنی ذیلی طلبہ تنظیم کو کھل کھیلنے کی چھٹی دے دیتی ہے اور یوں مخالف طلبہ تنظیموں کا جینا مشکل کر دیا جاتا ہے۔ پولیس اور انتظامیہ نے بھی اب اس صورتحال سے کم وبیش باقاعدہ سمجھوتہ کر لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت بدلنے کے ساتھ مختلف کالجوں اور ہوسٹلوں پر "نئے حکمرانوں" کو قبضہ دلانے کے لیے مبینہ طور پر پولیس اور اور انتظامیہ کے اہلکار ساتھ جاتے ہیں۔ موجودہ وزیر تعلیم ریاض فتیانہ ماضی قریب میں خود ایک طالب علم رہنما رہ چکے ہیں اور اس کھیل کے منظر اور پس

منظر سے پوری طرح واقف ہیں۔ گزشتہ چند ملاقاتوں کے دوران ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ تعلیمی داروں کو سیاسی غنڈہ گردی سے پاک کرنے کے لیے نہ صرف مختلف اقدامات کر رہے ہیں بلکہ اس مسئلے کو ایک بلند تر سطح سے دیکھتے ہوئے اسے یکساں انصاف اور احتساب کے اصولوں پر حل کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں (جس کے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل ممکن ہی نہیں) سوان سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ غنڈہ گردی کے ان واقعات کا سختی سے نوٹس لیں گے اور پوری غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے مجرموں کو ایسی عبرتناک سزائیں دلوائیں گے کہ آئندہ اس نوع کی حرکت کرنے سے پہلے متعلقہ لوگوں کو دس بار سوچنا پڑے۔ تعلیم جیسے مقدس پیشے اور استاد شاگرد کے محبت و عقیدت سے پر اس خوبصورت رشتے کے ناموس کی حفاظت معاشرے کا ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ پلوں کے نیچے سے اگرچہ بہت سا پانی بہ چکا ہے لیکن اب بھی اس خاکستر میں بہت سی ایسی چنگاریاں باقی ہیں جو ان اندھیروں سے لڑ سکتی ہیں جنہیں ہم کئی برسوں سے مسلسل سینچتے اور پالتے چلے آرہے ہیں۔

کس رات کی آنکھوں میں پیان سحر ہوگا!
یہ خواب جو کونپل ہے کس رت میں شجر ہوگا؟

اگر ہم پوری نیک نیتی اور ایمانداری سے قدم اٹھاسکیں تو ممکن ہے وہ رت ہمیں اپنے دروازے پر ہی کھڑی مل جائے۔

◆◆◆

مدعا عنقا ہے

مدعا' دعویٰ' ادعا' مدعیٰ' مدعا علیہ .... یہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اردو میں ان کا زیادہ تر استعمال قانونی اصطلاحات کے حوالے سے ہوتا ہے جیسے بقول غالب:

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

لیکن جب غالب ہی یہ کہتا ہے کہ

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے!

تو معاملہ قانون کی عدالت سے نکل کر ایک ایسی عدالت میں پہنچ جاتا ہے جہاں دشنام پر خلعت اور سلام پر ذلت کا مل جانا قطعا باعث حیرت نہیں ہوتا۔ یہی مدعا پنجابی میں آ کر "مدا" بن جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے مطالب کی فہرست بھی پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "پولیس نے اس پر مدا ڈال دیا ہے۔" یا "مجھ پر مدا پڑ گیا ہے۔" یا "مدا غائب ہو گیا ہے۔" تو یہ لفظ صرف "مدعا" کی بگڑی ہوئی شکل ہی نہیں رہتا بلکہ ایک ایسے خود مختار لفظ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ جس کی جڑیں ہمارے معاشرے میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں یہ "مدعا مقصد' مطلب' سوال' خواہش' مانگ اور جستجو کی محض تجرید اور تصور تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ایک مجسم کردار کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ پنجابی کا مدعا یعنی مدا "مطلوبہ شخص" "مسروقہ سامان" "الزام" "جوابدہی" اور "اصل حقیقت" کے معنوں میں کچھ اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ اس کے معنی حیرت انگیز طور پر اپنے اور جن (ماخذ) سے مختلف ہو جاتے ہیں۔

لغات اور لسانیات کبھی بھی ہمارا محبوب موضوع نہیں رہے لیکن ہمارے احباب میں کم از کم دو دوست ضرور ایسے ہیں جنہیں یہ شوق مرض کی طرح لاحق ہے اور جو ہر لفظ کے شجرۂ نسب میں اس طرح گھس جاتے ہیں جیسے اگلے وقتوں کی بڑی بوڑھیاں رشتے طے کراتے وقت ہونے والے دولہا دلہن کی سات پیڑیاں تک چھان ڈالتی تھیں۔ اسلام آباد والے انور مسعود اور بی بی سی لندن والے

عارف وقار ہمیشہ کسی نہ کسی لفظ کے ماضی، حال یا مستقبل پر پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ابھی پچھلے دنوں عارف وقار کا لندن سے خط آیا جس میں اس نے یہ پوچھا کہ جن لوگوں کے چہروں پر داڑھی نہیں اگتی یا بہت کم بال پیدا ہوتے ہیں انہیں ''کھودا'' کیوں کہا جاتا ہے، اس کا ماخذ کیا ہے؟ آج انور مسعود سے بات ہوئی تو موصوف اس سوچ میں گم تھے کہ چھتری کے لیے استعمال ہونے والے انگریزی لفظ UMBRELLA اور ہندی کے امبر (آسمان) میں ربط خفی ہے اور یہ کہ انگریزی کے مدرمی مما فارسی کے مادر اردو کے ماں، اماں اور امی، عربی کے ام اور ہندی کے ماتا میں ''م'' کی مشترک آواز کیسے اور کس طرح اس لفظ کی بنیاد بنی!!

لفظوں کے اس جوڑ توڑ کے حوالے سے ہمیں ابو الکلام آزاد کی ''غبار خاطر'' کے جواب میں ''خاطر غبار'' لکھنے والے الف الحراث بری طرح یاد آرہے ہیں۔مرحوم ایک عجیب وغریب انغان تھے۔قاسمی صاحب کے ''فنون'' کے دفتر میں اکثر تشریف لایا کرتے تھے لباس اور حلیہ ایسا تھا کہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ بھی دیکھے۔گفتگو میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔مگر جب بولتے تھے تو پھر کسی دوسرے کی نہیں سنتے تھے۔الفاظ اور ان کے استعمال کے ضمن ان کا رویہ ذہانت اور حماقت کا ایک انوکھا آمیزہ تھا۔مثال کے طور پر ایک بار ان کے سامنے ہم نے کہیں یہ کہہ دیا کہ ''بلی سارا دودھ پی گئی'' موصوف تڑپ کر اچھلے اور اچھل کر تڑپے۔پھر بڑی دلسوزی سے بولے ''آپ اتنے اچھے شاعر اور ادیب ہیں، اردو کے استاد بھی ہیں، بلی دودھ پی گئی کیا جملہ ہوا؟ ارے بھائی بلی دودھ پیتی نہیں، لبڑتی ہے آپ کو کہنا چاہیے تھا کہ ''بلی سارا دودھ لبڑ گئی۔''

اس کے بعد انہوں نے اس لبڑنے اور پینے کے فرق پر ایک ایسا لیکچر دیا کہ دودھ اور بلی دونوں ہمیں زہر لگنے لگے۔اب جو ہم نے مدعا اور مدا کے محل استعمال پر بات شروع کی ہے تو مرحوم بے ساختہ یاد آرہے ہیں۔یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس میں سے ایسا کوئی تحقیقی نکتہ ضرور نکال لاتے۔

حفیظ تائب کا ایک مصرعہ ہے۔

''مدعا پایا ہے عرض مدعا کرتے ہوئے''

سو ہم نے بھی اس کالم کا مدعا عزیز دوست شمیم اختر سیفی سے حالات حاضرہ پر ایک فری فار آل قسم کی گفتگو سے پایا ہے۔پتہ نہیں کہاں سے چلتی ہوئی بات چند ماہ پیشتر کوریا کی بنی ہوئی کار ''کیا پرائڈ'' کی پبلسٹی، بکنگ اور پھر سپلائی میں تعطل کی طرف جا نکلی۔معلوم ہوا کہ متعلقہ مشتہرین نے کروڑوں کے حساب سے ایڈوانس رقم جمع کر کے بنکوں میں ڈال دی ہے اور اب اگر رقم نہیں تو مزے سے اس کا سود کھا رہے ہیں اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔کیا پرائڈ کی غیر معمولی بکنگ کی وجہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ سفید پوش طبقے

کی سفید پوشی کا بھرم رکھنے والی نام نہاد سستی کار سوزوکی پچاس ہزار سے ڈھائی لاکھ کی ہو چکی ہے اور اس کے معیار کا یہ عالم ہے کہ سائیکل سے ٹکرائے تو عام طور پر زیادہ نقصان اس کا اپنا ہوتا ہے۔

فنانس کمپنیوں اور کوآپریٹو اداروں کی طرف پلاٹوں' فلیٹوں اور مختلف طرح کی سواریں کے مشتہرین بھی آئے دن لوگوں کے پیسے اور اعتماد کے ساتھ طرح طرح کے افسوسناک کھیل کھیلتے رہتے ہیں مگر نہ حکومت کو اس کی فکر ہے اور نہ اپوزیشن کو' دونوں کا حال کچھ ایسا ہے کہ:

یہ ملنے کی گھڑی بھی کیا گھڑی ہے
اسے اپنی مجھے اپنی پڑی ہے

یوں لگتا ہے جیسے عوام کے جان و مال کی پرواہ ہماری سیاسی ترجیحات میں شمار سے ہی باہر ہو چکی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر پی آئی اے کے عملے اور ان مسافروں کی کیا خبر ہے جنہیں اغوا ہوئے اب شاید تین مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو چلا ہے۔ ان کے تو اغوا کنندگان بھی نہ صرف ملک کے اندر موجود ہیں بلکہ پورے دھڑلے سے ببانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ کیچ می اف یو کین (Catch me if you can) انہوں نے مدا غائب کر دیا ہے اور حکومت اور انتظامیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ یہ مدا کس پر ڈالے!!

سو کبھی کبھار اخبارات میں جب انتظامیہ کی طرف سے اس نوع کا کوئی بیان چھپتا ہے کہ اغوا کنندگان کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اور عنقریب مغویوں کو آزاد کرا لیا جائے گا تو بے اختیار ذہن میں پیر و مرشد مرزا غالب کا یہ مصرعہ گونج اٹھتا ہے۔

معا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

◆◆◆

بکرے کی ماں

کچھ محاورے اور ضرب الامثال ایسی ہیں جنہیں بہت تسلسل' تواتر اور بے تکلفی سے استعمال کیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ کے کسی حصے میں معاشرے نے کسی ایسی صورتحال پر اتنا جامع اور مکمل تبصرہ کیسے وضع کر لیا جسے صدیوں بعد کسی اور زمانے میں ظہور پذیر ہونا تھا۔ مثال کے طور پر ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' پر ہی غور کیجئے!

یہ تو طے ہے کہ بکرے کی قسمت میں ذبح ہونا لکھا ہے کہ اسے شاید پیدا ہی اسی مقصد کے لیے کیا گیا ہے۔ یوں غور کیا جائے تو اس کرہ ارض کے سٹیج پر حیوانات' جمادات اور نباتات کی صورت میں جو کچھ بھی تخلیق کیا گیا ہے اسے کسی نہ کسی حوالے سے فنا ہونا ہے۔ وہ ہاتھ بھی جو اپنی بقا اور خوراک کے لیے بکرے کے حلقوم پر چھری چلاتے ہیں ایک دن ''سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے'' کی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں۔ غالب نے کیا خوب کہا تھا۔

مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی

اس قضائے مبرم کے احساس اور شعور کو بنیاد بنا کر صوفیا' وحدت الوجود اور اہل دنیا ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کی آڑ لیتے ہیں اور موت کی اٹل حقیقت سے اپنے اپنے انداز میں عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

میر کہتے ہیں۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اقبال اسے فلسفہ شہادت کی آنچ دے کر یوں دکھاتے ہیں کہ

کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

لیکن غور کیا جائے تو ان تمام تر حوصلہ افزائیوں کے باوجود انسان کو زیادہ کشش اپنی بے ثباتی' بے بسی اور فنا پذیری کے ذکر ہی میں نظر آتی ہے اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی' چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یعنی زندگی کے جتنے واقعات اور حادثات ہیں ان پر تو ہمارا کنٹرول نہیں البتہ یہ احساس ہمہ وقت دامن گیر رہتا ہے کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی!!!

بکرے کے ذکر سے ہمیں یاد آیا کہ ہر عیدالاضحیٰ کی طرح اس بار بھی برادران اسلام بڑھ چڑھ کر قربانیاں کریں گے کہ یہ سنت ابراہیمی بھی ہے اور فرض بھی' لیکن اس عظیم اور بے حد معنی خیز فرض کی ادائیگی کے دوران ہم بہ حیثیت مجموعی جو کچھ کرتے ہیں' اس پر ایک تفکر بھری نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ مسئلہ قربانی کی کھالوں کا ہو' ڈیپ فریزروں میں گوشت کو ذخیرہ کرنے کا یا گلیوں اور سڑکوں کے کناروں پر اوجھڑیوں کے ڈھیر لگانے کا' ہر حوالے سے ہم بدنظمی اور خودغرضی کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیا اس قربانی کا حکم ہمیں اس لیے دیا گیا ہے کہ کالوں کو جنس تجارت' گوشت کو ذاتی استعمال کے لیے ذخیرہ اور معاشرتی تعلقات کے لیے وسیلہ بنالیں اور اوجھڑیوں کی غلاظت کو ہمسائے کے دروازے پر ڈال کر اپنا صحن پاک صاف کرلیں؟

بکرا اور اس کی ماں تو قانون قدرت کے ہاتھوں ایک دوسرے کی خیر نہیں منا سکتے لیکن ہم آپ تو بکروں کی طرح مجبور نہیں ہیں۔ ممکن ہے ہماری اس بات سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو اور وہ پوچھ بیٹھیں کہ ہم میں اور بکرں میں جبوری کے حوالے سے کیا فرق ہے؟ بعض قنوطی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بکرے کی زندگی اور موت دونوں ہمارے جیسے معاشروں میں بسنے والے انسانوں سے بہتر ہیں کہ اسے اپنی زندگی کے دوران ملاوٹ سے پاک غذا ملتی ہے' بچوں کے سکول کی بھاری فیسیں نہیں دینا پڑتیں' بجلی گیس وغیرہ کے ہوشربا بلوں کو ادا کرنے کے لیے گھنٹوں قطاروں میں نہیں کھڑا ہونا پڑتا' لوڈشیڈنگ' بیروزگاری' ٹریفک' رشوت' سفارش اور سب سے بڑھ کے سیاست اور سیاستدانوں کے کھیل میں فٹ بال کی طرح پے در پے ککیں نہیں کھانا پڑتیں اپنے حق کے لیے گڑگڑانا نہیں پڑتا' نوکری اور روزگار کے لیے دردر بھٹکنا نہیں پڑتا....... غرضیکہ ذبح ہونے سے پہلے راوی بکرے کی زندگی میں انسانی زندگی کے مقابلے میں چین ہی چین لکھتا ہے رہا سوال ذبح ہونے کا تو بقول شخصے قسطوں میں مرنے سے یکمشت مرجانا کوئی برا سودا نہیں ہے۔ خیر چھوڑیے یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہمارے چاروں طرف ایک نہ مٹنے والے غبار کی صورت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آیئے چند لمحوں کے لیے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کریں اور اس تصویر کا ایک رخ دیکھنے کی کوشش کریں۔ خوش خوراکی' بعض علاقوں کے ساتھ کیوں منسوب ہو جاتی ہے؟ حالانکہ رزق تو شب و روز دنیا کے کونے کونے میں کھایا جاتا ہے۔ یہ ایک سربستہ راز ہے لیکن یہ طے ہے کہ کچھ علاقوں یا

شہروں کے لوگ خوش خوراکی کے حوالے سے نہ صف مشہور ہوتے ہیں بلکہ کھاناان کی معاشرت اور اسلوب زندگی کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ وطن عزیز میں بہت سے شہروں کی مثال دی جاسکتی ہے لیکن گوجرانوالہ اور لاہور بہرحال پہلی صف میں رہیں گے کہ زندہ دلان لاہور ہوں (جنہیں بھٹو مرحوم اپنے مخصوص انداز میں ''لاہور کے زندہ دلانے'' کہا کرتے تھے) یا گوجرانوالہ کے پہلوان' خوراک سے ان کی رغبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ دیکھا جائے تو ان کی اس پرخوری سے بھی' سب سے زیادہ خطرہ بکروں کو ہی ہے کہ بقول ہمارے ایک دوست کے دسترخوان پر بکرے کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔

اس حوالے سے ایک واقعہ سن لیجیے اور یقین جانیئے کہ اس میں ہم نے رتی برابر کمی بیشی نہیں بلکہ عدالتی زبان میں سچ اور صرف سچ کہا ہے اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔

ساگ اور بریانی اہل لاہور کی محبوب ترین ڈشیں ہیں اور کھانوں میں اتنی ورائٹی آجانے کے باوجود اندرون شہر کی کوئی ضیافت ان دو ڈشوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ایسی ہی ایک ضیافت میں ایک صاحب پورے خضوع وخشوع کے ساتھ کم وبیش ایک گھنٹے سے کھائے چلے جارہے تھے یکدم انہیں چکر سا آیا اور ان کی نکسیر فوارے کی طرح پھوٹ پڑی۔ ان کے سر اور منہ پر پانی ڈالا گیا اور نکسیر روکنے کے لیے ہر ممکنہ تدبیر اختیار کی گئی مگر خون تھا کہ رکنے میں نہ آتا تھا یہاں تک کہ ان پر غشی طاری ہوگئی اور احباب انہیں ہسپتال لے جانے کے لیے سواری کا بندوبست کرنے لگے۔ جب انہیں گاڑی میں ڈالا جارہا تھا اور چاروں طرف پریشانی پھیلی ہوئی تھی انہوں نے آنکھیں کھولیں' چاروں طرف دیکھ اور اشارے سے کہا کہ انہیں یہیں رہنے دیا جائے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ ان کا ہسپتال جانا بہت ضروری ہے کیونکہ ان کی حالت اچھی نہیں۔ اس پر وہ کچھ یوں بڑبڑائے:

''بس کرو....... مجھے کہیں مت لے جاؤ' مجھے پتہ ہے اب میں نہیں بچوں گا میرے اندر کی کہانی ختم ہوگئی ہے....... تم لوگ ایسے کرو....... کہ ایک پلیٹ میں مجھے تھوڑا سا بریانی ساگ ڈال دو....... اور ذرا جلدی کرو میرے پاس وقت کم ہے۔''

◆◆◆

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن خان مومن' غالب کے غالباً سب سے ذہین' ہنرمند اور صاحب اسلوب ہم عصر شاعر تھے کہ بقول چند تذکرہ نگاروں کے مرزا صاحب نے ان کے اس شعر کے بدلے اپنا دیوان تک دینے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس وقت تک ان کی نظر سے مومن کا یہ شعر نہیں گزرا تھا۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دوسرے مصرعے میں ہمارے سمیت تقریباً سب ہی احباب ''چمک'' کی جگہ ''لپک'' پڑھتے ہیں کہ شعلے کے ساتھ پتہ نہیں کیوں ''لپک'' کا تصور آپ سے آپ ذہن میں آجاتا ہے' یہ اور بات ہے کہ مومن کے دیوان کے تقریباً تمام مصدقہ نسخوں میں لفظ ''چمک'' ہی درج ہے۔ کچھ عرصہ قبل یہ لفظ ہماری سیاسی صطلاحات کے ذخیرہ الفاظ میں داخل ہوا تھا اور جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اس کا استعمال موجودہ وزیر اعظم نے سابقہ وزیر اعظم کی دولت کے حوالے سے کیا تھا جس کی چمک سے وہ اپنے کام نکالتے رہے ہیں تھے۔

وزیر اعظموں کے اس ذکر سے ہمیں گزشتہ دنوں ٹی وی سے نشر ہونے والی تقریریں یاد آگئیں جو اگرچہ اصل تقریروں کے اقتباسات پر مبنی تھیں لیکن ان جھلکیوں میں بھی محترم خاتون اور حضرت نے اپنی اپنی خوش بیانی اور گل فشانی کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ میاں نواز شریف کی تقریر کے دوران ہمارے کان میں کچھ تکلیف تھی۔ اس لیے ہم ان کی بعض باتیں ٹھیک طرح سے سن نہیں سکے' بعد میں پتہ چلا کہ آشوب چشم کی طرح اس تقریر کے دوران بھی بہت سے لوگوں پر کان سے متعلق کسی پراسرار وائرس کا حملہ ہوا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ زیادہ نہیں پھیلا اور حکومت کے بروقت اقدام اور کوشش سے اس پر بہت جلد قابو پالیا گیا اور محترمہ وزیر اعظم کی تقریر کے آغاز سے چند لمحے پہلے صورت حال مکمل طور پر قابو میں آچکی تھی۔

محترمہ وزیر اعظم کے انداز تکلم' ان کی ذہانت' خوش مزاجی اور بے مثال اعتماد کے تو ہم پہلے سے قائل اور گھائل ہیں لیکن مذکورہ

تقریر کے دوران ان کی آواز کا جادو بھی ہمارے سر چڑھ کر بولا کہ ان کا ایک ایک لفظ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی مثال ہماری طرح کے لاکھوں کروڑوں سامعین کی روحوں کو گرماتا اوران کے اندر اترتا چلا گیا جو میاں نواز شریف کے عائد کردہ "بے سروپا الزمات" اور "جعلی ثبوتوں" کے ڈھیر سے کچھ دیر کے لے پریشان ہو گئے تھے۔ دختر مشرق اور پاکستان کی تقدیر۔ بے نظر۔ بے نظیر نے جس خوش اسلوبی سے میاں صاحب کے ایک ایک اعتراض کا منہ توڑ جواب دیا اس کی داد ان کی پارٹی کے لوگ انتہائی زوروشور سے دے رہے ہیں۔ جن دو چار باتوں کا جواب وہ جوش جذبات اور گفتگو کی بے جا طوالت کے خوف سے نہ دے سکیں ان پر اپوزیشن کا واویلا کم از کم ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آپ بیٹھے بٹھائے محترمہ وزیر اعظم اور ان کے شوہر یا قریبی احباب کے نام کئی ارب کی کرپشن بغیر کسی مستند ثبوت کے نکال لیں اور پھر ان سے تقاضا کریں کہ وہ متعلقہ رقم ہی غیر جانبدار اور اعلیٰ اختیارات کے حامل ججوں کے پینل کے پاس جمع کروادیں تا کہ اگر ان کے عائد کردہ الزمات صحیح نکلیں تو یہ رقم بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ پنی بات میں ڈرامہ ڈالنے کے لیے انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی آفر کر دی کہ وہ بھی اپنے اداروں کی طرف واجب الادا قرضوں کی مجموعی رقم کے برابر اثاثے بطور ضمانت جمع کروادیں گے۔ اب کوئی میاں نواز شریف سے پوچھے کہ آپ تو مطلوبہ رقم جمع کرواسکتے ہیں کہ آپ کے پاس یہ موجود ہے مگر جب وزیر اعظم صاحبہ کے پاس ان کی اور زرداری صاحب کی خاندانی دولت کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں تو وہ اتنی بڑی رقم کہاں سے مہیا کریں؟

اسی طرح میاں صاحب کا یہ کہنا کہ انہوں نے اپنے صوبائی اور مرکزی اقتدار کے دنوں میں سیکرٹ فنڈ سے ایک دھیلا بھی خرچ نہیں کیا جبکہ محترمہ کئی کروڑ روپے استعمال کر چکی ہیں۔ بھی ایک انتہائی غیر منطقی قسم کا الزام ہے یہ فنڈ تو خرچ ہی وزیر اعظم کی صوابدید سے ہوتا ہے اب اگر آپ کے زمانے میں کسی وجہ سے اسے ہاتھ نہیں لگایا گیا تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ کسی دوسرے وزیر اعظم کو بھی اس کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتے گی! اب رہی یہ بات کہ اس میں دو کروڑ روپے جناب نصیر اللہ بابر کو کیوں دیے گئے؟ تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں۔ نرل بابر صاحب آخر ہمارے وزیر داخلہ ہیں' ملک میں ہونے والی ہر طرح کی دہشت گردی کی روک تھام ان کا فرض منصبی ہے اور ظاہر ہے کہ 12 کروڑ عوام کی سلامتی کے لیے 2 کروڑ روپے کی رقم تو اونٹ کے منہ میں زیرے سے بھی کم ہے۔ ہمارے خیال میں تو جنرل صاحب کو اس سے کہیں زیادہ فنڈ مہیا کیے جانے چاہئیں تھے۔

اخبار میں ایک خبر یہ بھی تھی کہ وزیر اعظم صاحبہ نے ان افسران کے بارے میں انکوائری کی ہے جن کے کہنے پر قائد حزب اختلاف کی تقریر نشر کرنے کا وعدہ اور اعلان کیا گیا تھا۔ ہماری دعا ہے کہ ہماری روشن خیال اور انقلابی پروگرام کی حامل ایم ڈی پی ٹی

دی محترمہ رعنا شیخ کا نام اس فہرست میں نہ ہو کہ ایسے موقعوں پر بعض گردنیں محض اس لیے زد میں آجاتی ہیں کہ وہ ذرا زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ محترمہ بے نظیر نے اپنی تقریر دل پذیر سے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف ان کے اعصاب غیر معمولی طور پر مضبوط ہیں بلکہ ان کی آواز بھی کسی طوطی شکر مقال سے کم نہیں۔

اللہ کرے زور زباں اور زیادہ

ریڈیو کا ادبی کردار

ایک زمانہ تھا کہ ریڈیو پاکستان اور پاکستانی ادب گرہ در گرہ رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ یوں تو قیام پاکستان سے چند برس قبل ہی برصغیر کے کئی نامور ادیب ریڈیو سے بذریعہ ملازمت یا بطور سکرپٹ رائٹر اور شاعر منسلک ہو چکے تھے مگر وطن عزیز کی پہلی تین دہائیوں میں تو ریڈیو گویا ادب کا ایک گڑھ بن گیا تھا۔ آزادی کے آس پاس کے زمانے کے جو لوگ اس وقت ذہن میں آ رہے ہیں اور جن کا براہ راست تعلق ریڈیو سے رہا ہے ان میں پطرس بخاری' ن۔م۔ راشد' غلام عباس' احمد ندیم قاسمی' شوکت تھانوی' محشر بدایونی' تابش دہلوی' عزیز حامد مدنی' حمید نسیم' اشفاق احمد' سلیم احمد' ضیاء جالندھری' احمد فراز' ذوالفقار بخاری' مسعود قریشی' سلیم گیلانی' مرزا ادیب' اے حمید' ناصر کاظمی' عطا حسین کلیم' صوفی تبسم' سجاد حیدر' آغا ناصر اور مختار صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انکے علاوہ جو اہم لوگ مختلف ریڈیو پروگراموں سے وابستہ رہے ہیں ان کی فہرست بے حد طویل ہے۔ یوں سمجھیے کہ پاکستان کا شاید ہی کوئی قابل ذکر ادیب اور شاعر ایسا ہو جس کی ریڈیو سے وابستگی نہ رہی ہو۔ ان لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو' میرا جی' فیض احمد فیض' انتظار حسین' امتیاز علی تاج' جسٹس جاوید اقبال' بانو قدسیہ' منیر نیازی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' تصدق حسین خالد' محمد حسن عسکری' ممتاز شیریں' مولانا غلام رسول مہر' عبدالمجید سالک' اعجاز حسین بٹالوی' عابد علی عابد' پروفیسر وقار عظیم' ابن انشاء' مولانا چراغ حسین حسرت' ابراہیم جلیس' ڈاکٹر تاثیر' احسان دانش' حکیم احمد شجاع' رئیس امروہوی' مجید لاہوری' حمید نظامی' جمیل الدین عالی' حمایت علی شاعر' نسیم حجازی اور جوش ملیح آبادی جیسے جید ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ طوالت کے خوف سے گزشتہ بیس برس میں سامنے آنے والے ناموں سے صرف نظر کیا جا رہا ہے کہ یہ فہرست اور بھی زیادہ لمبی ہے۔

اب ظاہر ہے جس ادارے کو اس طرح کے لوگوں کا تعاون حاصل رہا ہو اس کی کارکردگی پر بھی اس کا اثر نظر آنا چاہیے لیکن حادثہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۴ء میں ٹی وی آ گیا اور لوگوں کو جب آواز کے ساتھ ساتھ متحرک تصویر بھی دیکھنے کا موقع ملا تو ان کی ترجیحات بدلنا شروع ہو گئیں اگرچہ ٹی وی نے کسی بھی دور میں شعر و ادب کو وہ اہمیت نہیں دی جو اسے ریڈیو پر ملتی رہی ہے لیکن کبھی کبھار کے مشاعروں' اکا دکا ادبی اور نیم ادبی پروگراموں' ادیبوں کے انٹرویوز اور مختلف پروگراموں میں ان کی شمولیت کے باعث' موقع کی کمی کے باوجود ٹی وی پر آنے والے لکھاریوں کی شہرت اور پہچان میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا اس نے ریڈیو کی کشش کو بہت حد تک کم کر دیا اس صورتحال کو

مزید بگاڑنے کی ذمہ داری بھی ریڈیو پر ہی آتی ہے کہ اس کے اس وقت کے کارپردازوں نے مقابلے پر فرار کو ترجیح دی اور شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن چھپا کر بیٹھ گئے اور اپنے طور پر یہ طے کر لیے اب ریڈیو ٹی وی کے چھوڑے یا اگلے ہوئے نوالوں پر ہی قناعت کرے گا۔ لیکن جس طرح ویڈیو' سینما کی ضرورت کو ختم نہیں کر سکا اسی طرح ٹی وی بھی ریڈیو کی اہمیت کو نہ مٹا سکا ہے اور نہ کبھی مٹا سکے گا۔ بات ہو رہی تھی ریڈیو کے ساتھ متعلق رہ چکے اور ''حاضر سروس'' ادیبوں کی۔ ڈرامہ اور شاعری کے علاوہ ریڈیو کی جن ''اصناف'' میں مستند لکھاری زیادہ تر حصہ لیتے ہیں وہ ایسے ادبی پروگراموں سے متعلق ہیں جو نام اور عنوان کی تبدیلیوں سے قطع نظر ہمیشہ سے ریڈیو کی نشریات کا مستقل حصہ رہی ہیں۔ ان میں ادبی مذاکرے' شخصی انٹرویوز' مضامین' افسانے' حمد' نعت اور سلام اور مختلف نوع کے قومی موضوعات پر مبنی ڈیکشن پروگرام موم شامل ہیں۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ریڈیو نے طلبہ سے متعلق اپنے مختلف پروگراموں میں ایسے بے شمار نوجوان اہل قلم کو متعارف کرایا ہے جو آگے چل کر معروف' نامور اور عہد ساز ادیب بنے۔ اس ضمن میں کراچی ریڈیو کا پروگرام ''بزم طلبہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں سے ابتدائی ادبی تربیت حاصل کرنے والوں میں مرحومہ پروین شاکر' پیرزادہ قاسم' ایوب خاور' ثروت حسین مرحوم' تاجدار عادل' شادہ حسن' فاطمہ حسن' جاوید جبار' اقبال حیدر' نصیر ترابی اور عبیداللہ علیم جیسے کئی اہم نام شامل ہیں۔ یہی صورت حال لاہور ریڈیو سٹیشن اور اس کے بعد پنڈی' ملتان' فیصل آباد' بہاولپور' پشاور اور کوئٹہ کے سٹیشنوں کے ساتھ بھی رہی کہ ان سب جگہوں سے وقتاً فوقتاً ایسے نوجوان لکھاری آگے آتے رہے ہیں جو اب ادبی دنیا میں اپنی باقاعدہ شناخت کروا اور خود کو منوا چکے ہیں۔

گزشتہ پچاس برس کے حوالے سے ریڈیو کی عمومی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اپنی تاریخ کے ہر دور میں ریڈیو نے ادب کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا ہے اور اس سفر میں پیش آنے والے مختلف مشکل اور بعض اوقات انتہائی خطرناک مراحل کے باوجود کہیں بھی اپنا رستہ کھوتا نہیں کیا۔ ذرائع ابلاغ کی وسعت اور پھیلاؤ اور مالی وسائل کی کمی کے باعث اگرچہ اب وہ لکھنے والوں کے غیر مشروط اور بھرپور تعاون سے بہت حد تک محروم ہو چکا ہے لیکن اب بھی اس لبے ہوئے بادل میں بہت سی بجلیاں پوشیدہ ہیں اور گزشتہ چند برسوں سے پوری دنیا کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی ریڈیو اپنی حیات نو کے جس خوشگوار تجربے سے گزر رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے پورے یقین سے یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ ریڈیو کی اس تجدید نو کا عمل بہت جلد اسے پر ایک مقبول ذریعہ ابلاغ کے مقام پر فائز کر دے گا اور یوں ریڈیو سے ادب اور ادیب کا وہ رشتہ بھی پورے طور پر بحال ہو جائے گا جو فی الوقت ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آنے والے دنوں میں ریڈیو کے ادبی پروگراموں میں ترتیب اور پیشکش کے اعتبار

سے ایسی موثر انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی کہ سامعین اپنے پسندیدہ اور ابھرتے ہوئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ان لکھنے والوں کی تحریروں بھی باقاعدگی سے سن سکیں گے جن سے ہمارے ادب کا بھرم اور اعتبار قائم ہے۔

◆◆◆

جیوے جیوے پاکستان

جیوے جیوے پاکستان! اے وطن کے سجیلے جوانو! ہم مصطفوی' مصطفوی' مصطفوی ہیں اور بے شمار خوبصورت دوہوں' نظموں' سفرناموں اور غزلوں کے خالق جمیل الدین عالی نے بطور آزاد امیدوار سینٹ کا الیکشن لڑنے کا اعلان کیا ہے اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نیاپنے کاغذات نامزدگی ٹیکنو کریٹس کے لیے مخصوص نشستوں پر جمع کروائے ہیں۔ ہمارے لیے اس خبر کا سب سے خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اقتدار کے ایوانوں اور قوت نافذہ کے حامل اداروں میں ایک لکھاری کی شمولیت کا موقع بھی پیدا ہوگیا ہے کہ سینٹ' قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے کم وبیش آٹھ سو افراد کے ہجوم میں بھولے سے بھی کوئی ایسا نام یا چہرا نظر نہیں آتا جسے ہم اپنی برادری کا نمائندہ یا تعلق دار کہہ سکیں۔

اس وقت سینٹ میں برادرم اعتزاز احسن اور تاج حیدر' دو ایسے حضرات یقیناً ہیں جن کا ادب سے ایک ایسا تعلق ہے جسے قابل لحاظ کہا جاسکے۔ چند ماہ پہلے تک نوابزادہ نصر اللہ خاں اور تابش الوری بھی اس محدود گروہ میں شامل کیے جاسکتے تھے جن کا ادب اور سیاست دونوں میانوں سے براہ راست تعلق تھا لیکن یہ چاروں حضرات شعروادب کے حوالے سے اس طرح کے نمائندے قرار نہیں دیئے جاسکتے جیسے کہ جمیل الدین عالی ہیں یا ہوسکتے ہیں۔

عالی اس پہلے بھی ایک بار سیاست کے میدان خارزار میں قدم رکھنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے کالعدم ہونے اور جنرل ضیاء الحق کے طویل مارشل لاء کی بے نام دھند میں ان کی یہ کوشش اپنے نتائج سمیت ایسی گم ہوئی کہ اب شاید عالی جی کو بھی اس کی پوری تفصیلات یاد نہ ہوں۔ ۱۹۸۴ء میں ہمیں ان کے ساتھ امریکہ اور کینیڈا کا ایک خاصا تفصیلی دورہ کرنے کا موقع ملا جس میں مرحومہ پروین شاکر بھی ہماری ہم سفر تھیں۔ ذاتی طور پر ہمارے لیے اس سفر کا حقیقی سرمایہ اپنے انہی دوہم سفروں کی شخصیت سے وہ تفصیلی تعارف ہے جو شاید اس ہم سفری کے بغیر ممکن ہی نہ تھا کہ بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کسی انسان کو صحیح معنوں میں جاننے کا ایک طریقہ اس کے ساتھ سفر کرنا بھی ہے۔

پاکستان سے محبت ہر پاکستانی کے لیے لازمی تو ہے مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی پاکستانیت کی حفاظت' بقاء اور ترویج وترقی کے لیے اتنے جذباتی' متحرک' حساس اور کوشاں ہیں جتنا کہ ہم نے عالی جی کو دیکھا اور پایا ہے۔ ان کا تعلق مختلف حالوں

سے ریاست الور، مرزا غالب، خواجہ میر درد اور یو پی سے بنتا ہے، ایک زمانے میں وہ اپنے نام کے ساتھ نوابزادہ بھی لکھا کرتے تھے مگر اب وہ پہچان کے ان سارے مراحل سے گزر کر اپنے تشخص کے لیے صرف اور صرف پاکستانیت کو بنیاد ٹھہراتے ہیں اور اپنے یو پیاپے (یو پی کا انداز اور فطرت) کو وہیں تک رکھتے اور برتتے ہیں جہاں وہ ان کی پاکستانیت سے متصادم نہ ہو۔ یوں دیکھا جائے تو وہ اس مخصوص پاکستانی تہذیب کے ایک اہم نمائندے ہیں جسے ان پچاس برسوں میں معاشرے کے ہر مخصوص پاکستانی تہذیب کے ایک اہم نمائندے ہیں جسے ان پچاس برسوں میں معاشرے کے ہر گروہ اور روپ میں واضح طور پر نظر آنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو آج ہم علاقائی قومیتوں، نسلی تشخص، لسانی گرہوں اور اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے بہت سے مسائل پر نہ صرف ہمیشہ کے لیے قابو پا چکے ہوتے بلکہ وطنِ عزیز کے تمام شہری بلا کسی تمیز اور تخصیص قومی ترقی میں اس طرح شانہ بشانہ مصروفِ عمل ہوتے کہ ساری دنیا رشک کی نظروں سے ہمیں دیکھا کرتی اور اقوامِ عالم کی برادری میں پاکستان ایک ایسا مثالی اسلامی ملک ہوتا جس کے حسن کی چھوٹ تمام اسلامی برادری پر بھی پڑ رہی ہوتی۔

خیر یہ تو وہ سب ''اگر'' ہیں جو تشنہ تکمیل آرزوؤں کی طرح ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم بات کر رہے تھے جمیل الدین عالی اور ان کے حوالے سے پاکستانیت کی۔ ذاتی طور پر ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وطن پرستی یا وطن سے محبت ادب کی سطح پر بڑے علامتی، نازک اور خوبصورت انداز میں بیان ہونی چاہیے اور اسے سیاسی زبان، نعرہ بازی اور وقتی مصلحتوں سے بلندتر ایک ایسے مقام کا حامل ہونا چاہیے جو ادب کا عالمی اور مصدقہ مقام اور معیار ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک استثناء کی حیثیت رکھتی ہے کہ کبھی کبھی ان دونوں کی سرحدیں مل جاتی ہیں یا انہیں ملانا پڑ جاتا ہے کہ ایسا نہ کرنے سے ادب کی ''حرمت'' تو شاید بچ جائے ادیب کی ''حرمت'' تباہ ہو جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک صورتحال کا سامنا ہمیں ۱۹۸۴ء کے اس سفر کے دوران واشنگٹن میں ہوا سر سید اور علی گڑھ کے حوالے سے ایک تنظیم کے تحت پاک و ہند مشاعرہ تھا۔ سامعین میں ۹۰ فیصد سے زیادہ لوگ بھارت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے ایک بہت مقبول شاعر اور دوست نے (جو ان دنوں ایک طرح کی جلاوطنی کے شکار تھے) سامعین کی فرمائش پر (اور ہمارے منع کرنے کے باوجود) ایک ایسی نظم پڑھی جس میں پاکستان کی ایک مخصوص حکومت اور صورتحال پر تنقید کی رو میں کچھ ایسی باتیں بھی کہی گئی تھیں جن کا تعلق براہ راست پاکستان کی سالمیت، خود مختاری، وجود، تشخص اور نظریئے سے تھا اور جن کا مجموعی تاثر یقیناً ہمارے اور وہاں پر موجود پاکستانیوں کے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ نظم ختم ہوئی تو ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ ہم نے اور پروین شاکر نے عالی جی کی طرف دیکھا جن کا

چہرہ اندرونی کشمکش کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اتفاق سے باری بھی انہی کی تھی چنانچہ جونہی ان کا نام پکارا گیا انہوں نے مائیک پر آتے ہی بغیر کسی تمہید کے اپنا ترانہ جیوے جیوے پاکستان اپنے مخصوص ترنم میں (جو اس وقت جذبات کی شدت کے باعث ان کے ساتھ نہیں دے رہا تھا) پڑھنا شروع کر دیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کب ہم اور ہال میں موجود دیگر پاکستانی بطور کورس سنگرز کے ان کے ساتھ شامل ہوئے لیکن اس ردعمل کا فوراً اثر یہ ہوا کہ چند ہی لمحوں میں اس نظم کا اثر زائل ہو گیا اور ہم اپنے اندر کی پاکستانیت کے ایک ایسے روپ سے آشنا ہوئے جس کا سو فیصد کریڈٹ عالی کے اس قومی گیت اور ان کی اس کیفیت کو جاتا ہے جس کی بنیاد ہم سب کا اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرنا ہے۔ چلتے چلتے عالی کا ایک شعر سن لیجیے جو پتہ نہیں کیوں ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
امید بھی نہ رکھوں ناامید بھی نہ رہوں!

◆◆◆

عیدمبارک

ایک زمانہ تھا کہ عید کارڈوں پر عید کے حوالے سے بہت مزے مزے کے شعر چھپا کرتے تھے مگر یہ تب کی بات ہے جب لوگ عید کو "حالات حاضرہ" کی روزمرہ کارروائیوں سے علیحدہ کرکے "عید" کے طور پر مناتے یا منانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب تو کچھ یوں ہے کہ زندگی کے سمندر میں موجود یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی زیر آب آ کر سمندر ہی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ ایک مایوسی آمیز جھلاہٹ ہے جس نے پوری قوم کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے' سو سب سے پہلی بات جو "عید مبارک" کے حوالے سے ہم نذر قارئین کرنا چاہتے ہیں وہ یہی ہے کہ اپنے خوابوں' خواہشوں اور تہواروں کو اس خطرناک رویئے کے نرغے سے آزاد کرایا جائے اور چیزوں کو ان کے اصلی اور اور یجنل پس منظر اور تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے کیونکہ اگر دھاگے الجھتے چلے جائیں تو پھر سامنے کی باتیں بھی گنجلک دار ہو جاتی ہیں اور باہمی اشتراک اور تبادلہ خیال کا سرا تک ڈھونڈنا دشوار ہو جاتا ہے۔

گذشتہ پچاس برس میں بحیثیت قوم ہمارا ریکارڈ اچھا ہے یا برا یا بہت برا........ اس پر غور' گفتگو' تنقید' ماتم اور بحث کرنے کے لیے ہم سال کے بارہ مہینے' باون ہفتے اور تین سو پینسٹھ دن صرف کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ دنوں کو نکال لیا جائے تو ہمارے خیال میں ہماری اس "مجموعی کارکردگی" پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ صفر میں سے بہرحال کوئی اور عدد منفی نہیں کیا جا سکتا۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ زیادہ کھانے' زیادہ بولنا اور زیادہ ہنسنا اچھا نہیں ہوتا مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا کہ آدمی فاقے کرے' چپ شاب کا روزہ رکھے اور اوپر نیچے کے ہونٹوں کے درمیان ایک ملی میٹر کا فاصلہ بھی نہ پیدا ہونے دے۔ دنیا کے حالات' مہنگائی' بے روزگاری دہشت گردی' سیاسی اکھاڑ پچھاڑ روپے کی قیمت' ماحولیاتی آلودگی اور ٹوٹی ہوئی سڑکوں نے اور بہت سے مسائل سمیت برحال اپنی جگہ پر رہنا ہے کہ ان کو کم اور حل کرنے کا عمل ایک پانی سے بھری بڑی کشتی میں سے لوٹوں کے ساتھ پانی نکالنے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے یہ کام ایسا ہے کہ جو بیک وقت' وقت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ زندہ قومیں اور فعال معاشرے روزمرہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اور اس کی تمام تر ہماہمی کے باوجود اپنے اجتماعی رویوں اور قومی شناخت کے حوالوں کے سلسلے میں بہت محتاط' باخبر اور پرجوش رہتے ہیں اور بڑے سے

بڑے طوفان کو بھی اپنے قومی تشخص کے مظاہر کے ساتھ ٹکرانے نہیں دیے اور تن من دھن سے اس کے رستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہمارا مسئلہ بقول جسٹس کیانی مرحوم کم وبیش وہی ہے کہ

''پاکستان بننے کے دنوں میں قوم اپنے ملک کو تلاش کر رہی تھی اور اب وہ ملک اپنی قوم کو ڈھونڈ رہا ہے۔''

بیسویں صدی میں دنیا کا ڈھانچہ جس تیزی سے بار بار تبدیل ہوا ہے اس نے تاریخ جغرافیے' قومی اور قومیتوں کے کچھ ایسے مسائل کھڑے کر دیے ہیں جن کا کوئی شافی جواب ہماری دنیا (خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک) سے بن نہیں پا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے قوموں ملکوں' آزاد ریاستیں اور نو آبادیوں کے تصورات بھی بہت تیزی سے بدلے ہیں اور اب اقوام متحدہ کے ممبران کی تعداد اس کے بنیادی یا ابتدائی ممبران کے مجموعے سے کم وبیش چار گنا بڑھ چکی ہے لیکن اس سارے بکھراؤ اور پھیلاؤ کے باوجود دنیا پہلے سے کہیں زیادہ سمٹ گئی ہے۔ ملکوں کے درمیان فاصلے نہ صرف مکانی طور پر سکڑے ہیں بلکہ جدید ٹیکنالوجی کے باعث ان میں زمانی حوالے سے بھی حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے کہ دنوں اور ہفتوں کا سفر اب گھنٹوں میں طے ہونے لگا اور آواز' تصویر اور تحریری پیغام کی ترسیل تو اب پلک جھپکنے کے عرصے سے آنکھیں ملا رہی ہے۔ سوان ۵۰ برسوں میں تشکیل پانے والے نئے ممالک اور قوموں و قومیتوں کو یقیناً اپنے اجتماعی نقوش کی تیاری اور دیکھ بھال میں وہ وقت نہیں ملا جو ماضی یں ملا کرتا تھا۔ وطن عزیز بھی چونکہ اسی صف کا ایک نمائندہ ہے اس لیے بجائے ناراض' اداس یا مایوس ہونے کے' ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری صورت حال کو ایک معروضی انداز نظر کے ساتھ دیکھا اور سمجھا جائے تا کہ ایسی ترجیحات معین کی جا سکیں جنہیں قومی لائحہ عمل کا حصہ بنانے سے وہ نتائج بھرپور اور موثر طور پر حاصل کیے جا سکیں جن پر ہمارے اجتماعی مستقبل کا دارومدار ہے۔

اس سارے عمل کے لیے ایک انتہائی اہم ابات اس رویے کی تشکیل ہے جسے عرف عام میں صحت مندانہ تنقیدی رویہ کہا جاتا ہے یعنی غم ہو یا خوشی دنوں کے ساتھ میرٹ کے مطابق سلوک کیا جائے۔ اب مثلاً عید کے تہوار کو ہی لیجیے۔ یہ پاکستان کے تمام مسلمان شہریوں کے لیے اجتماعی خوشی کا ایسا موقع ہے جس کی جڑیں مذہب' ثقافت اور تاریخ تینوں سے رشتہ آرا ہیں۔ (اور اس خوشی میں ہمارے وہ ہم وطن بھی برابر کے شریک ہیں جو ہمارے ہم مذہب نہیں۔ بالکل اسی طرح' جس طرح ان کے مذہبی تہواریوں میں ہم شامل ہوتے ہیں یا ہمیں ہونا چاہیے)

ہمارے نزدیک یہ کہہ کر عید پر تنقید کرنا یا اس سے متعلق اور منسوب خوشیوں سے کنارہ کشی کرنا کہ معاشرے کے سارے مسائل

جوں کے توں ہیں اور غریب آدمی کے لیے سانس تک لینا دشوار بلکہ ناممکن ہو رہا ہے کچھ ایسا مثبت رویہ نہیں۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بالآخر وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو برے دنوں میں اپنے حواس پر قابو رکھتی ہیں۔ بحرانوں میں بے جہت نہیں ہوتیں اور آنسوؤں کے درمیان مسکرا سکنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہیں۔

سو آیئے کم از کم آج کا دن ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر' مسکراتے ہوئے درگزر کرتے ہوئے اور ایک دوسرے سے اس طرح ملتے ملاتے ہوئے گزاریں کہ سب کے لبوں پر ایک دوسرے کے لیے محبت' دوستی' صحت' اور خیر سگالی کے پیغام ہوں اور تمام آنکھوں میں ایک ہی تحریر واضح طور پر نظر آئے۔ عید مبارک!!

◆◆◆

یہ انکوائری آفس

جدید طرز حیات کے بہت سے تحفوں میں استقبالیہ کاؤنٹر اور انکوائری آفس بھی شامل ہیں کہ ہر ماڈرن ادارہ اپنے گاہکوں کو مختلف نوع کی معلومات فراہم کرنے کے لیے ان شعبوں کا خصوصی طور پر اہتمام کرتا ہے۔ آپ کسی بھی مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں چلے جایئے قدم قدم پر آپ کو صحیح اور بروقت رہنمائی کے لیے ایسے مستعد' فرض شناس اور خوش مزاج لوگوں سے واسطہ پڑے گا کہ مسافر ہونے کے باوجود آپ کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ خاص طور پر وہ ادارے جن کا تعلق لوگوں کے سفر کے معاملات سے ہے' بے انتہا معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ فلائٹ انکوائری ہو یا ریلوے اور بس سے متعلق معلومات' ساری تفصیلات لمحوں میں آپ تک پہنچ جاتی ہیں اور آپ آنکھیں بند کر کے ان پر یقین کرتے ہوئے اپنے آئندہ پروگرام ترتیب دے سکتے ہیں۔ ان معلومات اور بلنگز کے مصدقہ ہونے کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ''کفار'' کے ان ممالک میں عام طور ر لوگ اپنے پروگرام کئی کئی مہینے پہلے ترتیب دیتے ہیں لیکن وقت آنے پر انہیں ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ملتی ہے۔

آج صبح ہم نے عزیزی عاقب انور کو اسلام آباد کی فلائٹ کے لیے ایئرپورٹ ڈراپ کیا۔ ۸ بجے کی فلائٹ تھی' سات بجنے میں دو منٹ پر پی آئی اے انکوائری والوں نے کوئی چوتھے فون اور پندرھویں گھنٹی پر بتایا کہ فلائٹ بالکل وقت پر ہے' سات بج کر چالیس منٹ پر عاقب کا ائیرپورٹ سے فون آیا کہ فلائٹ فی الوقت ایک گھنٹہ لیٹ ہے اور احتمال ہے کہ مزید لیٹ ہوگی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چیک ان ٹائم شروع ہونے تک انکوائری والوں کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ جہاز کب اڑے گا تو ایسا آفس بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پی آئی اے میں بھرتی کیا ہوا یہ بے شمار فالتو عملہ آخر کرتا کیا ہے؟ اور یہ لوگ کب اور کہاں کام کرتے ہیں؟ ابھی آج ہی کے اخبار میں ہے کہ تقریباً تین سو پاکستانیوں کو عید جدہ ایئرپورٹ پر صرف اس لیے گزارنا پڑی (جب کہ ان کے عزیز رشتے دار پاکستان میں ان کے انتظار میں ذلیل وخوار ہوتے رہے) کہ جہاز کا عملہ ۱۲ گھنٹے کی مسلسل ڈیوٹی کے بعد مزید ڈیوٹی دینے کے قابل نہیں تھا اور ان کی جگہ ڈیوٹی کرنے کے لیے متبادل عملہ موجود نہیں تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کی وضاحت کے طور پر پی آئی اے کے متعلقہ حکام حسب معمول کچھ آپریشنل مجبوریاں گنوائیں گے اور بتائیں گے کہ عید کے دنوں میں غیر معمولی رش کی وجہ سے اس طرح کی صورتحال بن جایا کرتی ہے۔ ہم نے ایک بار ملاقات کے دوران پی آئی اے کے ایک سابق چیئرمین صاحب کو

بالمشافہ بھی کہا تھا کہ عید کوئی زلزلہ یا موت نہیں ہوتی جس کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہ ہو یہ ہر سال آتی ہے اور ملک کے ہر کیلنڈر اور جنتری پر اس کی تاریخوں کا جلی اندراج ہوتا ہے۔ آپ لوگ کیوں پہلے سے اس کے لیے منصوبہ بندی نہیں کرتے اور ان بے شمار ایماندار' محنتی اور اصلی مسافروں (جو اپنے پلے سے پوری ٹکٹ خریدتے ہیں) کی بددعائیں لیتے ہیں جو سال دو سال بعد وطن میں عزیزوں سے ملنے اور ان کے ساتھ عید کرنے کے لیے بڑی آرزوؤں' حسرتوں اور مشکلوں سے اس سفر کا انتظام کرتے ہیں۔

کم و بیش یہی حال ریلوے کا بھی ہے۔ ہفتہ ۳۱ جنوری کو ہمارے عزیز راولپنڈی سے بذریعہ ریل کار لاہور آ رہے تھے' آمد کا وقت رات ۴ بج کر ۴۰ منٹ تھا' ۹ بجے فون کیا تو پتہ چلا کہ سہالہ کے نزدیک کسی گاڑی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے اور اب یہ ریل کار پونے ۱۲ بجے رات پہنچے گی لیکن آپ احتیاطاً گیارہ بجے فون کر لیجیے گا ممکن ہے کہ مزید تاخیر ہو جائے۔ گیارہ بجے ہم نے فون کیا' بہت دیر گھنٹی بجنے کے بعد کسی صاحب نے اٹھایا اور تقریباً غراتے ہوئے پوچھا کہ ان کے آرام میں خلل کیوں ڈالا گیا ہے اور پھر یہ بتا کر کہ ٹرین ساڑھے بارہ بجے آئے گی ہماری بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ ہم نے دوبارہ فون ملایا اس بار کسی انسان نما آواز نے جواب دیا ہم نے شکایت کی کہ بھائی آپ کو جو کوئی فون کرتا ہے معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی کرتا ہے اور اسی کام کے لیے یہاں آپ کو متعین کیا گیا ہے تو آپ کم از کم پوری بات تو سن لیا کریں اور لوگوں کو وہ متعلقہ معلومات ذرا اچھے دوستانہ اور واضح انداز میں بتا دیا کریں جن کے لیے وہ فون کرتے ہیں۔ اس پر ان صاحب نے بتایا کہ دراصل پہلا فون جن حضرت نے اٹھایا تھا ان کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے اور چونکہ ان کی جگہ لینے والا ابھی نہیں پہنچا اس لیے وہ ہر ایک کو جلی کٹی سنا رہے ہیں اور آپ نوٹ کر لیجیے کہ ٹرین اب پونے بارہ بجے پہنچے گی ساڑھے گیارہ بجے ہم سٹیشن کی طرف روانہ ہونے کے لیے نکل رہے تھے کہ فون آیا کہ ہمارے عزیز سٹیشن پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں؟؟؟

اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں محکموں میں فاضل بھرتیاں کہاں ہوئی ہیں جہاں تک عوام کی خدمت اور انہیں سہولیات مہیا کرنے والے شعبوں کا تعلق ہے وہاں تو ہمیں فالتو کیا ''لازمی'' لوگ بھی کبھی ڈیوٹی پر اس طرح سے نظر نہیں آئے جیسے انہیں آنا چاہیے۔ ہم نے گزشتہ دنوں ایک افطاری کے دوران پی آئی اے لاہور کی منیجر تعلقات عامہ یاسمین ہارون سے اس مسئلے پر بات کی تو جواب غالب کے اس شعر کی صورت میں نکلا کہ:

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے

ان کے مسائل سن کر ہمیں اپنی شکایت پر شرمندگی سی ہونے لگی لیکن ایک بات کی خوشی بھی ہوئی کہ کم از کم پی آئی اے میں ابھی ایسے کچھ لوگ موجود ضرور ہیں جو اس صورتحال سے ناخوش اور مضطرب رہتے ہیں۔

ہم نے انہیں یہ بھی بتایا کہ تمام معلوماتی کتابچوں میں پی آئی اے فلائٹ انکوائری کے لیے ۱۱۴ کا نمبر دیا گیا ہے مگر یہاں یا تو فون ملتا نہیں یا کوئی اٹھاتا نہیں پھر ایک دن اچانک ہمیں کسی نے بتایا کہ یہ نمبر تو اب غالباً سول ایوی ایشن والوں کو مل چکا ہے فلائٹ انکوائری کے لیے لاہور کا نمبر ۱۰۱۰ ۶۵۰ ہے۔ ہم نے نمبر ملایا تو واقعی آگے سے انکوائری والوں نے جواب دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پی آئی اے کے مسافروں کو اس تبدیلی کے بارے میں کون اور کب بتائے گا؟ کیا ابلاغ عامہ کے ذرائع کے اس طوفانی دور میں یہ اطلاع ٹی وی، ریڈیو یا اخبارات پر نہیں دی جاسکتی تھی اور اگر ان پر بہت زیادہ خرچہ آتا ہے تو دس پندرہ روپے کی ایک ربڑ سٹیمپ ہی بنوا کر ٹکٹ کے اوپر کہیں لوگوں کو یہ اطلاع فراہم کردیں کہ اب ان کے شہر میں پی آئی اے انکوائری کا نمبر بدل کر فلاں ہوگیا ہے۔

چلیے جلے دل کی باتیں بہت ہوگئیں اب چلتے چلتے ایک سردار جی نے انکوائری کا جو جواب دیا وہ بھی سن لیجئے، ممکن ہے اس میں کسی عقل والے کو کوئی نشانی مل جائے۔ ایک اہل زبان صاحب نے بڑی شستہ اور مرصع اردو میں ان سے پوچھا ”قبلہ سردار صاحب کیا میں آپ کا اسم گرامی پوچھ سکتا ہوں؟“

سردار جی نے چند لمحے سوچا پھر مسکرا کر کہا ”پوچھیں۔“

روشنی بانٹتا ہوا دن

آج اس دن کو گزرے پورے تیس سال ہو گئے ہیں ہمارے ایک نوجوان شاعر کا مصرعہ ہے:

ہم کتنے ایک سال کے اندر بدل گئے!

سو ان تیس سالوں میں کیا کیا کچھ نہیں بدلا ہوگا! مگر عجیب بات ہے کہ جس طرح ہم سے پہلی نسل کو ۱۴ اگست ۴۷ء کے دن کی کیفیت نہیں بھولتی اسی طرح ہماری نسل کے لیے چھ ستمبر کی واردات ایک سنت میل بن گئی ہے۔

جنگ بری چیز ہے....... اس سے بظاہر کسی کو بھی اختلاف نہیں لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ساری انسانی تاریخ جنگوں سے بھری پڑی ہے بلکہ ایک تحقیق کے مطابق تو گزشتہ پانچ ہزار سال میں صرف ڈیڑھ سو کے لگ بھگ برس ایسے گزرے ہیں جن کے دوران اس کرہ ارض پر انسان باہم برسر پیکار نہیں رہے۔ اگر یہ جنگ اس طرح کی ہوتی کہ....... بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر' تو شاید ہمیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن یہ تو شاید اسی وقت ممکن تھا جب دنیا کی لگام جنگجو طالع آزماؤں' نسلی برتری کے شیدائیوں اور انسانی وسائل پر زبردستی قبضہ کرنے والے غاصبوں کے ہاتھوں میں نہ ہوتی۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح بعض قوموں کو اپنی بقا اور دفاع کے لیے اور کچھ کو اپنا چھینا ہوا حق واپس لینے کے لیے جنگ کرنا پڑتی ہے' بعض پر جنگ زبردستی ٹھونس دی جاتی ہے اور بعض کی حالت ان فصلوں کی سی ہوتی ہے جو ہاتھیوں کی لڑائی میں خواہ مخواہ کچلی جاتی ہیں۔

۶ ستمبر ۶۵ء کو جب ابھی پاکستان کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہوئی تھی وہ بے انصافی رنگ لے آئی جو قیام پاکستان کے وقت ریڈ کلف ایوارڈ کے حوالے سے کی گئی تھی اور پاکستان کی سرحدوں کو کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا تھا کہ یوں تو اس کا سارا بدن غیر محفوظ تھا مگر کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے نے اس کی شہ رگ پر مستقل دباؤ ڈال رکھا تھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد کوئی ایسا لیڈر نہ تھا جو اس مسئلے کی گتھیاں بات چیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ کھول سکتا چنانچہ ایک کے بعد ایک' کر کے گرہیں لگتی چلی گئیں اور بات وہاں تک پہنچ گئی جہاں زبان کی جگہ بندوق لے لیتی ہے۔

یوں تو آج اس واقعے کے تیس برس بعد بھی ہمارے کچھ سیاسی تجزیہ نگار اور چند ایک ریٹائرڈ دانشور فوجی افسران اپنی تحریروں میں

اس طرح کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں جیسے یہ جنگ' اس کے واقعات' شہداء اور غازیوں کے کارنامے' قوم کی بیداری اور جوش' (وقتی طور پر ہی سہی) جرائم باہمی اختلافات اور نفسا نفسی کا خاتمہ اور جذبہ جہاد! یہ سب کچھ یا تو محض اعداد و شمار تھے یا ایک مبالغہ آمیز اور گمراہ کن داستان کہ سترہ دنوں کی اس مختصر جنگ کو جنگ کہنا ان کے نزدیک کوئی ایسا روا اور جائز کام نہیں۔

اگرچہ یہ موضوع ایسا ہے جو بذات خود ایک سے زیادہ باقاعدہ کالموں کا متقاضی ہے مگر اس وقت ہم اس ناخوشگوار بحث سے قطع نظر کرتے ہیں کہ فی الوقت ہمارا ارادہ قومی تاریخ کے اس اہم اور درخشاں دے روشنی کے تار چنن کا ہے' اندھیرے کا کیا ہے اسے تو اب دن میں بھی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

۶ ستمبر ۶۵ء کے سورج نے ہمیں' ہماری ذات میں چھپے ہوئے کچھ ایسے جوہروں اور منظروں سے آگاہ کیا جن سے ہم ابھی تک بحیثیت قوم ناآشنا چلے آرہے تھے اور اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید آج تک ہماری حالت وہی ہوتی۔ احمد ندیم قاسمی نے اس کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔

چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اس رات بھی نکلے تھے مگر اس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسم حسیں' قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں' جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

اور پھر ۶ ستمبر کا آفتاب جب ایک دھماکے سے افق پر ابھرا تو وطن عزیز کی گلی گلی جاگ اٹھی۔ مرد و زن پیر و جواں' سرخے اور سبزے' لوکل اور مہاجر' امیر اور غریب' سب کے سب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے جیسے ان میں کبھی کسی قسم کی کوئی تفریق تھی ہی نہیں۔ پہلی بار اور اب تک کی قومی تاریخ میں آخری بار قوم ہونے کا ثبوت دیا اور ایک دوسرے کے چہروں میں اپنے چہروں کو روشن اور منور پایا' بے معنویت اور اس سے پیدا ہونے والی جس بے حسی کی چادر نے نظروں کو ڈھانپ رکھا تھا اس کی جگہ ایک ایسا یک رنگی کا احساس کراں تا کراں پھیلنا شروع ہوا جس کی چکا چوند نے غنیم کی آنکھوں کو پہلے خیرہ اور پھر بے نور کر دیا کہ جس خاکستر میں اس کو چنگاری تک کا گمان نہ تھا وہ سرتاپا شعلہ بن گئی تھی...... ایک ہی آواز تھی جو چاروں طرف گونج رہی تھی۔

سروں کو ہاتوں میں لے کے نکلو وطن کی مٹی بلا رہی ہے

ہوائے سرحد نے قریہ قریہ یہ کیسا پیغام دے دیا ہے

کلی کلی شعلہ نوا ہے گلی گلی اب یہی صدا ہے

اٹھو شہادت کی نیک ساعت جبیں سے پردہ اٹھا رہی ہے

وطن کی مٹی بلا رہی ہے

لہو کے نشے میں چور سورج نے بادلوں میں سمٹ کے دیکھا

کنول نگاہوں گلاب چہروں نے چلمنوں کو الٹ کے دیکھا

سنہرے کھیتوں میں ہل چلاتے بہادروں نے پلٹ کے دیکھا

عدو کی آہٹ غبار بن کر ہر ایک سرحد پہ چھا رہی ہے

وطن کی مٹی بلا رہی ہے

مکین بولے مکان بولے یہ سوچنے کا مقام کیا ہے!

لہو میں ڈوبے نشان بولے بتاؤ دشمن کا نام کیا ہے!

بزرگ بچے جوان بولے چلو کہ رکنے کا کام کیا ہے

ہر ایک منظر میں باد جرائت چراغ خوشبو جلا رہی ہے

وطن کی مٹی بلا رہی ہے وطن کی مٹے بلا رہی ہے

تیس برس پہلے یہ ندا ہمیں ان بیرونی سرحدوں کی طرف سے آرہی تھی جن کی طرف بڑھنے والے پاؤں دوست نہیں تھے لیکن آج تیس برس بعد کا چھ ستمبر ہمیں جن اندیشوں کی دھمک سنا رہا ہے وہ نہ تو کہیں باہر سے آرہی ہے اور نہ ہی دشمنوں کی پیدا کردہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ایک بار پھر ہم اس اندرونی محاذ پر ڈٹ کر ساری دنیا کو دکھا دیں کہ زندہ قومیں اگر نیند میں بھی ہوں تو ان کو سویا ہوا نہیں سمجھنا چاہیے۔

◆◆◆

سرکاری ملازم

یوں تو وطن عزیز میں دم تحفظ کا احساس اب اتنا پرانا ہو چلا ہے کہ اصولاً ہمیں اس کی عادت ہو جانا چاہیے تھی یعنی ڈاکٹری اصلاح کے مطابق ہمیں اس کا امیون ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن حیوانی اور انسانی وجود میں شاید یہی بنیادی فرق ہے کہ انسان کا ذہن اس کے بدن کی طرح قانون ارتقا کی فیکٹری کا روبوٹ بن کر نہیں رہتا بلکہ سوچتا ہے حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں اس کی سوچ اور فکر نہ صرف پہلے سے موجود دروازوں پر دستکیں دیتی رہتی ہے بلکہ زندگی کے اس جادو گھر کے نئے دروازے بھی تلاش کرتی رہتی ہے۔ سو اس چاروں طرف پھیلی ہوئی ہمہ گیر اور فری فار آل قسم کی افراتفری میں بھی زندگی کی سچائیوں' اقدار اور معاشرے کی ترقی اور استحکام میں یقین رکھنے والے لوگ ہر نئے سانچے پر رکتے' ٹھٹھکتے ' سوچنے اور غمزدہ ضرورت ہوتے ہیں۔ ملکی فضا پر سیاسیات اور اس کے متعلقات کا غلبہ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ سماجی اقدار معاشرتی قوانین اور زندگی کے معیار کی گراوٹ اور شکست و ریخت کی طرف یا تو دھیان ہی نہیں جاتا یا پھر یہ معاملات ہماری ترجیحات میں اتنا نیچے چلے گئے ہیں جیسے کسی میٹنگ کے طویل ایجنڈے کے آخر میں کوئی اور مسئلہ یا آئیٹم لکھا ہوتا ہے جہاں تک پہنچنے سے پہلے کھانے کا وقفہ ہو جاتا ہے اور اجلاس آئندہ کسی تاریخ کے لیے ملتوی کر دیا جاتا ہے اور پھر یہی ڈرامہ اسی تسلسل اور ترتیب سے اگلی بار دہرایا جاتا ہے۔

اردو کے ایک بہت منفرد لہجے کے مگر انتہائی گمنام اور گوشہ نشین شاعر محبوب خزاں نے سرکاری ملازم کی ذہنیت کے حوالے سے ایک بہت خوبصورت مطلع کہا تھا۔

خزاں یوں آدمی اچھے بہت ہیں
ملازم پیشہ ہیں' ڈرتے بہت ہیں

ایک زمانہ تھا (اور بہت سے مہذب ملکوں میں یہ زمانہ اب بھی ہے) کہ سرکاری ملازمت کی اتھارٹی کے پیچھے پوری سرکار کی اتھارٹی ہوا کرتی تھی۔ افسر کے لکھے ہوئے حکم کی عزت اور دہشت ہوتی تھی اور سرکاری افسر تک رسائی کا ایک ضابطہ اور طریقہ کار ہوتا تھا۔ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں آزادی سے پہلے غیر ملکی آقاؤں نے حکومت کے آداب کچھ ایسے وضع کیے تھے کہ عام آدمی ان کے اور ان کے مقرر کیے ہوئے سرکاری اہل کاروں کے جوتے چاٹنے پر مجبور ہو اور ان دونوں میں آقا اور غلام کا فرق برقرار رکھا

جائے (یہ بات ہے کہ انہی دنوں میں یہی غیر ملکی آقا اپنے اپنے ملکوں میں حاکم اور رعایا کے اس فرق اور تصور کو ختم کرنے کے لیے ہر سطح پر سر توڑ کوشش کر رہے تھے) لیکن ہوا یہ کہ آزادی کے بعد اس صورت حال پر اتنے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا گیا کہ افسری کی ''ناجائز'' افسری کے ساتھ ساتھ اس کی جائز قانونی اور انتظامی افسری بھی خطرے میں پڑنا شروع ہو گئی۔ عوامی شعور' آزادی' انقلاب' حقوق انسانی اور عوامی راج کے نعروں میں پورا معاشرہ کچھ ایسے الجھا کہ سارا نظام ہی اس کی زد میں آ گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان بننے کے بعد حکومتی افسران اپنی تنظیمی صلاحیتوں کو ملک و قوم کی بہتری' ترقی اور استحکام کے لیے صرف کرتے اور عوام سرکاری دفتروں میں ''سائل'' کے بجائے ایک ذمہ دار فرد کی طرح جاتے اور دونوں طرف کے معاملات کی انجام دہی میں ایک طریقہ' سلیقہ' احساس ذمہ داری اور باہمی احترام کی فضا پائی جاتی مگر ہوا یہ کہ افسروں کو مسلسل ایک عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا گیا اور ان کے دستخط کرنے والے قلم میں ایک ایسی روشنائی استعمال کی جانے لگی جس کے بنیادی اجزا سیاسی مفادات کی دخل اندازی' ذاتی تحریص ولالچ' عہدے کا غلط استعمال' ایڈہاک ازم' مصلحت پرستی' رشوت' ناجائز مراعات اور سیاسی بنیادوں پر کی جانے والی بھرتی پر مشتمل تھے اور دوسری طرف عوام کی فکر میں ایک ایسی انارکی' بے بسی' احساس ذلت' غنڈہ گردی' سفارش' سیاسی دباؤ اور قانون شکنی کو راہ ملنا شروع ہوئی جس نے سیدھے راستے پر چلنے کو ایک حماقت' عذاب اور گالی کی شکل دے دی۔

فی الوقت پاکستانی معشرہ ایک ایسے ہی تہذیبی آشوب کا منظر نامہ بنا ہوا ہے اور عقل حیران ہے کہ اس منفی در منفی صورت حال کا انجام کیا ہوگا۔ آپ کسی شعبے کو دیکھ لیجیے مذہب (حافظ سجاد اور منظور مسیح) معاشیات (تاج کمپنی' کوآپریٹو سکینڈل' مہران بنک) سیاست (سرحد اسمبلی' کراچی) سماجیات (مہنگائی' رشوت' آبادی' ماحولیات' آلودگی' بجلی' پانی' گیس' آٹا' گوشت وغیرہ) مواصلات (سڑکیں' موٹروے' ٹریفک جام) انرجی (کالاباغ ڈیم' لوڈشیڈنگ) غرض کہ جس طرح بھی نظر اٹھائیں آپ کو ''پنبہ کجا کجا نہم'' والی صورتحال نظر آئے گی لیکن قوم کے درخت پر یہ پھل راتوں رات نہیں لگے اور نہ ہی انہیں کسی خاص پارٹی یا دور حکومت سے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ ۴۷ برس سے کبھی کم' کبھی زیادہ ہم آپ ہی کانٹوں کی آبیاری کرتے آ رہے ہیں سو اب یہ حال ہے کہ ہر طرف کانٹوں کا ایک جنگل سا اگ آیا ہے۔

بات شروع ہوئی تھی کہ اس سارے انتشار کی زد میں آ کر ''سرکاری ملازم'' اور اس کی جائز انتظامی اتھارٹی پر کیا گزری (کہ اس اتھارٹی کے بغیر سرکاری محکموں کا نظام چل ہی نہیں سکتا) ایک ایماندار اور اپنی حدود کے اندر رہ کر کام کرنے والے سرکاری ملازم کے لیے موت نوکری سے بہتر ہو گی ہے کیونکہ چاروں طرف سے پڑنے والے سیاسی دباؤ' یونین کے بداؤ' عمومی کرپشن اور اس ایمانداری

کے نتیجے میں ملنے والی مستقل خجالت، تنقید، گھریلو اور معاشی پریشانیوں اور اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے اس کے اعصاب ہر وقت تنے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں بالآخر یا تو وہ ہتھیار ڈال کر دھارے کا حصہ بن جاتا ہے یا پھر اپنی ایمانداری کی سزا کے طور پر ایک ایسی خود رحمی کا مریض بن جاتا ہے جو دوسروں کے لیے "بے رحمی" کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

سرکاری افسران پر اس ہمہ گیر دباؤ کی شدت کا ایک مظاہرہ گذشتہ دنوں انکم ٹیکس کے ریجنل کمشنر فاروق ملک پر ان کے دفتر میں پندرہ بیس مسلح آدمیوں کے حملے کی شکل میں بھی ہوا ہے جس میں افسر موصوف کو جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد یہ مسلح غنڈے اتنے بڑے دفتر سے دن دہاڑے صاف بچ کر نکل گئے۔ نہ کسی نے انہیں روکنے کی جرات کی اور نہ اب تک پولیس ان پر ہاتھ ڈال سکی ہے۔ انکم ٹیکس کے افسران کی ہڑتال، صوبے کے گورنر سے ملاقات اور اخبارات میں روزانہ اس کیس کی چھپنے والی خبروں کے باوجود اگر حکومت اپنے ایک سینئر افسر کو انصاف اور اس کے ساتھیوں کو مستقبل میں احساس تحفظ نہیں دے سکی تو یہ کوئی آسانی سے نظر انداز کر دینے والی بات نہیں ہے۔

اس کے انتہائی تباہ کن اثرات پہلے سے خراب صورت حال کو کس قدر دگرگوں کر سکتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے، وزیر اعظم کے مشیر اطلاعات حسین حقانی ایسے معاملات کی نزاکت کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ابھی تک انہوں نے وزیر اعظم صاحب کو اس مسئلے کی سنگینی کا احساس کیوں نہیں دلایا...... یقین کیجیے مسٹر حقانی یہ واقعہ کسی بھی مہذب ملک کی انتظامی ترجیحات میں "کوئی اور آئٹم" کے طور پر نہیں رکھا جا سکتا!!

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں، حادثہ دیکھ کر

◆◆◆

ناخواندگی اور کینسر

گزشتہ دنوں ہمیں ایک ہی ہفتے میں اسلام آباد میں ہونے والی لٹریسی کمیشن کی ایک میٹنگ میں شرکت اور عمران خان کے کینسر ہسپتال کے مطالعاتی دورے کا موقع ملا اور ہماری حالت اس داستانوی کرداری جیسی ہوگی جس کی ایک آنکھ ہستی اور دوسری روتی تھی یعنی جہاں ہمیں یہ جان اور دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ناخواندگی اور کینسر جیسی عظیم آفتوں کے خلاف کس کس طرح سے جہاد اور مدافعت کی کوشش کی جارہی ہے وہاں یہ احساس بھی بے حد مایوس کن اور دل دہلانے والا تھا کہ ان دنوں بیماریوں کی وجہ سے وطن عزیز میں خلق خدا کن کن عذابوں سے گزر رہی ہے اور مستقبل کس قدر خدشات سے بھرا ہوا ہے۔

لئیق احمد خان کی متحرک اور فعال شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ٹیلی ویژن کے ابتدائی دنوں سے لے کر اب تک وہ سنجیدہ' علمی' سائنسی' معلوماتی اور دیگر اہم نوعیت کے مسائل پر بے حد معلومات افزا پروگرام بڑے دلچسپ' سادہ' رواں اور توجہ طلب انداز میں پیش کرتے آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ جس محکمے اور شعبے میں ہوتے ہیں وہاں کچھ نہ کچھ ایسے کام ضرور کرتے رہتے ہیں جو اگرچہ بہت اہم ہوتے ہیں مگر اپنی ظاہری خشکی' سنجیدگی اور کم رنگی کے باعث اس گلیمر اور تجارت زدہ معاشرتی صورتحال میں ترجیحات نہیں بن پاتے سو جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ فیملی پلاننگ ایسوی ایشن چھوڑ کر لٹریسی کمیشن سے متعلق ہو گئے ہیں تو سب سے پہلا خیال ہمارے ذہن میں یہی آیا کہ اب عنقریب لٹریسی کمیشن والوں کی کارکردگی کا گراف نہ صرف بلند ہوگا بلکہ میڈیا میں بھی اس کی گونج سنائی دے گی' سو یہی ہوا۔ پہلے اوپر تلے دو تین خط آئے' پھر لئیق صاحب نے ٹیلیفون پر بتایا کہ اسلام آباد میں پی ٹی وی کے اشتراک سے ایک دو روزہ کانفرنس ہو رہی ہے جس میں پی ٹی وی کے علاقائی پروگراموں کے اشتراک اور معاونت سے لٹریسی کے فروغ کے لیے وسائل اور طریقوں پر غور کیا جائے گا کہ فی زمانہ ٹیلی ویژن ہی ایک ایسا موثر اور دور رونزدیک مار وسیلہ ہے جس کے توسط سے ہم ان لوگوں تک شعور اور تعلیم کی ترسیل کر سکتے ہیں جو بوجوہ مروجہ نصابی تعلیم سے مکمل طور پر بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔

کانفرنس میں پی ٹی وی کی ایم ڈی رعنا شیخ کے علاوہ کمیشن کے چیئرمین پرویز صالح اور کچھ دیگر افسران نے بھی شرکت کی۔ آغا نصار' منو بھائی' سلیم چشتی' عبدالقادر جونیجو' کشور ناہید' محمد منشایاد اور ہمارے علاوہ مختلف علاقائی زبانوں (جنہیں پاکستانی زبانیں کہنا چاہیے) کے نوجوان لکھاری اور ذرائع ابلاغ کے چند پروفیسر اور ماہرین بھی شامل تھے۔ مختلف گروپس کی سفارشات اور اختتامی

اجلاس کی کاروائی سے ظاہر ہوا کہ پی ٹی وی اپنی اس نئی علاقائی ٹرانس میشن میں خصوصی طور پر ایسے پروگرام لکھائے اور بنائے گا جن کے ذریعے سے لٹریسی یعنی خواندگی کے کینسر کا سدباب کیا جا سکے۔

ناخواندگی کے نتائج وعواقب پر اس گفت وشنید کے بعد جب ہم عمران خان کی دعوت پر شوکت خانم میموریل ٹرسٹ کے کینسر ہسپتال کے مختلف پہلوؤں اور اس کی اب تک کی کارکردگی پر بریفنگ لے رہے تھے تو اس دوران میں بار بار یہ سوال ہمارے ذہن میں گونجتا رہا کہ انسانی جسم کو لگنے والا یہ روگ اگرچہ بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہے مگر ناخواندگی کی شکل میں جو کینسر ہماری قوم کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے اس کی شدت اور پھیلاؤ کو روکنے کے لیے تو سارے ملک کو ایک ایسے ہسپتال کی شکل مین بدلنا ہوگا جہاں اس مرض کا ایسی ہی توجہ اور مہارت سے علاج ہو جیسے عمران خان کے ہسپتال میں کیا جا رہا ہے۔

عمران خان نے ہمیں بتایا کہ وہ اب تک جوں توں کر کے زکوہ کی رقم اور بیرون وطن مقیم پاکستانیوں کی مدد سے ہسپتال کے چالو اخراجات پورے کرتا آرہا ہے اور اسے امید تھی کہ آئندہ چند برسوں میں یہ ہسپتال اس قابل ہو جائے گا کہ اس کے لیے بار بار چندے کی مہمات نہیں چلانی پڑیں گی مگر موجودہ حکومت کے صاحبان اقتدار ارکوان کے بعض مشیروں نے بدظن کر کے ایسی صورتحال پیدا کردی ہے کہ حکومت نے نہ صرف ہسپتال کی ہر طرح کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے بلکہ ان ذرائع کو بھی بند کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جہاں سے ہسپتال کو مالی معاونت مل رہی تھی۔

مثال کے طور پر ٹرسٹ کی زکوہ مہم کو ذرائع ابلاغ پر کم وبیش Ban (بین) کردیا گیا ہے۔ اخبارات میں اس کے بارے میں تشہیری مواد اور خبروں پر مختلف طرح کی پابندیاں ہیں اور یوں اس بہت مہنگے علاج والی بیماری میں مبتلا غریب کے علاج کی سہولت مشکل سے مشکل تر ہوتی جارہی ہے کہ اب تک کے کم وبیش چوبیس ہزار علاج اور مشورہ یافتہ مریضوں میں سے تقریبا نوے فیصد کے لگ بھگ مریض اسی زکوہ کی رقم سے علاوج حاصل کرتے رہے ہیں۔ جن مریضوں نے مکمل طور پر اپنے علاج کا خرچہ ادا کیا ہے اور جنہوں نے جزوی طور پر کچھ رقم ادا کی ہے ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ ہسپتال پر اٹھنے والے بھاری اخراجات کا دس فیصد بھی اس سے پورا نہیں ہوتا۔

اس سے قطع نظر کہ عمران کی کوئی سیاسی ترجیحات ہیں یا نہیں ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ موجودہ حکومت کے لیے کیسے طرح بن سکتا ہے! اگر پاکستانی سیاست اور پیپلز پارٹی کے ووٹ بنک کی تفصیلات پر غور کیا جائے تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ عمران کی سیاست میں آمد اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ نواز شریف یا دیگر اپوزیشن کے ووٹ بنک کے لیے ہے کہ اگر کوئی ووٹ ٹوٹے گا تو وہ اسی طرف سے

ٹوٹے گا....... ہمارا مقصد اس وقت کسی سیاسی تجزیے میں پڑنے کا نہیں بلکہ ارباب وطن اور اہل فکر کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا ہے کہ کینسر ناخواندگی کا ہو یا جسم کے کسی حصے کا' اس کی روک تھام کے لیے ہمیں ہر طرح کے جزوی اور فروعی اختلافات بھلا کر یک دل اور یک جان ہو جانا چاہیے۔

کہیں تو جا کے رکے یہ سفینۂ غم دل!

◆◆◆

لیپ کا سال

تین دن ستمبر کے

اپریل جون نومبر کے

باقی سب کے اکتیس

فروری کے اٹھائیس

لیپ کا سال آئے

فروی میں ایک دن بڑھائے

ہمارے بچپن میں یہ حساب سکولوں میں ایک گیت کی شکل میں بچوں کو یاد کرایا جاتا تھا اب اسے دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ عجب اگر کل کو نثری نظمیں بھی کمپوز ہو کر گائی جانے لگیں!

لیپ کے سال میں ۲۹ فروری کو پیدا ہونے والوں کو سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ وہ احباب کو ہر سالگرہ پر تحفہ دیتے ہیں جبکہ انہیں وصولی کے لیے چار سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ایک صاحب ہمسائے کی تیسری بیوی کی تدفین سے فارغ ہو کر آئے تو بہت بجھے بجھے سے تھے۔ بیوی نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ''کتنے افسوس کی بات ہے میں اس کی تین بیویوں کے جنازوں میں شرکت کر چکا ہوں مگر ہم نے اسے ایک بار بھی یہ قرض اتارنے کا موقع نہیں دیا۔''

اب ہمارے اور اکیسویں صدی کے درمیان صرف ایک لیپ کا سال باقی رہ گیا ہے جو ۲۰۰۰ء میں آئے گا یعنی آج سے ٹھیک چار سال بعد........ یہ بات ان معاشروں کے لیے یقیناً بہت اہم اور بامقصد ہے جو ان چار سالوں میں کچھ کرنے کا ارادہ اور اہلیت رکھتے ہیں لیکن بہت سے معاشرے ایسے بھی ہیں جنہیں ان شب و روز و مہ و سال کے آنے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑتا جیسے بعض دیواروں پر کئی کئی سال پرانے کیلنڈر لٹکے رہتے ہیں اور کوئی انہیں اتارنے یا بدلنے کی زحمت نہیں کرتا۔

مولانا حالی نے کہا تھا۔

مدرسے میں دہر کے روبر قفا بیٹھے تھے ہم
بس اٹھے ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

کسی عجیب بات ہے کہ حالی جیسا عملی اور اصلاح پسند شاعر تو دہر کے مدرسے میں دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھے رہنے کا منظر کھینچتا ہے اور اس کا ایک مرتے ہوئے معاشرے میں زندگی گزارنے والا استاد اسی دہر کے مدرسے کے بارے میں یوں گویا ہوتا ہے۔

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں

لیکن یہ دونوں تو پرانے وقتوں کے ''ان پڑھ اور رجعت پسند'' لوگ تھے کہ انہیں نہ تو کنکارڈ میں بیٹھنا نصیب تھا اور نہ یہ فیکس، سیٹلائٹ اور ہائیڈروجن بم سے آشنا تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کل کا حریت پسند آج کا بنیاد پرست کیسے بنتا ہے اور دو ایک ہی طرح کے ایٹمی دھماکاوں میں سے ایک جائز اور دوسرا ناجائز کیسے ہو جاتا ہے۔

لیپ کے سال کا یہ اضافی دن بظاہر گریگورین یا عیسوی کیلنڈ کو راہ راست پر رکھنے کا ایک طریقہ ہے مگر غور کیا جائے تو اس کے عجیب عجیب معانی ذہن میں پھلجھڑیوں کی طرح چھوٹنے لگتے ہیں۔

''مگر ایک موڑ کے فرق سے
ترے ہاتھ سے مرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے، اسے کاٹتے
مرا سارا وقت نکل گیا''

غلط کاٹے ہوئے موڑ کے نتیجے میں تو یہ صورتحال سمجھ میں آتی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری قوم تاریخ کے سفر میں ایک صحیح موڑ مڑنے کے باوجود گزشتہ نصف صدی سے ناسخ کے اس شعر کی تصویر بنی ہوئی ہے کہ

ہر پھر کے دائرے میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار، پاؤں میں!

ہمارے ساتھ کی' بلکہ ہم سے کم عمر قومیں کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ہمیں اپنے ملک کے حل طلب مسائل کا شاز' ان کی ترجیحات اور پروگرام ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے وہ لوگ بتاتے ہیں جن کے نزدیک ہمارا ملک ایک منی مارکیٹ اور ہمارے لوگ اعداد کے ایک مجموعے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ جو اپنے ملکوں میں ممنوع قرار دی جائنے والی دوائیوں کو ہمارے بازاروں اور ہسپتالوں میں دگنے تگنے داموں پر فروخت کرتے ہیں اور غربت' جہالت اور بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کو جمہوریت کی چوہے مار گولیوں سے مرنے کا راستے دکھاتے ہیں اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد ہمارے ہاتھوں میں الیکشن کا جھنجھنا تھما کر ہمیں اس طرح بہلاتے ہیں جیسے قربانی سے پہلے بکروں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ سو ایسے میں یہ لیپ کے سال کا فاضل دن بھی منیر نیازی کے لفظوں میں ''اج دا دن وی ایویں ای لنگیا'' کی تصویر بن کر گزر جائے گا کیونکہ ہماری حالت تو کچھ یوں ہے کہ:

ہنر مندوں کا ثانی ڈھونڈنا از بسکہ مشکل ہے
مگر اس شہر کی مشاکل زمانے سے انوکھی ہے
یہاں تو بے ہنر لوگوں کا بھی ثانی نہیں ملتا!

◆◆◆

سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے

اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش اگر شعوری سطح پر کی جائے اور اس کا مقصد محض یہیں تک ہو تو بعض اوقات اس کی نوعیت سرکس کے ان مسخروں کی احمقانہ حرکات سے مل جاتی ہے جو مختلف آئیٹموں کے درمیان وقت گزارنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے ملک' کلچر' معاشرے یا نیک نامی کے خلاف کی گئی غلط' مبالغہ آمیز' متعصبانہ یا ہتک انگیز باتوں کو نہ صرف آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیتے ہیں بلکہ انہیں دوہرا دوہرا کر ایک ایسی آزاد خیالی اور انصاف پسندی کا نام دیتے ہیں جس کے لیے زیادہ مناسب ترکیب ''احساس کمتری'' ہے۔

ابھی پچھلے دنوں شارجہ میں پاکستانی ٹیم کی جیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹونی گریگ اور روی شاستری نے امپائروں کے فیصلوں پر جو جو اور جس جس طرح سے تنقید کی اور ان کے بارے میں جیسے قابل اعتراض ریمارک دیئے انہیں براہ راست توہین عدالت کہا جاسکتا ہے جس کے لیے متعلقہ امپائر ان سے باقاعدہ تاوان اور معافی کا تقاضا کر سکتے ہیں کہ اس سے ان کا انصاف' کردار کی سالمیت اور عزت نفس نہ صرف مجروح ہوتے ہیں بلکہ کمنٹری اور تبصری کرنے والوں کی پیشہ ورانہ بددیانتی بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ جب یہ طے ہے کہ امپائر کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوتا ہے اور وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں جس نتیجے پر پہنچتا ہے اسے اس کی دیانت اور پیشہ ورانہ مہارت کا اظہار سمجھنا چاہیے تو پھر ایسے تبصروں کی گنجائش کا کیا محل ہے جس میں براہ راست اس کے انہی دو پہلوؤں کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو یہی لوگ کسی بیٹسمین یا باؤلر کے امپائر کے فیصلے سے متعلق چند لمحوں کے ردعمل یا اظہار ناراضگی کو بنیاد بنا کر اس میچ ریفری' جیوری یا متعلقہ کرکٹ بورڈ کے ذریعے سزا دلوانے کے حق میں تقریریں کرتے ہیں اور پریس میں تحریری طور پر یا گراؤنڈ میں نصب لاؤڈ سپیکروں پر کھلاڑیوں سے برسر عام معافی منگواتے ہیں اور دوسری طرف خود اس امپائر کے فیصلوں پر ایسے لفظوں میں تنقید کرتے ہیں جنہیں باسانی گالی کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور ستم کی بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر کھلیوں کے مبصران کی ان باتوں کو نہ صرف اچھالتے ہیں بلکہ بغیر سوچے سمجھے ان کی تائید کر کے یا ان کا ذکر شہ سرخیوں میں کر کے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ جھوٹ سچ اور سچ جھوٹ بن جاتا ہے۔

اس امپائر کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا جو گراؤنڈ چھوڑ کر ایک ایسے تماشائی کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا جو اس کے ہر فیصلے کے خلاف

بلند آواز میں تنقید کر رہا تھا۔ جب متعلقہ تماشائی نے امپائر سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''میں یہاں اس لیے آ کر بیٹھا ہوں کہ غالباً یہاں سے میدان میں رونما ہونے والے واقعات زیادہ صاف نظر آتے ہیں۔''

یہ ہمارا احساس کمتری نہیں تو اور کیا ہے کہ ۱۹۵۵ء میں ایم سی سی کی ٹیم کے گورے کھلاڑی ہمارے قومی امپائر کو اٹھا کر ٹھنڈے پانی کی ٹب میں پھینک دیتے ہیں' مائک گیٹنگ امپائر شکور رانا کو سرعام برا بھلا کہتا ہے' مائیک اتھرٹن پتلون کی جیب میں مٹی ڈال کر پھرتا ہے اور انگریز باؤلر لیور اپنے بالوں میں گیند چمکانے کے لیے غیر قانونی پالش محفوظ کر کے میدان میں آتا ہے تو یہ سب باتیں کھیل کا حصہ اور قابل معافی ٹھہرتی ہیں۔ امپائر ڈیوڈ کاسٹ کے تقرر پر پاکستانی ٹیم منیجر کے تحریری اعتراض کے باوجود اسے نہ صرف ہر بار دو دو میچ دیئے جاتے ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی سمجھایا جاتا ہے کہ امپائر کی دیانت پر شک کرنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں لیکن جب ٹونی گریگ صاحب ایک اسان میں چار بار غیر جانبدار امپائر کے فیصلوں کو غلط' ذلت آمیز' افسوسناک اور متعصبانہ قرار دیتے ہیں تو بجائے ان کا منہ بند کرنے کے ہمارے احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگ ان کی تائید میں سر ہلانے لگ جاتے ہیں۔

ایل بی ڈبلیو کرکٹ کے کھیل میں دیا جانے والا ایک ایسا فیصلہ ہے جو وکٹ کیپر کے کیچ اور بیٹ پیڈ کیچ سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ٹی وی کیمروں نے رن آؤٹ اور سٹمپ کے فیصلوں کو تو آسان بنا دیا ہے مگر مندرجہ بالا تینوں فیصلے امپائر نے ایک یا دو سیکنڈ کے اندر اندر کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے پاس نہ تو گرافکس کے ذریعے الٹے سیدھے نقشے بنانے کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی وہ قینچی کی طرح چلنے والی زبان جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ بیٹسمین کے پیڈوں پر لگنے والا بال وکٹوں کے علاوہ اور کہاں کہاں جا سکتا تھا!

ایک کمنٹیٹر نے وقار یونس کے ایک بال کو وکٹ سے تقریباً آٹھ فٹ کے فاصلہ پر سٹاپ فریم کرنے کے بعد یہ بتایا کہ چونکہ پہلے دو فٹ کے دوران اس بات نے تین انچ کی بلندی حاصل کی ہے لہٰذا حساب کی رو سے اگلے چھ فٹ میں اسے مزید نو انچ بلند ہونا چاہیے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بال وکٹوں میں لگنے کے بجائے وکٹ کیپر کے کندھے پر لگنا تھا۔ یہ کندھے تک تو ہم نے بال کو روکا ہے ورنہ انہوں نے جو نقشہ بنایا تھا اس کے مطابق بال کو وکٹ کیپر کے سر سے بھی اوپر نکل جانا چاہیے تھا۔

ہمارے خیال میں ہمارا یہی احساس کمتری ہے جس نے دنیا میں ہمیں کہیں سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا اور ہم یو این او' ورلڈ بینک' آئی ایم ایف' امریکہ اور دیگر طاقت کے مراکز میں ہونے والی تمام غیر قانونی کارروائیوں کے سامنے نہ صرف سر جھکا دیتے ہیں بلکہ الثاان کی تائید میں اپنے یا اپنی کامیابیوں کے اندر ایسے نقائص ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں جن کا یا تو سرے سے کوئی وجود نہیں ہوتا یا پھر ان میں اگر کوئی جزوی صداقت ہو تو بھی' کم از کم چوروں کے اس گروہ کو اس پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہماری طرف سے

ایسی ہی تنقید کو وہ کبھی بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے۔

جب کوئی قوم یا فرد اپنی عزت اور حقوق کی خود حفاظت نہیں کرتے تو پھر انہیں دنیا کی نظروں میں تماشا بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

◆◆◆

اسلام آباد کی ایک سڑک

یوں تو اسلام آباد کی ہر سڑک ہی اپنی جگہ پر منتخب اور بے مثال ہے کہ یہ پاکستان کا سب سے خوبصورت' جدید' باوسائل اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے بنایا اور بسایا گیا شہر ہے لیکن دیکھا جائے تو کانسٹی ٹیوشن ایونیو کی بات ہی کچھ اور ہے۔ جس عمارت پر نگاہ ڈالیے آنکھ جھپک جھپک جاتی ہے۔ ان کی اندرونی اور بیرونی فضا پر ایک ایسا طمطراق چھایا رہتا ہے جس کے مقابلے میں ہماری ممدوحہ ملکہ برطانیہ کا بکنگھم پیلس اور نیو ورلڈ آرڈر کے مدار المہام بل کلنٹن کا وائٹ ہاؤس بھی بازیچہ اطفال نظر آتے ہیں۔ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے اس بات کا گمان بھی نہیں گزرتا کہ سامنے نظر آنے والی مارگلہ کی پہاڑیوں کے پیچھے جو پاکستان آباد ہے اس میں کتنی غربت' کتنی جہالت' اور کتنی بے بسی اور ڈوبی تاریکی' روشنی کی ایک کرن کے انتظار میں گہری سے گہری ہوتی چلی جارہی ہے۔

صاحبان اقتدار کے یہ ایوان' جو بھلے وقتوں میں محل سرائے کہلاتے تھے اب ''محل'' اور ''سرائے'' دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں کہ یہاں لوگ محلات کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز تو ہوتے ہیں مگر سرائے کی طرح یہاں رات دن آنا جانا بھی لگا رہتا ہے۔ دروغ برگردن راوی ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس سڑک پر واقع صرف دو عمارتوں پر اٹھنے والا خرچ وطن عزیز کی تعلیم اور سائنس کے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔

یہ بھی شنید ہے کہ حال ہی میں مکمل ہونے والے کنونشن سنٹر (جسے بعض دل جلے کرپشن سنٹر بھی پکارتے ہیں) کی صرف دیکھ بھال ہی کا سالانہ خرچ چھ کروڑ روپے ہے۔ ظاہر ہے ان ٹھوس شواہد کی موجودگی میں پاکستان کو غریب ملک کہنے والوں کے منہ آپ سے آپ بند ہو جانے چاہئیں کہ جو قوم اس طرح کی لگژری اتنی آسانی سے افورڈ کرسکتی ہے اسے کون غریب کہہ سکتا ہے۔

عمارتیں کسی قوم کے فن تعمیر' تہذیبی ارتقاء اور تاریخی ورثے کی نمائندہ ہوتی ہیں لیکن جہاں تک سرکاری کام اور ان سے متعلق عمارتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں یہ ایک طے شدہ فارمولا ہے کہ ان کو سادہ' پروقار' فنکشنل اور آسان رسائی کی حامل ہونا چاہیے۔ ان میں بڑی بڑی آرائشی بالکونیوں' منقش در و دیوار' غیر ضروری تعمیرات اور درباری انداز کے ساز و سامان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہم نے بچشم خود کافر فرنگیوں کے اعلیٰ سرکاری دفاتر میں بڑے بڑے افسر کو چھوٹے چھوٹے کمروں میں بیٹھے دیکھا ہے جہاں عام طور پر وہ اپنے اور مہمانوں کے لیے کافی بھی خود ہی اٹھ کر بناتے ہیں' یہ اور بات ہے کہ وہاں مہمانوں سے مراد صرف سرکاری کام

سے آنے والے لوگ ہوتے ہیں (ہمارے یہاں کی طرح دفتروں کو گھر کا ڈرائنگ روم نہیں بنایا جاتا) ان لوگوں میں ایک اور برائی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اور آپ کے وقت کی یکساں طور پر عزت کرتے ہیں اور حتی الامکان اپنے کام کو آسان' بروقت اور بامعنی انداز میں سرانجام دیتے ہیں۔

اسلامی' معاشرتی نظام میں سرکاری عہدیداروں اور حکام کو بنیادی طور پر خادم عوام کا درجہ دیا جاتا ہے کہ وہ مظلوموں کی دادرسی اور محرموں کی حاجت روائی کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف اور زندگی کے انتظامی مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کے لیے اپنی صلاحتیوں کا بھرپور اور بے غرض استعمال کریں تا کہ معاشرہ اپنے تمام تر تخلیقی امکانات سے استفادہ کر سکے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ملوکیت کے غلبے اور عہد زوال میں پیدا ہونے والی مختلف قباحتوں کے باعث ایک ایسا نظام رائج ہو گیا ہے جو اسلام کی آڑ میں کچھ خاص نوع کے مسلمانوں کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلام آباد کے ان ایوانوں میں بھی ابھی ت ایک ایسی مردہ اور غیر اسلامی روایت سانس لے رہی ہے جسے دفنائے ہوئے بعض معاشروں کو اب کم وبیش تین صدیاں ہو چلی ہیں۔ یہ نظم ممکن ہے پہلی نظر میں زیادہ تیز اور جارحانہ لگے مگر ہم نے اس میں جن نہ پوری ہونے والی امیدوں اور جس مسلسل ملنے والی مایوسی کا ذکر کیا ہے وہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت لہجے کی متقاضی تھی۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اسلام آباد کی یہ سڑک اس نظم کا بنیادی محترک تو یقیناً ہے مگر اس کی بنیاس میں پاکستان کی وہ پوری تاریخ شامل ہے جس میں عوام کے نمائندوں اور خادموں نے عوام کو بھیڑوں اور اپنے آپ کو رکھوالوں کی حثیت دیے رکھی ہے۔

بلند و بالا' وسیع و عریض' پر ہیبت
یہ سنگ و خشت تراشیدہ سے بنے ایواں
یہ جگمگاتی ہوئی کھڑکیوں کے رنگ رواں
وہ بت کدے ہیں جہاں
ہر اک غرض کے لیے ایک دیوتا ہے الگ
سب اپنی اپنی ''مہارت'' میں مختلف ہیں مگر

ہے سب کی ایک سی صورت، ہے سب کی ایک زباں
رائے خلق خدا سب ہیں یک دل و یکساں!
جو کوئی غور سے دیکھے عجب تماشے ہیں
کسی کے کام نہ آئیں یہ وہ دلاسے ہیں
یہ لوگ پانی میں رکھے ہوئے بتاشے ہیں
یہیں پہ بٹتی ہے امن و سکون کی دولت
یہی سچاعت وصدق وصفا کے مکتب ہیں
یہیں پہ رہتا ہے اہل دعا کا مستقبل
یہیں ہے عدل کی کرسی، یہیں مناصب ہیں
یہاں زمیں کا سرا آسمان سے ملتا ہے
سوائے خیر کے، سب کچھ یہاں سے ملتا ہے

◆◆◆

ایک نئی دیوارگریہ

صیہونیت (Zionism) کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ یہودی خدا کے منتخب بندے ہیں اور یوں انہیں باقی خلق خدا پر ایک ایسی فوقیت حاصل ہے جس کا فیصلہ عرشوں پر ہو چکا ہے اور یہ کہ ان کی فضیلت کی گواہی تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ نسلی برتری کا یہ خناس انسانی تاریخ میں نیا نہیں، کبھی یہ آریاؤں کے اس تفاخر کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے ہندوستان کے قدیم اور مقامی باشندوں کو "شودر" بنا ڈالا اور کبھی Blue Blood کے اس عظیم خبط کی صورت میں، جس کی ایک نمایاں مثال انگلستان کے سٹورٹ بادشاہوں کا Divine Right of the Kings تھا۔ ماضی قریب میں جنوبی افریقہ کی نسلی تفریق پر مبنی پالیسی Aparthied بھی اسی البم کی ایک تصویر ہے۔

اطہر رضوی صاحب نے اپنی کتاب "خدا کے منتخب بندے" میں بہت محنت، تحقیق اور عالمانہ غیر جانبداری سے یہودی قوم کے اس فلسفے کی کارفرمائیوں کا احوال لکھا ہے اور تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے تناظر میں بھی بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جن کی طرف اشارہ کرنا بھی ایک طرح سے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ دو ہزار برس میں دنیا کے ہر حصے میں تاریخ کے ہر دور میں یہودیوں کو بے گھری، بے دخلی اور مسلسل مہاجرت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ بھی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ گذشتہ تقریباً دو سو برس میں دنیا میں ہونے والی علوم وفنون، سائنس، معاشیات اور تحقیق کی ترقی میں یہودیوں کا حصہ سب سے زیادہ اہم ہے اور بلاشبہ اس قوم نے بے شمار ایسے افراد پیدا کیے ہیں جنھیں تاریخ ساز انسانوں کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مگر ان اچھے اور نیک انسانوں کی اس انسانی خدمت اور اپنی صدیوں پر پھیلی ہوئی بے گھری (جس کے اصل ذمہ دار بھی وہ خود ہیں) کا جو تاوان بیسویں صدی کے آخر پچاس برسوں میں انہوں نے دنیا سے بالعموم اور فلسطینیوں سے بالخصوص لیا ہے اور کی بہیمیت، انسان کشی اور بربریت نے ان کی تاریخ کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور ان تمام بڑے آدمیوں کی روحوں کو شرمندہ کر دیا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی تمام عالم انسانی کے لیے سوچتے تھے۔

جہاں تک یہودی قوم کی اجتماعی صلاحیت کا تعلق ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس قوم کے لوگوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کی وجہ ان کا "خدا کے منتخب بندے" ہونے کے ناطے سے کچھ

خصوصی صلاحیتوں کا پیدائشی طور پر حامل ہونا ہے یا یہ کہ جینیات (Genetics) کے حوالے سے ان میں کچھ غیر معمولی خواص پائے جاتے ہیں (جس کا شبہ مشہور مورخ ٹائن بی کی کچھ تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دوصدیوں کو نکال کر گذشتہ دو ہزار سال میں ان کی مجموعی کارکردگی کیا ہے.......؟ اور تاریخ عالم میں ان کی اس ''فطری برتری'' کا کوئی واضح ثبوت ملتا ہے یا نہیں.......؟

مشہور فلسفی ژاں پال سارترے نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کی طرف سے یہودیوں پر ڈھائے گئے مظالم کو ان کے لیے ''نعمت'' قرار دیا ہے یعنی آج یہودی قوم اور اسرائیل جس غیر معمولی قوت کے حامل ہیں اس کا ٹیک آف پوئنٹ وہی جرمن کیمپ بنے' جو بظاہر ان کے مقتل تھے۔ اسی تخریب کے ردعمل' بازگشت اور پروپیگنڈے کی آڑ میں میڈیا کی ابھرتی اور بڑھتی ہوئی طاقت کی مدد سے یہودی لابی نے دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ایسا ڈھنڈورا پیٹا اور یورپی ذہن کو ایسی دفاعی اور معذرت خواہانہ پوزیشن میں لا کھڑا کیا کہ وہ لوگ نہ صرف ان کی چیرہ دستیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ ہر عالمی پلیٹ فارم پر اسرائیل کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس کی دامے' درمے' قدمے' سخنے مکمل مدد اور حمایت بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔

یہودی لابی کی کاروائیوں' طریقہ کار اور امریکہ حکومت پر گرفت کے حوالے سے اطہر رضوی صاحب نے بڑے اہم خیال انگیز اور مبنی برحقائق دلائل وشواہد کے ساتھ ایسی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں یہودی میڈیا اپنی تمام تر قوت کے باوجود نہیں دبا سکا۔ خود یہودی کمیونٹی کے اندر اہل نظر' صاحب دل اور انصاف پسند لوگوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو شروع سے اپنی قوم کی ان انسان کش پالیسیوں کے خلاف کھل کر ردعمل کا اظہار کرتا رہا ہے اور آج بھی اسرائیل کے اندر اپنی حکومت کی ان توسیع پسندانہ اور ظالمانہ کاروائیوں کے خلاف احتجاج کی ایک طاقتور لہر موجود ہے جو شیرون کو ''بیروت کا قصائی'' اور بیگن اور اس کے ہمنواؤں کو یہودی قوم کے لیے رسوائی کا داغ سمجھتے اور کہتے ہیں۔

اطہر رضوی صاحب کی اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہمیں ان بہت سے حقائق کا علم ہوتا ہے جن کی بنیاد پر یہودی اس وقت ایک بہت محدود اقلیت ہونے کے باوجود دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور اسرائیل ایک چھوٹا سا ملک ہونے کے باوجود عسکری صلاحیت کے حوالے سے دنیا کے پہلے دس ملکوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ اسرائیل کے قیام' اس کے پس منظر اور اس عالمی سازش کی تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے نزدیکی ہمسایوں' عرب ممالک اور مسلمان برادری کے ملکوں کو ایسے مسائل میں مبتلا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندرونی تضادات اور علاقائی معاملات میں ہی الجھے رہیں اور یوں مل بیٹھ کر اس خطرے کے سدباب کے لیے کوئی

مشترکہ کاروائی نہ کرسکیں جوان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اور جس کا ایک درس عبرت اپنے ہی وطن کی زمین سے فسلطنی عوام کی جلاوطنی' بے کسی اور دربدری ہے جو اپنی شدت اور پھیلاؤ میں یہودیوں پر ٹوٹنے والے ان مصائب سے کہیں زیادہ ہے جن کی آڑ لے کر گذشتہ نصف صدی سے ساری دنیا کو بلیک میل کیا جارہا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں اور عیساؤں کے مابین جاری تاریخی جھگڑے Anti Semitism کو کس مہارت اور چالاکی سے ایک استحصالی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور مغرب کے لبرل اور آزاد ذہن کو ایک مخصوص پروپیگنڈے کے تحت اتنا مفلوم کردیا گیا ہے کہ صابرہ اور شتیلہ کیمپوں کا قتل عام تو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی فوٹو کاپیوں میں بے معنی لفظوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے اور قاتلوں کو عالمی امن کے ٹھیکیدار' امریکہ کا صدر ریگن' ہار پہنانے اور مبارکباد دینے کے لیے خود چل کر اس مقتل میں جاتا ہے جہاں چاروں طرف بے گناہ مقتولوں کی چیخیں دربدر پھر رہی ہیں اور پھر اس کی بالواسطہ تائید یوپ سے بھی حاصل کرلی جاتی ہے اور ساری یورپی دنیا امریکہ کی سربراہی میں اسرائیلی حکومت اور سیاست پر قابض قاتلوں کے اس گروہ کی مدد اور حمایت کے لیے اس طرح صف آراء ہوجاتی ہے جیسے یہ لوگ کوئی بہت نیک کام کررہے ہوں اور دوسری طرف یہی لوگ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے عجیب وغریب الزمات عائد کرکے پوری مسلمان دنیا سے اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا حق چھیننے پر تلے بیٹھے ہیں۔

اطہر رضوی صاحب' اہل دل بھی ہیں اور صاحب مطالعہ بھی' اور پھر انہوں نے اس دنیا کے سو سے زیادہ ممالک کی سیاحت بھی کی ہے' ان کی تحریریں اور رویہ سراسر غیر جانبدار اور علمی ہے۔ ان سب خواص نے مل جل کر اس کتاب کو لائق مطالعہ ہی نہیں بنایا بلکہ ایک ایسی اہم دستاویز کی شکل دے دی ہے جو اہل نظر کے لیے مقام فکر اور صاحبان بصیرت کے لیے ایک اشارہ ہے۔

◆◆◆

کتاب اور ڈاکو

ہمارے دوست افتخار احمد بٹ کاروبار کے سلسلے میں چند برس نائیجیریا کے شہر لاگوس میں رہے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ وہاں ڈاکے اتنی کثرت سے پڑتے تھے کہ لوگوں نے ان کا نوٹس لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ڈاکہ پڑتا اور ڈاکوؤں کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد موقع واردات پر دوبارہ معمول کی کاروائی شروع ہو جاتی۔ایسے مواقع پر پولیس کو بھی بہت کم تکلیف دی جاتی تھی کیونکہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح وہاں کی پولیس بھی نعرہ عوام کی مدد کا لگاتی ہے اور ساجھے داری چوروں سے کرتی ہے۔

پنجاب کے کسی دیہات میں مال مسروقہ کی رپورٹ لکھی جا رہی تھی' پولیس کے محرر نے جب فہرست مکمل کی تو اس میں ایک بھینس کی چوری کا اندراج بھی تھا' اچانک محرر کی نظر صحن کے کونے میں جگالی کرتی ہوئی بھینس پر پڑی' اس نے غصے سے مدعی کی طرف دیکھا اور کہا۔

اوئے بھینس تو وہ سامنے موجود ہے اور تم نے رپورٹ میں لکھایا ہے کہ یہ چوری ہو گئی ہے!''

ستم ظریف مدعی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''حضور باقی سامان چور لے گئے ہیں یہ آپ کی تفتیش کی نذر ہو جائے گی تو میری طرف سے تو گئی نا۔''

نائیجیریا کے ایک ڈاکے کے حوالے سے افتخار بٹ نے ہمیں ایک بڑے مزے کا واقعہ سنایا۔ ہوا یوں کہ ڈاکے سے چند منٹ قبل ان کا ایک ساتھی بتا رہا تھا کہ اس کی شادی کی انگوٹھی انگلی میں پھنس گئی ہے اور باوجود ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے' نکل نہیں سکی سو آج دفتر کے بعد وہ ہسپتال جا رہا ہے جہاں اسے مخصوص اوزاروں سے کاٹ کر علیحدہ کیا جائے گا ڈاکہ پڑا' ڈاکوؤں نے سامان اور نقدی جمع کی تھوڑی بہت مار پیٹ بھی کی' جب وہ جانے لگے تو اتفاق سے ایک ڈاکو کی نظر متعلقہ انگوٹھی پر پڑ گئی اس نے ریوالور سیدھا کیا اور گرج کر کہا۔

''یہ انگوٹھی اتار دو'' افتخار بٹ کا بیان ہے کہ ان کے دوست نے انگوٹھی اس طرح اتاری جیسے مکھن سے بال نکالتے ہیں۔

اسی حوالے سے ایک اور لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ایک گھر میں چور آ گیا' خاتون خانہ خاصی فربہ اندام تھی اس نے چور کو دھکا دے کر نیچے گرا اور خود اس کے سینے پر بیٹھ کر خاوند سے کہا کہ میں اسے قابو رکھتی ہوں تم جلدی سے پولیس کو بلا لاؤ' خاوند تین چار منٹ تک ایک

کمرے سے دوسرے کمرے میں آتا جاتا رہا' بیوی نے غصے سے کہا جاتے کیوں نہیں!!

شوہر بولا ''جوتا ڈھونڈ رہا ہوں مل نہیں رہا۔''

چور نے خاتون خانہ کے بوجھ سے کراہتے ہوئے کہا ''یار تم میری جوتی پہن جاؤ''

یہ سارے واقعہ نما لطیفے یا لطیفہ نما واقعے ہمیں اس ڈاکے کے حوالے سے یاد آئے ہیں جو چند دن قبل کتابوں کے ایک مشہور ناشر سنگ میل پبلی کیشنز کے شوروم پر پڑا اور جس کے نتیجے میں ڈاکو اسلحے کے زور پر نوے ہزار روپے نقد اور دو عدد موبائل فون لوٹ کر لے گئے۔ دوکان میں موجود افراد نے بتایا کہ ڈاکو صورت اور لباس سے طالب علم لگتے تھے اور وقوعے سے تقریباً پندرہ بیس منٹ پہلے باری باری آ کر مختلف کتابوں کے بارے میں استفسار کرتے رہے تھے۔ خیال تھا کہ شاید وہ محدود رقم کے باعث' کتابوں کی خریداری کے بارے میں اپنی ترجیحات طے کرنے کے سلسلے میں مشورہ کر رہے تھے۔ (جیسا کہ عام طور پر کم وسائل والے مگر کتابوں کے شوقین حضرات کیا کرتے ہیں) مگر اب کے وہ آئے تو ان کے ہاتھوں میں موزر اور پستول وغیرہ تھے اور آنکھوں میں وہی وحشیانہ چمک تھی جو اپنی بات کے جواب میں انکار برداشت نہیں کرتی۔ سو دوکان میں موجود عملے کو ہیڈز اپ کرانے اور انہیں ایک کمرے میں جمع کرنے کے بعد انہوں نے اطمینان سے ساری نقدی سمیٹی' موبائل فون اٹھائے اور دھمکیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اطلاع ملنے پر ایس ایس پی لاہور ذوالفقار چیمہ خود آئے ساری بات سنی اور متعلقہ تھانے کے لوگوں کو تاکید کی کہ یہ علم و ادب کی خدمت کرنے والے لوگ ہیں اور اس گئے گزرے زمانے میں بھی کتاب کی ترویج و اشاعت کے شوق میں مبتلا ہیں سو ان کے کیس کو اولیت دو اور ڈاکوؤں کو جلد از جلد گرفتار کرو۔

چیمہ صاحب کے جانے کے بعد پولیس نے جو تفتیش کی اس کا لب لباب یہ ہے کہ اگر آپ ڈاکوؤں کے نام پتے اور حلیے وغیرہ سے ہمیں آگاہ کر دیں تو ہم کوشش کریں گے کہ کسی طرح انہیں پکڑا جا سکے۔ جب انہیں دو تین دفعہ یاددہانی کرائی گئی تو وہ فیض صاحب کے اس مصرعے کی تصویر بن گئے کہ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

موبائل فون کمپنی کی وساطت سے مسروقہ فون سے ہونے والی ایک کال کا نمبر اور متعلقہ گھر کا پتہ چل گیا مگر دو دن بعد پولیس والوں نے اطلاع دی کہ ہم نے ان صاحب سے مکمل تفتیش کر لی ہے وہ شریف آدمی ہیں اور آپ مہربانی فرما کر آئندہ انہیں تنگ نہ کریں۔

کتابوں کے حوالے سے چوری کا ذکر عام طور پر سرقے اور توارد کے زیرعنوان آیا کرتا تھا کہ شاعر حضرات ایک دوسرے پر اپنے مضامین اور خیالات اور بعض اوقات مصرعوں کے سرقے کا الزام عائد کیا کرتے تھے جس سے مدعا علیہ خواتین وحضرات (انکار نہ کرسکنے کی صورت میں) توارد کا بہانہ بنا کر جان چھڑایا کرتے تھے۔ نقاد اور محقق حضرات میں سے قینچی کے ماہر احباب بھی اپنے کار ہنر کے لیے کم وبیش اسی قسم کے حفاظتی اقدامات سے کام لیتے ہیں لیکن کتابوں کی دکان میں براہ راست اور باقاعدہ چوری بلکہ سینہ زوری کا یہ مظاہرہ ایک بالکل نیا سلسلہ ہے۔ ڈاکو حضرات اگر نقدی کے بجائے کتابیں وغیرہ اٹھا کر لے جاتے تو اس زیان میں کچھ سود کے پہلو نکل سکتے تھے۔ مثلاً

۱۔ ڈاکوؤں کا مطالعہ وسیع ہوسکتا تھا۔

۲۔ وہ آگے چل کر خود شاعر ادیب یا نقاد بننے کی طرف مائل ہوسکتے تھے۔

۳۔ اپنی ناپسندیدہ کتابیں واپس کرسکتے تھے

۴۔ اپنے پسندیدہ مصنفین کو اپنی خدمات مفت پیش کرسکتے تھے۔

۵۔ بھاری کتابیں اٹھانے کے بجائے وہ آئندہ واردات کے لیے کسی بہتر چیز کا انتخاب کرسکتے تھے۔

ہمیں امید ہے کہ اگر ان ڈاکو بھائیوں نے آئندہ چند دنوں میں کسی نیوز ایجنسی یا اخباری سٹال پر توجہ کی اور ان کی نظر ہمارے اس کالم پر بھی پڑ گئی تو یہ مظلوم ناشر اور محکمہ پولیس دونوں کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔

اقبال اور اکیسویں صدی

عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ' میری نواؤں کی تاب

یہ ''عالم نو'' اور ''فرنگ'' تو ممکن ہے بیسویں صدی ہی کے استعارے ہوں گے مگر جہاں تک ''پردہ تقدیر'' اور ''چہرہ افکار'' کا تعلق ہے' یہ ایک ایسے ''مستقبل'' سے رشتہ آرا ہیں جو اس کرہ ارض پر ابن آدم کی ہر نسل کے لیے ایک ہی جیسے معنی اور اہمیت رکھتے ہیں کہ ہر دور کے خواب' افکار میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور اپنی تعبیروں کے لیے پردہ تقدیر کے اٹھنے کے منتظر رہتے ہیں۔

گنبد نیلو فری' رنگ بدلتا ہے کیا
دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا!

یوں تو ہر بڑا شاعر ''عندلیب گلشن نا آفریدہ'' ہوتا ہے کہ اس کے ذہن کا ''زمان'' اس کے جسم کے ''زمان و مکان'' سے جدا' مختلف اور آگے ہوتا ہے۔ عام طور پر شعراء کے ہاں یہ فرق ایک تجریدی انداز اور صورت حال میں رونما ہوتا ہے لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری بیک وقت نہ صرف ماضی' حال اور مستقبل کے تینوں ایوانوں میں گونجتی ہے بلکہ وہ مستقبل میں رونما ہونے والے تغیرات کو بھی اتنی وضاحت' صراحت اور جزئیات کے ساتھ دیکھتے اور دکھاتے ہیں' جیسے یہ سب کچھ کسی گزرے ہوئے وقت کا قصہ ہو۔

اقبال کی آنکھیں تو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بند ہوگئیں لیکن ان کی رسائی آنے والے وقتوں تک کچھ ایسی تھی کہ آج اس صدی کے آخری برسوں میں بھی وہ ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے حالات و واقعات پر رواں تبصرہ کرتے نظر آرہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج سے ساٹھ ستر برس قبل کسی آدمی کو یہ منظر اس طرح نظر آتا ہوگا:

فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے

''فلسطینی عرب'' سے کیے گئے اس خطاب کو دیکھئے اور چند روز قبل اردن اور اسرائیل کی سرحد پر ہونے والی اس کانفرنس کو ذہن میں لایئے جسے ساری دنیا نے سی این این اور دوسرے ٹی وی چینلز پر براہ راست ملاحظہ کیا ہے۔ شاہ حسین اور یاسر عرفات کو تو چھوڑیئے' کیا آپ کو صدر کلنٹن کی رگ جاں ''پنجہ یہود'' میں تلملاتی نظر نہیں آئی؟ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہاں کسی میں بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں تھی کہ:

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟

اقبال نے کرہ ارض کی تقدیر بدلنے کا ایک امکان طہران کے عالم مشرق کے جنیوا بننے کی شکل میں بھی دیکھا تھا مگر اس منظر میں وہ رضا شاہ کی موجودگی سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کے ذہن میں روح شرق جس بدن کی تلاش میں سرگرداں تھی' اس کی نمود نہ انہیں مصطفی کمال پاشا میں نظر آتی تھی اور نہ رضا شاہ پہلوی میں کہ دونوں کے خواب اپنے اپنے وطن کی مٹی سے تو پھوٹتے تھے مگر ان کے چمن میں تصور ملت کی خوشبو کہیں بھی راستہ روکتی نظر نہ آتی تھی۔ اپنی نظم ''تخلیق'' میں وہ کہتے ہیں:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحر بے کراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سر زمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

آج' جبکہ دنیا اکیسویں صدی کے دہانے پر کھڑی ہے' زمین کا وہ نقشہ بری طرح تہہ و بالا ہو چکا ہے جو اقبال کی وفات کے وقت

تھا۔ لیگ آف نیشنز کے 40/45 ممالک اب پونے دو سو کے لگ بھگ ہو رہے ہیں۔ دنیا کی آبادی چھ ارب کو چھو رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی بڑی طاقتیں ایک قصہ پارینہ بن چکی ہیں اور روسی انقلاب اپنی بہار دکھا کر رخصت ہو چکا ہے، ایسے میں اقبال کی پیش گوئیاں پڑھتے ہیں تو عقل ورطۂ حیرت سے باہر نہیں نکل پاتی' یہ ان کی غیر معمولی بصیرت تھی؟ مطالعہ اور غور و فکر تھا؟ کوئی روحانی قوت تھی یا الہام! یا پھر ان سب کا مجموعہ!! کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں ہوتا۔ آج مغرب کے ذرائع ابلاغ ہمارے سامنے اکیسویں صدی کا جو تصور پیش کر رہے ہیں اور اس کے حوالے سے دنیا بھر کے معاشروں کو جس قسم کی تبدیلی کے عمل سے گزارنا چاہ رہے ہیں' اس میں بظاہر بہت زور دکھائی دیتا ہے۔ امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر جس کے آگے فی الوقت تیسری دنیا دم سادھے بیٹھی ہے ایک عفریت کی طرح جو طرف سے بڑھتا نظر آ رہا ہے لیکن جرمن فلسفی نطشے سے ماخوذ اقبال کے یہ دو اشعار جس طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ اس تصویر کا ایک اور ہی رخ ہے:

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ!
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ!

یہ اکیسویں صدی کی طرح کھلنے والا وہ پراسرار دروازہ ہے جو تیسری دنیا اور بالخصوص مسلم دنیا کے شب و روز سے بالکل ہٹ اور کٹ کر ایک صورت پذیری کے عمل میں مبتلا ہے' سو اس تماشے کو کچھ دیر کے لیے بھول کر ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال نے ہمارے لیے کس راستے کی نشاندہی کی تھی اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں! اقبال مستقبل میں جس عدالت' شجاعت اور صداقت کا سبق پڑھا کر ہمیں پھر سے قوموں کی امامت سونپنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ مکتب کہاں رہ گیا! سلطانی جمہور کا وہ زمانہ کدھر گم ہو گیا جس کے استقبال کی خاطر ہم نے ہر نقش کہن کو بغیر دیکھے مٹا دیا اور ایک پل کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ نئی تعمیر کے لیے صرف پرانی عمارتوں کو ڈھانا ہی ضروری نہیں ہوتا' اس کے کچھ اور بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ مغربی جمہوریت کے جس کمبل کو ہم نے اوڑھ رکھا ہے' نہ یہ ہمیں چھوڑتا ہے اور نہ ہی ہم اسے چھوڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اقبال کے ذہن میں جس اکیسویں صدی کا خاکہ تھا' اس تک پہنچنے کے لیے ہمیں بیسویں صدی کے ایوانوں سے سر اٹھا کر گزرنا تھا' یہ کیسے ہوا کہ ہم خاک پر پڑے رہ گئے اور یہ صدی ہمارے اوپر سے گزر گئی۔

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

◆◆◆

تماشائے اہل قلم دیکھتے ہیں

اٹھائیس نومبر سے تین دسمبر تک اسلام آباد میں اکادمی ادبیات نے ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کروائی جس میں سو سے زائد ممالک کے چار سو کے قریب ادیب' شاعر' دانشور' استاد' مترجم' یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز اور بیرون ملک مقیم منتخب پاکستانی ادیب اور احباب شامل ہوئے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے بھی کم وبیش ڈیڑھ دو سو لکھنے والوں کو مختلف حیثیتوں میں مدعو کیا گیا جن میں بقول برادرم عبدالقادر جونیجو کے ان کے صوبہ سندھ کے زکوٰۃ اور عشر کمیٹیوں اور بیت المال کے چیئرمین وغیرہ بھی شامل تھے۔

کسی بھی کام پر اعتراض کرنا' کیڑے نکالنا یا ڈالنا اور اس کے حوالے سے منتظمین پر اقربا پروری اور ڈنڈی مارنے کا الزام لگانا بہت آسان کام ہے کہ یہ سب چیزیں اب ہماری معاشرتی زندگی کے ہر شعبے کا لازمی حصہ بن چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان یا اس کی یہ کانفرنس بھی زندگی کے ہر شعبے کا لازمی حصہ بن چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان یا اس کی یہ کانفرنس بھی چونکہ اسی زمین اور اسی زمان سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس میں ان تمام ''اوصاف'' کا پایا جانا کم از کم ہمارے لیے قطعاً باعث حیرت نہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان الحاقی معاملات کی تعداد ہمارے اندازے اور توقع سے بہت کم تھی اور انتظام و انصرام کے حوالے سے بھی اکادمی کی کارکردگی اگر مثالی نہیں تو اطمینان بخش ضرور کہی جا سکتی ہے اور ایسے زمانے میں جب اسمبلیوں سے لے کر آلو کے بھاؤ تک کوئی بھی چیز اطمینان بخش نہ ہو اکادمی ادبیات کا اس اتنی بڑی اور انتظامی اعتبار سے بے حد مشکل کانفرنس کا اس کامیابی سے انعقاد کر لینا یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔

طبیعت کی ناسازی اور کچھ بے حد ضروری مصروفیات کے باعث ہم اس کانفرنس میں آخر تک موجود نہ رہ سکے اور ابتدائی دو دنوں کے چند سیشن اٹینڈ کر کے چلے آئے لیکن ہمارے سابقہ تجربے' حالیہ مشاہدے اور بعد کی رپورٹوں سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ کانفرنس جس اچھے طریقے سے شروع ہوئی تھی اسی طرح اختتام پذیر بھی ہوئی۔ فخر زمان اینڈ کمپنی نے کم از کم اتنا ضرور ثابت کر دیا ہے کہ اس کانفرنس پر اٹھنے والی چار کروڑ کی رقم آپس میں کھا پی کر برابر نہیں کی گئی۔ مندوبین کی تعداد' قیام وطعام کے انتظامات' معلوماتی کتابچے' خصوصی طور پر شائع ہونے والی کتابیں' مختلف اجلاسوں کا انعقاد اور ان سب چیزوں میں ایک مخصوص اور تسلی بخش معیار کو قائم

رکھنا یقیناً کوئی سستا یا آسان کام نہ تھا۔ افتخار عارف کی جگہ آنے والے ڈائریکٹر جنرل اور جدید افسانے کے ایک اہم نام مظہر الاسلام کے لیے یہ کانفرنس ایک امتحان کا درجہ رکھتی تھی جس میں وہ بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہوئے ہیں۔ پہلے دن کے اختتام پر وزیر تعلیم خورشید علی شاہ کے عشائیے پر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ خوشی سے باقاعدہ جھوم رہے تھے۔ اسی سرخوشی کے عالم میں انہوں نے وزیر موصوف سے ہمارا تعارف بھی کرایا اور بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ڈرامے ''وارث'' کا ذکر بھی کیا۔ اس پر شاہ صاحب جو ہم سے دو چار سال عمر میں بڑے ہی ہوں گے بڑے تپاک سے گلے ملتے ہوئے بولے۔

''کیوں نہیں سائیں' انہیں کون نہیں جانتا' ہم تو ان کے ڈرامے بچپن سے دیکھ رہے ہیں۔''

خورشید شاہ صاحب کے اس معصوم ریمارک پر زندگی میں پہلی بار ہمیں اندازہ ہوا کہ ملکہ ترنم نور جہاں اگر اس طرح کے جملوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتی ہیں تو ان کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہوگی!

اس عشائیے کی دو باتیں بہت دنوں تک یاد رہیں گی۔ ایک تو یہ کہ شاید پہلی بار کسی پانچ ستاروں والے ہوٹل میں کھانا بھی پانچ ستاروں والا پیش کیا گیا تھا۔ ایک وسیع پنڈال کے مختلف کونوں میں چاروں صوبوں کے روایتی کھانوں کے خوبصورت اور صاف ستھرے سٹال لگائے گئے تھے جہاں زیادہ تر ڈشیں مہمانوں کے سامنے تیار کی جا رہی تھیں اور ہر صوبے کے سٹال پر ایک سے ایک بہتر کانا موجود تھا۔ غیر ملکی مندوبین کے لیے یہ دعوت واقعی پاکستانی کلچر کے مختلف رنگوں کا ایک خوبصورت اور موثر امتزاج تھی جس کی انہوں نے زبان اور پیٹ دونوں طریقوں سے کھل کر داد دی۔

دوسری بات لوک موسیقی کی تال پر پاکستانی اور غیر ملکی ادیبوں کا وہ والہانہ رقص تھا جس کی ابتداء تو عبداللہ حسین' گل جی (آرٹس) اور پولینڈ کے ایک مندوب نے کی مگر تھوڑی دیر بعد رقاصوں اور تالی بجانے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ سازندے ان کے ہجوم میں گم ہو گئے اور صرف ڈھولک' باجے اور مغنی کی آواز ہی ان کی موجودگی کا پتہ دیتی رہی۔ غیر ملکی مندوبین کے ساتھ آخر تک جو لوکل خواتین و حضرات شامل رہے ان میں احمد فراز' ڈاکٹر عالیہ امام' حسن رضوی' حسن عباس رضا' سرفراز اقبال' تبسم کاشیری' اسد مفتی' ہر ادبی محفل کے مستقل سامع اظہار جعفری اور فخر زماں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کے چہرے اس وقت بھی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں لیکن اگر اس رات اس رقص سرخوشی پر کوئی انعام مقرر ہوتا تو ہمارا ووٹ عبداللہ حسین اور اس پولش مندوب کی طرف ہوتا جنہوں نے بالترتیب جھومنے اور دھمال ڈالنے میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ اہل قلم کی باہمی محبت اور یگانگت کا ایک ایسا خوبصورت مظاہرہ تھا جس کی خوشبو اگر عام ہو جائے تو یہ دنیا اپنی کئی بیماریوں سے نجات پا سکتی ہے۔

ابتدائی سیشن کی صدارت وزیر اعظم صاحبہ نے کی۔ اجلاس کے دوران ان کی والدہ محترمہ بھی تشریف لائیں اور سیدھا سٹیج پر جا کر اکادمی کے چیئرمین فخر زمان کی کرسی پر بیٹی کی طرف سے باقاعدہ پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئیں اور آخر تک اسی پوز میں بیٹھی رہیں۔ منتظمین نے بڑی مشکلوں سے سٹیج کے دائیں کونے پر فخر زماں کے کے لیے ایک کرسی کا انتظام کیا مگر انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے محترمہ وزیر اعظم کی تقریر کے دوران پھر سے اپنی نشست مطلوبہ جگہ پر رکھوانے کا انتظام کر لیے کہ آج کل تو لوگ ناجائز قبضے سے دستبردار نہیں ہوتے اور یہ تو ان کا پروٹوکول کے تحت جائز حق تھا۔

جہاں تک وزیر اعظم صاحبہ کی تقریر کا تعلق ہے اس پر بہت کچھ کہا جاچکا ہے ہم اس میں کوئی اضافہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں بس اتنا ہی عرض کریں گے کہ محترمہ نے اپنی تقریر کے ابتدائی چند منٹوں میں اپنے سامعین کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے جو بہت خوبصورت' معنی خیز' عمدہ اور پرتاثیر باتیں کی تھیں اگر ان پر ہی اکتفا کرتیں اور آگے چل کر اس اعلیٰ تر ذہنی سطح کی حامل محفل کو اپنا انتخابی جلسہ نہ بناتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

◆◆◆

کچھ تو باقی رہنے دیجئے

کھیل میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے اور ہار کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا اور مخالف ٹیم کو اس کی فتح پر مبارکباد دینا سپورٹس مین سپرٹ سمجھا جاتا ہے۔ سو سری لنکا سے ہارنے کے بعد اور ان دونوں کاموں سے فارغ ہو کر ہمارے کرکٹ کنٹرول بورڈ کے ارباب اقتدار اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ اب شارجہ کپ میں ہارنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔ موثر منصوبہ بندی کے تحت اس میں بھی وہ کامیاب رہے ہیں۔ ہمارے سکول کے زمانے کے دوست اور کرکٹ کے مبصر محمد صدیق کے تجزیئے کے مطابق ڈاکٹر عارف علی عباسی یہی دوائی جاری رکھیں گے کیونکہ وہ ''ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ'' پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ خود بھی اس کی ایک زندہ مثال بن کر گزشتہ پندرہ برس سے کرکٹ بورڈ سے چمٹے بلکہ لپٹے ہوئے ہیں۔

بورڈ کے نئے صدر ذوالفقار بخاری صاحب خاندانی آدمی ہیں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ فاروق لغاری صاحب نے انہیں کرکٹ کنٹرول بورڈ کا سربراہ بنا دیا ورنہ وہ انہیں کسی بنک' کارپوریشن یا پی آئی اے کا ڈائریکٹر وغیرہ بھی مقرر کر سکتے تھے کیونکہ ہمارے یہاں انتظامی معاملات کے حوالے سے جو ''قابلیت'' دیکھی جاتی ہے اس کا تعلق متعلقہ شعبے سے ہونا کبھی بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سو بخاری صاحب اگر اپنے کالج کے دنوں میں کرکٹ کے کھلاڑی نہ بھی رہے ہوتے تب بھی اس عہدے پر ان کی نامزدگی سو فیصد ملکی روایات کے مطابق قرار پاتی کہ صدر صاحب کی صوابدید بہرحال ہم آپ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہم تو صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کرکٹ جیسے مقبول عوام کھیل کے دو سب سے اعلیٰ انتظامی عہدیداروں میں سے اگر ایک کا تعلق بھی براہ راست اس کھیل سے ہوتا تو کم از کم قوم کو اپنے پہلے سے موجود مسائل کے ساتھ ساتھ اس اضافی فرسٹریشن اور دل زدگی سے نہ گزرنا پڑتا جس کا تحفہ اسے پچھلے دنوں پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں سری لنکا کی ٹیم سے پڑنے والی مار بجلی کے بل میں شامل اس سرچارج جیسی لگتی ہے جسے دیکھتے ہی دماغ کے اندر کئی روشن خلیے اچانک بجھ جاتے ہیں۔

کرکٹ سے ہمارا تعلق ''کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی'' جیسا ہی سہی لیکن اس کے معاملات سے ہم اتنی واقفیت ضرور رکھتے ہیں کہ ایک ٹیم میں شامل گیارہ افراد کی ایک ایسی فارمیشن بنا سکیں جو مخالف ٹیم کی ممکنہ صلاحیت کا بہادری' ذمہ داری اور کامیابی سے مقابلہ کر سکے۔ بورڈ کے عہدیداروں اور سلیکشن کمیٹی کے ممبران کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ اس کھیل میں ہار کا قوم کے مورال

پر کس قدر گہرا اور منفی اثر پڑتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے پاس خوش ہونے' فخر کرنے اور فتح کا نعرہ بلند کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو اس کے لیے یہ عام سا افتخار یا ایک لمحہ مسرت کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی شدت جاننے کے لیے کسی کا ماہر سماجیات ہونا ضروری نہیں۔

ہم یہ سیریز کیوں اور کیسے ہارے؟ اس پر بہت باتیں ہو چکیں بہت سی ہو رہی ہیں اور بہت سی آئندہ بھی ہوں گی لیکن س سے پہلے کہ ہم اس سلسلے میں اپنی معروضات پیش کریں ایک دو باتیں ایسی ہیں جن پر بات کرنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔

اب سے چند برس پہلے تک کرکٹ کی رننگ کمنٹری صرف ریڈیو پر ہوا کرتی تھی اور کھیل کے میدان میں ہونے والی کارروائی کے لیے ہمیں کمنٹیٹر کے بیان پر یقین کرنا پڑتا تھا لیکن جب سے کرکٹ میچ ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے ہیں ''ایمان بالغیب'' کی وہ صورتحال بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کمنٹیٹرز ماہرین اور مبصرین کا کام بھی مشکل سے مشکل تر ہونے لگا ہے۔ ٹی وی پر کھیل کو براہ راست دیکھنے کا ایک اور نقصان جوان حضرات کو ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اب لوگ ان کی باتوں کا وہ حصہ زیادہ غور سے سننے لگے ہیں جس کا تعلق کھیل کے میدان میں ہونے والے واقعات سے کم ہوتا ہے اور یوں ان کی زبان و بیان کی غلطیاں' اعداد و شمار کے گھپلے' غیر متعلق اور بے معنی باتیں' ذاتی تعصبات اور مجموعی کم فہمی اس بری طرح سے ایکسپوز ہوئی ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے اور قدیم بت گر گئے ہیں بلکہ بیشتر تازہ واردان بساط ہوائے دل کی اوقات بھی کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ سنا ہے کہ سابق کھلاڑیوں سے کنٹری کرانے کا نظریہ ماجد خان نے پیش کیا اور چونکہ ان کا تعلق ٹی وی کے شعبہ سپورٹس سے ہے اس لیے انہوں نے اپنی مخصوص پٹھانی ضد اور انتہا پسندی کے باعث اسے عملی شکل میں لاگو بھی کر دیا ہے' لیکن جس طرح ہمارے ملک میں مختلف اداروں کو قومیاتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا تھا کہ سرکاری شعبے میں انہیں کامیابی سے چلانے کے لیے مطلوبہ صلاحیت اور افرادی قوت ہے یا نہیں اسی طرح ماجد خان نے بھی یہ نہیں دیکھا کہ تسلیم عارف' نسیم الغنی' صادق محمد اور کچھ اور سابق کرکٹر اچھے کھلاڑی تو شاید ہوں مگر ان میں بولنے اور رائے دینے کی وہ مطلوبہ صلاحیت موجود نہیں ہے جس کا مظاہرہ آسٹریلیا اور انگلینڈ بلکہ ویسٹ انڈیز تک کے کرکٹر کمنٹیٹرز انتہائی کامیابی اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔

روانی' برجستگی' برموقع حوالے' ہلکی پھلکی دلچسپ باتیں اور ایک موثر بیانیہ انداز وہ بنیادی خوبیاں ہیں جو کسی کمنٹیٹر کے لیے بالخصوص اور مبصر کے لیے بالعموم لازمی سمجھی جاتی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ گنتی کے دو چار ناموں کو چھوڑ کر ہمارے سب کے سب کمنٹیٹر اور ماہرین اس قابل نہیں کہ انہیں ٹی وی اور ریڈیو پر دکھایا اور سنوایا جائے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کرکٹ کے انتظامی معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کی نیت ممکن ہے اچھی ہو مگر ان کے اعمال جو تصویر بنا رہے ہیں اسے ہرگز ہرگز قابل اطمینان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو بورڈ آٹھ مہینوں میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ سلیم ملک کو کس جرم کی پاداش میں کپتانی اور ٹیم سے نکالا گیا اور جس میں اتنا حوصلہ اور ایمانداری نہ ہو کہ اسی جرم میں نامزد کچھ اور کھلاڑیوں کی انکوائری کر سکے اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ آئندہ عالمی کپ میں اپنے اعزاز کے دفاع کے لیے ایک باقاعدہ منظم باصلاحیت اور صحیح ٹیم کھڑے کر سکتا ہے۔ ایک ایسا مفروضہ ہے جسے دیوانے کا خواب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اعجاز احمد سینئر کو ٹیم میں شامل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سلیم ملک کا ہم زلف ہے۔ اتنی کمزور بنیاد پر تو ہمارے پولیس والے بھی ملزموں کے لواحقین کو نہیں پکڑتے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے حلوائی حضرات چینی کی قیمت بڑھنے پر سموسے بھی مہنگے کر دیتے ہیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں کم و بیش پندرہ ابھرتے ہوئے اور چار پانچ ڈوبتے ہوئے کھلاڑیوں کو مختلف مواقع پر ٹیم میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ انہی جیسے کچھ اور کھلاڑیوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہم عارف علی عباسی ذوالفقار بخاری اور ان کے ہم نواؤں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ خاص طور پر ورلڈ کپ کے لیے ٹیم بناتے وقت پرانے اور گھسے پٹے فارمولوں پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے رہنا زندہ اور جیتنے والی ٹیم کی تشکیل کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجود ٹیم میں ہمارے خیال اور تجزیئے کے مطابق صرف عامر سہیل' سعید انور' انضام الحق اور وسیم اکرم ہی چار ایسے کھلاڑی ہیں جو آپ سے آپ سلیکٹ ہو سکتے ہیں۔ پرانے اور آزمودہ کھلاڑیوں میں جاوید میانداد' رمیض راجہ' باسط علی اور وقار یونس اگر مکمل طور پر فٹ ہوں تو اب بھی کھلائے جا سکتے ہیں مگر آصف مجتبیٰ' زاہد فضلا اور غلام علی کی بجائے اعجاز جونیئر' منظور اختر اور سلیم الٰہی پر توجہ دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ عاقب جاوید اور عطاء الرحمن کے ساتھ ساتھ محمد اکرم' شلقین مشاق' عامر نذیر اور ارشد خاں بھی توجہ کے قابل ہیں۔ معین خان اور راشد لطیف میں سے کسی ایک کا انتخاب ہو سکتا ہے مگر سب سے ضروری شعبہ آل راؤنڈرز کا ہے' جب تک کم از کم دو باقاعدہ اور باصلاحیت آل راؤنڈر ٹیم میں شامل نہیں ہوں گے پاکستان کی ٹیم اپنے اعزاز کے دفاع کے لیے نامکمل تصور کی جائے گی۔ فی الوقت اس فہرست میں ظفر اقبال' نوید انجم' نعیم اشرف اور عامر حنیف وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔

سو یہ فرض اور یقین کرتے ہوئے کہ عارف علی عباسی کی حکومت قائم رہے گی ہم کرکٹ بورڈ اور اس کے آقاؤں سے درخواست کرتے ہیں کہ خدارا اپنے ان عہدوں کو اپنی ذات کی نمائش تک محدود نہ رکھئے اور اس بدقسمت قوم سے ان گنی چنی اور لمحاتی خوشیوں کو نہ چھینیے کہ جن کے ہونے سے اس سیاہ رات میں کبھی کبھی کوئی روشنی کی کرن سی نظر آ جاتی ہے۔

◆◆◆

بنگلور سے کلکتے تک

غالب نے کہا تھا۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب' قیام کا ہے گویا کوئی دن اور!

سو ورلڈ کپ کے حوالے سے ہمارے لیے تو قیامت کا دن گزر چکا ہے۔ بنگلور میں جو کچھ ہوا' اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ شکست کا ردعمل' تجزیئے' اسباب' الزمات' ٹی وی پر نشر ہونے والے گیت اور کلچرل پروگرام' قومی اسمبلی کی متعلقہ کاروائی اور عدالتی تحقیقات وغیرہ وغیرہ کا شور شرابا اس وقت بہت ہے لیکن چند دنوں میں یہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا' انکوائریاں دب جائیں گی اور معطل شدہ یا زیر عتاب لوگ آہستہ آہستہ دوبارہ اپنی پوزیشنوں پر واپس پہنچ جائیں گے اور اس سارے چکر میں قومی وقار' عزت نفس اور کڑوروں روپے ادھر سے ادھر ہو جائیں گے جن کا حساب آنے والی حکومت لے گی کیونکہ ہمارے یہاں ہر آنے والی حکومت کا اولین فریضہ یہی ہوتا ہے۔ اس کی آڑ میں کچھ سیاسی دشمنیوں کا بدلہ لیا جائے گا اور کچھ نئی دشمنیاں آئندہ کے لیے پیدا کی جائیں گی تاکہ ارباب اقدار کسی کام میں لگے رہیں۔ قوم کا کیا ہے! اسے کھیل میں شکست ہو! اس پر دوہرے تہرے ٹکس لگیں' مہنگائی' اقدار کا جنازہ نکال دے اور روپے کی قیمت ہر مہینے کم ہوتی رہے' اسے تو بہر حال یہ سب کچھ سہنا ہے۔

ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ ہم کوارٹر فائنل میں کیوں ہارے ہم شائد اس نفسیاتی احساس خجالت سے بھی سمجھوتہ کر سکتے تھے کہ یہ شکست ہمیں بھارت نے دی ہے لیکن جس طرح سے ہم نے کھیل کے میدان میں' اس سے باہر اور ذرائع ابلاغ خصوصائی وی پر اس شو کو پیش کیا ہے وہ یقیناً شرمناک اور قابل صد غور و فکر ہے۔

ہمیں اس سے بھی غرض نہیں کہ زرداری صاحب نے اس سارے معاملے میں کیا' کیوں اور کیسے کیا ہے اور کیا بھی ہے یا نہیں۔ بھارت میں ڈے اینڈ نائٹ میچوں کے لیے جو اخراجات اور انتظامیات کیے گئے ہیں' ہماری فرد عمل اس سے مختلف کیوں ہے! بیشتر سٹیڈیم خالی رہنے کے باوجود ٹکٹوں کی فروخت کا انتظام آسان اور شفاف کیوں نہیں ہو سکا اور فائنل کے لیے ٹکٹ (پاکستان کی شکست سے پہلے تک) پرائز بانڈ کے انعام کی شکل کیوں اختیار کر گئے تھے! ہمیں ان باتوں سے فی الوقت اس لیے غرض نہیں کہ یہ ساری

باتیں ہمارے قومی مزاج اور معاشرتی رویوں کے عین مطابق ہیں اور ان سے نہ صرف ہم نے عمومی طور پر سمجھوتہ کرلیا ہے بلکہ بعض اوقات ان کے بارے میں اس طوائف جیسا رویہ بھی اختیار کر لیتے ہیں جسے کسی نے کہا تھا:

''آپ اتنی خوبصورت ہیں' فلموں میں کام کیوں نہیں کرتیں؟''

اس پر اس ستم ظریفہ نے مسکرا کر کہا تھا:

''جب یہیں عزت کی روٹی مل رہی ہے تو کیا ضرورت ہے فلموں میں منہ کالا کرنے کی۔'' بڑے کہہ گئے ہیں کہ شکست کا کائی ساتھی نہیں ہوتا۔ سو اس وقت پاکستانی کرکٹ ٹیم کے ساتھ قوم کا رویہ کچھ ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ آگے کا ہے۔ جذباتی اظہار اور کتھارسس ک حوالے سے یہ ایک حد تک جائز بھی ہے کہ غم و غصے کے اظہار سے جذباتی بوجھ چاہے ختم نہ ہو لیکن کم ضرور ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے بھارت کی سری لنکا کے ہاتھوں شکست پر اظہار مسرت بھی کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اس احساس ندامت میں یقینا ایک بالواسطہ کمی کا باعث ہے جس نے دو دن سے قوم کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا لیکن جس غیر متناسب انداز اور جوش و خروش سے ہم نے بھارک کی شکست پر شادیانے بجائے ہیں وہ اس نامناسب جذباتی ردعمل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا جس کا مظاہرہ ایڈن گارڈن کلکتہ میں موجود تماشائیوں نے کیا ہے۔

بھارت کے ساتھ ہر میدان میں مسابقت ایک ایسی نفسیاتی مجبوری ہے جس میں تاریخ نے دونوں قوموں کو گزشتہ ۴۸ برس سے بے طرح مبتلا کر رکھا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس چپقلش کے غیر فطری عوامل اس کے فطری عوامل سے تعداد اور شدت میں کئی گنا بڑھ چکے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ دونوں ملکوں کے سیاستدانوں کے لیے یہ صورت مجبوری اور اختیار کا ایک عجیب و غریب آمیزہ ہے کہ اس کی آڑ میں وہ اپنے اپنے عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنے اپنے اقتدار کی وقتی بقا کے لیے اسے مستقل بنیادوں پر حل بھی نہیں کرتے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دونوں ملک ایک صحت مندانہ مقابلے کی فضا میں آگے بڑھتے اور حسد کے بجائے رشک کے رشتے سے ایک وسرے کی طرف دیکھتے لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ سیاسی کشیدگی اب انسانی سطح پر بھی نفرت کی ایک ایسی فصل بو رہی ہے جسے کاٹتے کاٹتے دونوں ملکوں کے عوام کی پہلے سے پریشان زندگیاں مزید پراگندہ ہو جائیں گی۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمہ وقت ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے اور کہنے کے بجائے اچھے ہمسایوں کی طرح پر امن بقائے باہمی کو اصول حیات بنایا جائے اور یہ کام وہ ہے جو حکومتوں سے زیادہ اور بہتر انداز میں کھلاڑی' اہل قلم اور ابلاغ عامہ کے ذرائع کر سکتے ہیں سو اس جذباتی ابال اور اشتعال کو ایک

وقتی ردعمل کے انداز میں دیکھتے ہوئے اسے جلد از جلد بھول جانا چاہیے۔ اسی طرح کھلاڑیوں پر مقدمے چلانے' ان کے پتلے جلانے' انہیں اور ان کے اہل خانہ کو گالیاں دینے اور ہراساں کرنے کے بجائے ان عوامل پر غور کرنا چاہیے جن سے آئندہ کوئی بہتری کی صورت پیدا ہو سکے۔

کھلاڑیوں کے بکنے' سٹے اور بارہویں کھلاڑی کے میدان میں پراسرار پیغمات کے حوالے سے اخبارات میں ایک سے ایک انوکھی خبر آرہی ہے۔ لیکن عزیزی سرفراز نواز کا بیان اس بار بھی سب پر بازی لے گیا ہے۔ موصوف نے اخباری اطلاعات کے مطابق وزیر اعظم صاحبہ کو بتایا ہے کہ اس بار کی اصل وجہ عمران خان' وسیم اکرم اور پریشن گوڈریج کی ایک سازش ہے۔ سرفراز نواز ہی کے بیان کے مطابق محترمہ وزیر اعظم نے ان کی اس اطلاع پر ''حیرت'' کا اظہار کیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ محترمہ وزیر اعظم اس حیت کو حیرت تک ہی محدود رکھیں گی اور ملزموں کی فہرست میں عمران خان کا نام دیکھ کر اس ردعمل کا مظاہرہ نہیں کریں گی جس کے لیے یہ نام شامل کیا گیا ہے۔ میر تقی میر نے اس طرح کی صورت حال پر کیا بے مثال تبصرہ کیا ہے کہ

گھر کو اس کے خراب ہی دیکھا
جس کے یہ چشم و دل مشیر ہوئے

◆◆◆

ورلڈ سنگر اور شارجہ کپ

باغ جناح میں صبح کی سیر کے دوران جہاں اور بہت سے احباب سے ٹاکرا ہوتا ہے وہاں پرانے سکول فیلو چودھری محمد صدیق سے بھی اکثر ملاقات رہتی ہے جو کرکٹ میچوں پر تبصرے کی وجہ سے "صدیق تبصرہ" کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور جس طرح چور چوری سے جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا' اسی طرح ہم دونوں کی گفتگو بھی کرکٹ کے سابقہ (برے بھلے ہی سہی) کھلاڑی ہونے کے باعث گھوم پھر کر اسی موضوع پر آرکتی ہے کہ پاکستان کرکٹ ٹم کا کیا بنے گا؟

یوں تو یہ سوال زندگی کے کسی بھی شعبے پر بات کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں راستہ روکتا ہے مگر گزشتہ دو مہینوں میں کرکٹ تقریباً ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ اس دوران میں ایک نہیں' دو نہیں' اکٹھے تین کپ کھیلے گئے اور چونکہ پاکستان کی ٹیم تینوں میں شامل تھی۔ اس لیے بڑھتی ہوئی مہنگائی' عمران خان کے ہسپتال میں دہشت گردی اور مجموعی فرسٹریشن کے باوجود روزمرہ کی گفتگو میں کرخت کا موضوع ہی سرفہرست رہا۔ حالیہ چند برسوں میں کرکٹ کی مادر مجازی یعنی انگلینڈ کو اس میدان میں جس زوال' رسوائی اور مسلسل شکست خوری کا سامنا ہے اور بوتھم اور گیٹنگ ییسے دس نمبریۓ جس طرح کے کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس کے پیش نظر اب ان کا اس کھیل کو شرفاء کا کھیل کہنا کچھ ایسا مناسب نہیں لگتا مگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو ہماری ٹیم اور اس کے کھلاڑیوں کا کردار بھی ان سے کسی طرور کم نہیں رہا کہ گزشتہ دس برسوں میں ورلڈ کپ ۹۲ء کی طلسماتی کامیابی سے قطع نظر ہماری ٹیم نے اتنے کارنامے نہیں دکھائے جتنے سکینڈل جمع کیے ہیں۔ ان سکینڈلوں میں منشیات کے استعمال' جوئے' سٹے' رشوت' نا اتفاقی' گروپ بندی اور فکسڈ میچ کھیلنے کے الزامات ایک سے زیادہ مرتبہ سامنے آئے ہیں۔ ممکن ہے اس میں غیر ملکی میڈیا کی اسلام اور پاکستان دشمنی کا بھی بہت سا ہاتھ ہو مگر اس کی آڑ میں سارے معاملے کو داخل دفتر کرنا یا اس سے نظریں چرانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے جرائم' تشدد' لوٹ مار' دہشت گردی' خود سوزی اور لاقانونیت کی خبروں سے بھرے ہوئے اخبار میں چھپنے والے دو سیاسی بیانات جن میں بڑی بڑی سرخیوں میں بتایا جاتا ہے کہ ملک میں امن وامان کی صورتحال مسلسل بہتر ہو رہی ہے اور پاکستان دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ چند دن پہلے خبر آئی کہ کرکٹ بورڈ کے صدر بخاری صاحب اور چیف ایگزیکٹو عارف عباسی کے درمیان گالیوں' گھونسوں اور دھمکیوں کا آزادانہ تبادلہ ہوا ہے اور ان دونوں شریف آدمیوں نے ایک دوسرے پر ایسے ایسے الزامات کی بوچھاڑ کر دی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہمیں اس خبر پر افسوس تو ہوا

مگر زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ کرکٹ کی ایڈمنسٹریشن میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا جلد یا بدیر یہی یا اس سے ملتا جلتا کوئی نتیجہ ہی نکلنا تھا۔ گزشتہ برس صدر مملکت فاروق لغاری صاحب نے جب پاکستان کرکٹ بورڈ کی تشکیل نو کی اور گزشتہ پندرہ برس سے بورڈ پر قابض مسٹر عارف علی عباسی کو کلی اختیارات دے کر ایک نئے آئین کے تحت انہیں اس کا چیف ایگزیکٹو مقرر کیا تو کرکٹ سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں یہ سوال بہت دنوں تک گردش کرتا رہا کہ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پرانے بورڈ کو توڑنے کی کیا ضرورت تھی اور یہ کہ وہ خفیہ مہارت کیا ہے جس کے باعث عباسی صاحب کو ہر بار نمبردار بنا دیا جاتا ہے! چونکہ ہمارے سسٹم میں عوام یا متعلقہ شعبوں کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات کو خاطر میں نہ لانے کا ایک طریق کار طے ہو چکا ہے' اس لیے یہ معاملہ بھی جوں کا توں چلتا رہا۔ ورلڈ کپ جیسے تنہائی اہم اور شارجہ کپ جیسے روایتی اور جذباتی مقابلوں میں عبرتناک شکست کو سنگر کپ جیسے ایک نمائشی اور غیر اہم مقابلے میں جیت کے بگل بجا بجا کر نظر سے اوجھل کر دیا گیا۔ نہ کسی کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ آیا نہ کسی کی آنکھ شرم سے جھکی' نہ کسی کا محاسبہ ہوا اور نہ ہی اس رسوائی کے ذمہ دار لوگوں سے کسی نے رسمی باز پرس ہی کی۔ عارف علی عباسی بھی وہیں ہیں' انتخاب عالم بھی اور اس بساط کے بقایا مہرے بھی۔ ذاتی طور پر ہمیں ان میں سے کسی شخص سے کوئی عداوت نہیں لیکن اس کھیل اور اس سے متعلق قوم کے اجتماعی نفسیاتی احساس برتری کی شکست و ریخت کے حوالے سے ہم یقیناً اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ قومی کرکٹ ٹیم اور اس کی ایڈمنسٹریشن میں گھر بنا لینے والی ایک دیمک کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے گا مگر اے بسا حسرتا کہ خاک شدہ۔

کرکٹ کے معاملات میں محترمہ وزیر اعظم کے مشیر سرفراز نواز ہیں جن کی زندگی کا واحد مقصد اب غالباً یہ رہ گیا ہے کہ وہ اخبارات میں ایسے بیان دیتے رہیں جنہیں پڑھ کر ہمارے محترم خالد کھرل صاحب بھی بغلیں جھانکنے لگ جائیں۔ ورلڈ کپ کے ایک میچ کے دوران ٹی وی پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے پوری سنجیدگی سے یہ اعلان کیا کہ ریورس سوئنگ دراصل ان کی ایجاد ہے اور یہ جو دنیا بھر کے ''بیسٹ مین'' (واضح ہو کر وہ بیٹس مین Batsman کو ہمیشہ Bastman کہہ کر ہی پکارتے ہیں) چکرائے پھرتے ہیں' یہ دراصل انہی کا دکھایا ہوا چمتکار ہے۔ سرفراز نواز کو ہم اس وقت سے جانتے ہیں جب ان کی آواز بہت پتلی ہوا کرتی تھی اور بالنگ کے دوران ان کی اپیل سن کر آؤٹ ہونے والا بیسٹ مین....... معاف کیجئے گا بیٹسمین بھی ہنس پڑتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے گلے کا آپریشن کرایا اور بطور باؤلر بہت نام کمایا لیکن شاید ابھی تک آواز کے اس کمپلیکس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اسی لیے وہ اکثر ایسی چھوڑتے ہیں کہ لوگ مڑ کر ان کی طرف ایک بار دیکھیں ضرور۔ خندہ استہزا کی پروا انہیں نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

کچھ دنوں میں ٹیم انگلستان جانے والی ہے۔ اگر کرکٹ کی ایڈمنسٹریشن کو فوری طور پر ٹھیک نہ کیا گیا تو ہمیں یقین کی حد تک شبہ ہے

کہ پاکستان کرکٹ ٹیم، آسٹریلیا، ساؤتھ افریقہ، انڈیا اور سری لنکا سے تو پیچھے جا ہی چکی ہے اس برس کے آخر تک وہ ویسٹ انڈیز اور انگلستان بلکہ نیوزی لینڈ اور زمبابوے کی صف میں داخل ہو جائے گی اور اتفاق سے یہی صف فی الوقت آخر صف ہے۔

◆◆◆

ادیب + دانشور + اور

سات سال کے وقفے کے بعد بالآخر ادیبوں اور دانشوروں کی کانفرنس کی پرچی بھی نکل ہی آئی۔ ۹ سے ۱۱ اکتوبر تک اسلام آباد میں کم وبیش سات سو ادیب اور دانشور اکادمی ادبیات پاکستان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یادش بخیر یہ ادیبوں کا وہی اجتماع ہے جو اس سے پہلے اہلِ قلم کانفرنس کے نام سے منعقد ہوا کرتا تھا۔ اکادمی کی موجودہ انتظامیہ کو غالباً اس نام میں بھی کسی آمر کی جھلک نظر آئی ہوگی جو اسے بدلنا ضروری سمجھا گیا۔ حبیب جالب کا ایک مصرعہ ہے۔

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

ایک دوست کا خیال ہے کہ قلم کے اس نوع کے غیر ادبی اور علمی استعمال کو مدنظر رکھتے ہوئے ''اہل قلم'' کی اصطلاح کو ناموزوں سمجھا گیا ہے۔ یوں بھی ''ادیب اور دانشور'' میں جو بھاری بھرکم پن ہے وہ ''اہل قلم'' میں کہاں! کلرکوں کی یونین کی طرف سے بھی اس اصطلاح پر اعتراض سننے میں آیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اصل اہل قلم'' تو ہم لوگ ہیں جو وقتاً فوقتاً قلم چھوڑ ہڑتال بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ کیسے اہل قلم ہیں جنہیں قلم کی طاقت کا بھی اندازہ نہیں!

اس کانفرنس میں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا ہوا! یہ اپنی جگہ پر ایک الگ موضوع ہے جس پر ہم اجمالاً آگے چل کر بات کریں گے لیکن ایک بات طے ہے کہ فخر زمان اور افتخار عارف نے ادیبوں اور دانشوروں کی فہرستیں بناتے وقت خاصی غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے اور ہر مکتبِ فکر اور ایج گروپ کے لکھنے والوں کو مدعو کر کے ان خدشات کا بہت حد تک ازالہ کر دیا ہے جس کا مظاہرہ گزشتہ کچھ عرصے سے ہمارے قومی مزاج کا حصہ بنتا جا رہا ہے کہ ہمارے ہر نظریاتی یا ذاتی اختلاف کی تان اب سیدھی ملک دشمنی اور غداری پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ چند برس پہلے کی ایک کانفرنس میں کوئی دو سو مصافحے اور معانقے کرنے کے بعد عطاء الحق قاسمی نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

''یار اس کانفرنس کا فائدہ یہ ہے کہ بہت سے ایسے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے جن سے ملنے کو دل چاہتا ہے...... اور نقصان یہ ہے کہ بہت سے ایسا لوگوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جن سے ملنے کی قطعاً کوئی خواہش نہیں ہوتی۔''

کانفرنس کے دنوں میں ہی لوک ورثے کا قومی میلہ بھی چل رہا تھا سو اسلام آباد میں چاروں طرف کلچر کلچر ہو رہا تھا۔ عزیزی زاہد مسعود، شرجیل انظر، طاہر اسلم گورا، یونس بٹ اور عباس نجمی نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے زیادہ تر وقت ہوٹل کی لابی میں گزارتے تھے کہ وہاں لوگوں کا ان کی نظر میں اور ان کا لوگوں کی نظر میں رہنا نسبتاً آسان تھا۔ ہم نے ایک دن یونہی استفسار کیا کہ

گزشتہ کانفرنس اور موجودہ کانفرنس کے مندوبین میں انہوں نے کیا فرق محسوس کیا ہے۔ اس پر زاہد مسعود نے بہت دلچسپ جواب دیا۔ بولا ''گزشتہ کانفرنس کے دوران جو لوگ پچاس برس کے تھے اب ستاون برس کے ہو گئے ہیں۔'' کانفرنس کے ابتدائی سیشن میں صدر مملکت اور چیئرمین اکادمی ادبیات کی تقریروں کے علاوہ مرکزی اوزیر تعلیم کا اختتامی اعلان تھا جو اپنی جگہ پر ایک خاصے کی چیز تھی کہ موصوف نے رسمی شکریئے کے بجائے باقاعدہ تقریر کی جو اگر زبانی تھی تو خیر .... لیکن اگر کسی پی آر او یا تقریر نویس کی لکھی ہوئی تھی تو وزیر موصوف کو فوراً کوئی اور انتظام کرنا چاہیے کیونکہ یہ جملہ بہرحال ''تلفظ'' کی غلطی تو نہیں ہو سکتا کہ

''ہم نے فخر زمان صاحب کو اکیڈمی آف لیٹرز کا چیئرمین منعقد کیا ہے۔''

شہناز وزیر علی صاحبہ سے ہماری کوئی باقاعدہ ملاقات تو نہیں لیکن ان کا ذکر اکثر سننے میں آتا رہتا ہے وہ یقیناً محترمہ بے نظیر بھٹو سے بے حد متاثر ہیں کیونکہ جب وہ محترمہ کا پیغام پڑھ کر سنا رہی تھیں تو ان کے لہجے اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے ذہن بار بار محترمہ وزیر اعظم صاحبہ ہی کی طرف جا رہا تھا' غالباً ایسے ہی موقعوں پر کہتے ہیں کہ

رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی

برادرم افتخار عارف آج کل اپنا جسمانی وزن کم کرنے کی ضرورت سے زیادہ کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وزن دراصل اسی کانفرنس کے دوران مختلف مسائل کے حل میں دانتوں پسینہ آنے کی وجہ سے کم ہوا ہے' وجہ جو بھی ہو نتیجہ بہرحال' برا نہیں۔

اس کانفرنس میں کئی ایک سینئر اور درمیانی عمر کے ادیبوں اور شاعروں کی غیر حاضری بری طرح محسوس کی گئی۔ جناب احمد ندیم قاسمی' سید ضمیر جعفری' جمیل الدین عالی' اشفاق احمد' ضیاء جالندھری' شہزاد احمد' خالد احمد' نجیب احمد' عبید اللہ علیم' سلیم کوثر' صہبا لکھنوی' مشفق خواجہ' ادا جعفری' عبدالقادر جونیجو' نور الہدیٰ شاہ' ایوب خاور' پروین فنا سید' فارغ بخاری' ریاض مجید' امراؤ طارق' شوکت صدیقی' طارق محمود' سعید شیخ' مظہر الاسلام چند ایسے نام ہیں جو فوری طور پر ذہن میں آ رہے ہیں۔ اکیڈمی کے سابق سربراہان میں سے بھی شفیق الرحمن' غلام ربانی آگرو اور پروفیسر پریشان خٹک کی غیر حاضری پریشان کن تھی۔ چونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ متعلقہ تینوں حضرات کیوں تشریف نہیں لائے' اس لیے اس موضوع پر مزید بات نہیں ہو سکتی۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں مدعو کرنے میں کسی قسم کی غلطی یا تساہل کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

یہ کالم تو تمہید ہی کی نذر ہو گیا سو کانفرنس کی کاروائی کے بارے میں باتیں اگلے کالم تک ادھار رکھیے۔

◆◆◆

پی ٹی وی، شی اینڈ وی

ابھی ابھی ہم نے محترمہ وزیراعظم کے اقتصادی مشیر وی اے جعفری کا ایک وضاحتی مضمون پڑھا ہے جس میں انہوں نے اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا بنایا ہوا حالیہ بجٹ انتہائی متوازن 'ترقیاتی' جائز اور دوررس نتائج کا حامل ہے جسے اپوزیشن والے اپنی روایتی دشمنی کی وجہ سے خوامخواہ اور غلط طریقے سے برا بھلا کہہ رہے ہیں اور غلط اعداد و شمار کے ذریعے عوام کو گمراہ کر کے ان میں بے چینی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

اعداد و شمار کے حوالوں سے بھری ہوئی ان بجٹ برکات پر ہم نے بہت غور کیا ہے اور صدق دل سے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر انہیں اور جعفری صاحب کے دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ اس تحریر کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کا تعلق غیر ملکی قرضوں' خسارے کی سرمایہ کاری' افراط زر' ادائیگیوں کے توازن اور کرنسی کی ڈی ویلیویشن سے ہے اور ہم اس علم دریاؤ کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ اعداد و شمار جن کی گواہی ان سے متاثر ہونے والی خلق خدا سے نہ ملے پیاز کے ان چھلکوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں چھیلتے رہنے سے ہاتھوں میں بدبو اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں البتہ ان سے ہٹ کر عام آدمی کی زندگی پر اس بجٹ کے جن براہ راست خوشگوار اثرات کا ذکر جعفری صاحب نے کیا ہے ان پر صرف ہنسا ہی جا سکتا ہے جو اپنی جگہ ایک مشکل کام ہے کہ اس کے لیے آنسوؤں کا تھمنا ضروری ہوتا ہے۔

وی اے جعفری صاحب کو ان کے چاہنے والے وی او اے (V.O.A) جعفری بھی کہتے ہیں (وضاحت رہے کہ وی او اے یعنی وائس آف امریکہ' امریکی سرکاری ریڈیو کا مخفف ہے) آپ ہماری عوام دوست پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے مستقل مشیر اقتصادیات ہیں اور وزیراعظم صاحبہ کے معتمد ترین رفقاء میں سے ہیں' اعداد و شمار سے کھیلنا ان کا فن بھی ہے اور پیشہ بھی لیکن جب یہ اعداد و شمار عوام کی زندگیوں' ان کی خوشیوں اور ان کے مستقبل سے کھیلنے لگ جائیں تو ان کے احتجاج اور چیخوں کو محض اپوزیشن کا پراپیگنڈہ کہہ کر آنکھیں بند کرنے والوں کو یہ یاد دلانا ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ روز حساب صرف آسمانوں پر ہی نہیں زمین پر بھی ہوتا ہے اور جب یہ آتا ہے تو سیلاب کی طرح جھونپڑیوں اور محلوں کو ایک ساتھ خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اور ظاہر ہے اس ملبے میں وہ اعداد و شمار والے کاغذات بھی ہوتے ہیں۔

پوری قوم کے معاشی مسئلے سے ایک دم پی ٹی وی سے متعلق فنکاروں اور لکھنے والوں کے مسئلے تک آنے میں کچھ ہاتھی اور چیونٹی والی صورتحال بن جاتی ہے۔ لیکن شاید آپ نے وہ جملہ سنا ہو جو ایک چیونٹی نے لکڑی کے پل سے گزرتے ہوئے ہاتھی کے کان میں کہا تھا کہ ''دیکھو ہم دونوں کے بوجھ سے یہ پل کتنا ہل رہا ہے۔'' تو سابقہ فنکار اور پروڈیوسر اور حالیہ ایم ڈی ٹی وی محترمہ رعنا شیخ نے گذشتہ دنوں ٹی وی کے معاوضوں میں جو ایک دم سو فیصد اضافوں کا اعلان کیا تھا اور اب اعداد و شمار کے ایک افسوسناک کھیل کے بعد اس کی جو اصلی صورت سامنے آئی ہے اسے دیکھتے ہوئے چیونٹی کا جی بھی چاہتا ہے کہ وہ ہاتھی کی فریاد میں شامل ہو جائے اور اس کی آواز سے آواز ملا کر اپنا دکھ بیان کرے۔

ٹی وی کی شی (She) رعنا بی بی اور وی (We) ہم (جن کے معاوضے بڑھائے گئے ہیں) ایک اعتبار سے پیر بھائی ہیں کہ دنوں کا قبلہ حاجات ایک ہی ہے لیکن ایک معمولی سا فرق بہر حال ایسا ہے کہ جو بقول سجاد باقر رضوی مرحوم:

اے خرد مند سن، ہم بھی دو بھائی تھے
وہ جو حاکم بنے، ہم جو رسوا ہوئے
وہ ادھر لعل و گوہر میں تلتے رہے
ہم ادھر لعل و گوہر اگلتے رہے

ایک عوامی حقوق کی علمبردار حکومت اور ایک فنکاروں کے مسائل سے ذاتی طور پر آشنا ایم ڈی ٹی وی سے بجا طور یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ کم از کم وہ ''پچھلی حکومتوں'' اور ان کے ''گماشتوں'' کی طرح فنکار سے معاملہ کرتے وقت چکر بازی، حق تلفی اور دام ہمرنگ زمین والی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیں گی۔ اس ''واہمے'' کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اندرون ملک پرائیویٹ چینلز، بھارت کے کمرشل چینلز اور ڈش پر طرح طرح کے چینلز کی یلغار کے بعد پی ٹی وی کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اپنے پروگراموں کے معیار کو نہ صرف بہتر بنائے بلکہ انہیں ان چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار کرے جو دشمن کے لشکر کی طرح بڑھے چلے آ رہے ہیں اور یہ دونوں کام اس وقت ممکن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے فنکاروں اور لکھنے والوں کو بھی اسی طرح کے معاوضے نہیں دیئے جاتے جیسے دوسرے نیٹ ورکس پر کام والوں کو مل رہے ہیں۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اول تو معاوضوں میں اضافہ اس طرح سے کیا ہی نہیں گیا ہے جیسے ان کا اعلان کیا گیا تھا اور جو کچھ کیا گیا ہے اس میں ان کے وہ حقوق بھی غصب کر لیے گئے ہیں جن میں اکثر کو عالمی سطح پر تحفظ حاصل ہے مثال کے طور پر تمام رائلٹیاں ختم کر

دی گئی ہیں اور اب تحریری یا پر فارمنس کو اس اضافے کی آڑ میں آوٹ رائٹ پرچیز (Outright Purchase) کی بنیاد پر خرید لیا جائے گا اور اس کو دوسری، تیسری یا چوتھی بار چلانے اور دوسرے نیٹ ورکس پر فروخت کرنے کے مکمل حقوق ہمیشہ کے لیے ٹی وی کو مل جائیں گے۔ اندرونی سطح پر گدھے گھوڑے کو ایک برابر کر دیا گیا ہے یعنی اب ایک نئے ناتجربہ کار، شوقیہ یا کم اہلیت والے فنکار اور اس فن کے ماہر قومی اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ اور غیر معمولی صلاحیت والے فنکاروں کو ایک ہی درجہ دے دیا گیا ہے۔ یوں بعض صورتوں میں نامور فنکاروں کے معاوضے میں اضافے کی بجائے کمی ہوگی ہے۔

فنانس کے محکمے والوں کے بارے میں یہ بات اب ایک اصول کا درجہ حاصل کر چکی ہے کہ وہ پیسہ کمانے اور بچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ایسا کرتے وقت کسی نہ کسی قانون یا ضابطے کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ پی ٹی وی کے فنانس کے شعبے نے اپنی سربراہ کے اعلان کو جس طرح الٹی سیدھی تاویلوں اور فنکار دشمن رویئے سے مشکوک اور گدلا بنا دیا ہے اس کا فوری طور پر نوٹس لینا بہت ضروری ہے۔ اندریں حالات ہم توقع کرتے ہیں کہ ٹی وی کے حکام بالا اور خاص طور پر محترمہ رعنا شیخ اپنے ادارے اور حکومت کی نیک نامی کے لیے اس مسئلے پر فوری توجہ دیں گی اور ایک اچھے اور مثبت اقدام کو مفاد اور رنجشوں کا باعث نہیں بننے دیں گے۔

یہ ڈاکٹر......!!!

ڈاکٹری ایک مقدس پیشہ ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے غالباً کسی کو بھی انکار نہ ہوگا۔ ہر پیشے میں اچھے برے' اہل نا اہل اور معمولی اور غیر معمولی لوگ ہوتے ہیں لیکن بعض پیشے یا شعبہ ہائے زندگی ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست انسانی زندگی' صحت' مستقبل اور معیار سے ہوتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کی ذرا سی غلفت سے ایسا نقصان عظیم ہوتا ہے جسے نا قابل تلافی کہا جاتا ہے یعنی یہاں دو نمبر مال کے چلنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک میڈیکل کا شعبہ بھی ایسا ہی قیمتی اور نازک شعبہ ہے۔ سو ہماری اس تحریر کا رخ ان لوگوں .... ان چند لوگوں کی طرف ہے جو کسی نہ کسی طرح سے اس مقدس پیشے کے لیے ڈگری حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے بعد پیشہ ور قاتلوں کی طرح بے گناہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔

کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ آج ۱۹۹۵ء میں ایک صحتمند انسان کے ہاتھ میں کوئی پھانس چبھ جائے اور سیپٹک ہونے کے باعث زخم کے مقام پر پیدا ہونے والی سوجن اور پیپ کے علاج کی خاطر ڈاکٹر صاحب اس مریض کو جنرل اینس تھیزیا دے کر بے ہوش کریں اور اس عمل کے دوران اپنی نا اہلی اور نا تجربہ کاری کے باعث اسے جان سے مار دیں۔ یقین کیجیے' ایسا ہوتا ہے۔ شہروں سے دور' دیہاتی علاقوں اور قصبوں میں آئے دن اور چھوٹے بڑے ہسپتالوں میں کبھی کبھار .... لیکن ایسا ہوتا ہے .... ابھی چند دن پہلے ضلع سمندری میں ہوا ہے اور اس حادثے اور غفلت کا شکار ہونے والا مریض نشاط خالد تھی جو ہم سب کے محترم احمد ندیم قاسمی کی صاحبزادی اور اس ناتے سے ہماری عزیز بہن ہوتی تھی۔ قاسمی صاحب کے بیان کے مطابق ان کے جگر کے اس ٹکڑے کو متعلقہ ڈاکٹر نے اس معمولی سے آپریشن کے لیے (جسے ہمارے یہاں کے جراح انتہائی مہارت سے اور بہت ہی کم فیس پر نہایت آسانی اور کامیابی سے کر دیتے ہیں) جنرل اینس تھیزیا دے دیا جبکہ اس کے پاس اینس تھیزیا کے لیے نہ تو جدید مشینری تھی اور نہ ہی غالباً متعلقہ ادویات تھیں' نہ معلوم کب کے پڑے ہوئے کلوروفارم کے ساتھ پرانے اور فرسودہ طریقے سے مریض کو بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے بیہوش کیا گیا اور ہاتھ سے پیپ نکالنے کے چکر میں اس کے جسم سے جان ہی نکال دی۔

گزشتہ چند برسوں سے اکثر نوجوان ڈاکٹر تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس غریب ملک نے ان کی تعلیم پر ان کے والدین کے خرچے کے علاوہ تقریباً آٹھ لاکھ روپے صرف کیے ہیں' سول سروس کے امتحان میں حصہ لیتے ہیں اور اس میں

کامیابی کے بعد انتظامیہ کے افسر کے طور پر ایک ایسا کیریئر اختیار کر لیتے ہیں جس کا کوئی تعلق ان کی اس خصوصی پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت سے نہیں ہوتا جس کے حصول کے لیے انہوں نے ایک دو نہیں پورے سات سال صرف کیے تھے۔ یقیناً ان نوجوان ڈاکٹروں کے پاس اپنے دفاع اور اس عمل کی حمایت کے لیے چند عملی اور قابل غور دلیلیں ہیں لیکن جس طرح ایک غلطی دوسری غلطی کا علاج یا جواز نہیں ہوتی اسی طرح ان نوجوان ڈاکٹروں کی تمام تر فرسٹریشن' شکایات اور دلائل مل کر بھی اس غلط بات کو بہر حال صحیح نہیں بنا سکتے کہ ان کے اس عمل یعنی پیشے کی تبدیلی سے اور نقصانات کے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے طالب علم سے میڈیکل کی نشست چھین کر ضائع کر دی جو دل و جان سے ڈاکٹر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس پیشے کے ساتھ کمیٹڈ تھا۔

جدید اور مکمل وسائل تو شہروں کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بھی شائد اپنی مثالی شکل میں مہیا نہ ہوں لیکن چھوٹے شہروں' قصبوں اور دیہاتوں میں تو ان کی صورتحال افسوس ناک سے بھی کہیں آگے کی منزل پر ہے۔ ڈسپنسریاں' ادویات' رہائش' آمد و رفت' ماحول' مریضوں کی جہالت اور دید طریقہ علوم کے بجائے روایتی ٹونے ٹوٹکوں پر انحصار اور جدید ٹیسٹوں کی سہولیات کا نہ ہونا یقیناً ایک ایسی صورتحال کو پیش کرتے ہیں جس میں کسی نوجوان' پر عزم' ذہین اور انسان دوست ڈاکٹر کے لیے مسائل' پریشانی اور فرسٹریشن کی فراوانی ہے اور وہ ہمہ وقت یا تو وہاں سے ٹرانسفر کرانے کی تگ و دو میں رہتا ہے یا پھر اپنے کام میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتا ہے۔ اکثر ڈیوٹی سے غائب رہتا ہے' اور جب تھک ہار کر اس صورتحال سے سمجھوتہ کر لیتا ہے تو پھر ایسی ڈیوٹی سے غائب رہتا ہے' اور جب تھک ہار کر اس صورتحال سے سمجھوتہ کر لیتا ہے تو پھر ایسی ہی پیشہ ورانہ غفلت اور جرائم کا باعث بنتا ہے جس کا ایک مظاہرہ عزیزہ نشاط قاسمی کا علاج کرن والے ڈاکٹر نے کیا...... ہم نہ تو ان صاحب کا نام جانتے ہیں اور نہ ہی ہمیں ان کے بارے میں کسی اور تفصیل کا علم ہے لیکن یہ امر اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور امر واقعہ ہے کہ ایک ڈاکٹر کی پیشہ ورانہ غفلت نے ایک انسان کی جان لے لی ہے۔ اس طرح کی کتنی جانیں روزانہ اس سے ملتی جلتی غلفت یا نا اہلی کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اس کا کوئی مصدقہ ریکارڈ تو شائد کہیں نہ مل سکے کہ ایسے ۹۵ فیصد کیسوں کو رضائے الٰہی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور باقی ۵ فیصد بھی چند دنوں میں زینت طاق نسیاں ہو جاتے ہیں کہ زندہ لوگوں کو پیچھے سے زیادہ آگے کی فکر ہوتی ہے۔ نشاط بہن کے اس پیشہ ورانہ قتل کا معاملہ بھی ممکن ہے اسی طرح دب جائے لیکن ہماری خواہش ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اس کا سب سے زیادہ نوٹس خود ڈاکٹروں اور ان کی مختلف تنظیموں کو لینا چاہیے کہ جس طرح ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے' اسی طرح چند کالی بھیڑیں پورے معاشرے یا اس کے کسی بھی شعبے کو

مقام اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔

ذاتی طور پر ہم بہت سے ڈاکٹروں' میڈیکل کے پروفیسوں اور ڈاکٹروں کی مختلف تنظیموں کے عہدیداروں کو کم یا زیادہ جانتے ہیں اور ہمیں اندازہ ہے کہ گریڈوں اور سنیارٹی کے اعتبار سے ان میں مختلف قسم کی درجہ بندیاں بھی موجود ہیں' مگر ہم اس پیشے سے متعلق تمام افراد اور تنظیموں کو اجتماعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے اپیل کریں گے کہ وہ مستقبل میں اس طرح کے واقعات کی روک تھام اور سدباب کے لیے خود کوئی طریقہ کار وضع کریں اور اپنے کسی نااہل یا مجرم ساتھی کی پردہ پوشی یا مدد کے لیے انفرادی تنقید کو اجتماعی تنقید کے طور پر لینا چھوڑ دیں کہ کسی غلط بات کے حق میں اجتماعی اتحاد کا مظاہرہ کسی بھی صورت میں کوئی مثبت یا قابل تعریف اقدام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہمارے نوجوان دوست ڈاکٹر سعید الٰہی پی ایم اے کے حوالے سے اکثر خبروں میں رہتے ہیں اور سروسز ہسپتال لاہور میں بھی ہم نے ان کو بہت مستعد' مقبول اور غریب پرور پایا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اور ان جیسے اور نوجوان اور اپنے پیشے سے محبت کرنے والے ڈاکٹر حضرات آگے آئیں اور اپنے اہل وطن کو بچانے کی کوشش کریں۔ ڈاکٹروں کو اگر کچھ مسائل درپیش ہیں تو معاشرے کے باقی حصے بھی کوئی سکھ چین کی بانسری نہیں بجا رہے اور دنیا کا کوئی قانون کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ مائل کو اپنی نااہلی یا جرم کے لیے بطور آڑ استعمال کرے اور ی اور انسان کو اس ی زندگی کے حق سے محروم کر دے۔

◆◆◆

سمندر پار پاکستانی

اگلے وقتوں میں جب کوئی لاہور شہر سے نکل کر راوی دریا پار کرتا تھا تو یہ ایک باقاعدہ خبر ہوا کرتی تھی اور بزرگ جانے والوں کو کچھ اس طرح سے رخصت کیا کرتے تھے کہ "جا بچہ راوی....... نہ کوئی آوی تے نہ جاوی" اور اب یہ حال ہے کہ لوگ سات سمندر پار کا سفر بھی یوں کرتے ہیں جیسے ساتھ والے محلے میں جا رہے ہوں۔ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں جب ہمارے میرپوری بھائیوں نے انگلستان کا رخ کیا تو اس وقت ان کی تعداد باقی کی ساری دنیا میں بیرون وطن مقیم پاکستانیوں سے زیادہ تھی لیکن اب سعودی عرب' متحدہ عرب امارات' کینیڈا اور امریکہ میں ہر جگہ کم و بیش پانچ پانچ لاکھ پاکستانی آباد ہیں اور ایک محتاط اندازے کے مطابق سمندر پار مقیم پاکستانیوں کی مجموعی تعداد چالیس لاکھ سے بھی زیادہ ہے' یوں دیکھا جائے تو یہ تعداد دنیا کے بہت سے ممالک کی کل آبادی سے بھی زیادہ بنتی ہے۔

گزشتہ پندرہ برس میں ہمیں کئی بار ایسے ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں پاکستانیوں کی آبادی اتنی ہے کہ انہیں باقاعدہ کمیونٹی کہا جا سکتا ہے لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر ہر جگہ ہم نے وہی نفاق اور انتشار دیکھا جو اب وطن عزیز کی افسوسناک پہچان بن چکا ہے۔ ایک ایک شہر میں بیسیوں انجمنیں قائم ہیں اور ایک انجمن کے اراکین دوسری سوسائٹیوں سے اس طرح کٹ کر رہتے ہیں جیسے ان میں آپس میں کوئی زمین یا جائیداد کا جھگڑا چل رہا ہو۔ ہر انجمن اپنے مہمانوں کو یوں سینت سینت کر رکھتی ہے کہ "مخالفین" ان سے سلام دعا تک نہ لے سکیں۔

اس سارے خلفشار کی بنیادی وجہ ایک ہی ہے۔ چودھراہٹ!! یعنی جس آدمی کو کسی انجمن میں اس کا من پسند عہدہ نہیں ملتا وہ فوراً اپنی ایک الگ انجمن بنا لیتا ہے اور یوں یہ سلسلہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اکثر انجمنیں تو ابزادہ نصراللہ کی پارٹی کی زندہ تصویر بن جاتی ہیں۔ برادران اسلامیان پاکستان کی اس انجمن پالسی (واضح ہو کر اس کا کوئی تعلق ہماری فلموں والی انجمن سے نہیں ہے) کی انتہا یہ ہے کہ بقول شخصے "پاکستان سے باہر جہاں دو پاکستانی جمع ہو جائیں' وہاں تین انجمنیں بن جاتی ہیں' ایک دونوں کی مشترکہ....... اور ایک ایک اپنی اپنی۔"

ہمارے سفارتخانے اپنی تمام تر اصلی اور مبینہ خامیوں کے باوجود اس معاملے میں حق بجانب نظر آتے ہیں کہ اتنی بے شمار انجمنوں

کی موجودگی میں وہ کسے تسلیم کریں اور کسے نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان انجمنوں کی بیشتر تقاریب میں وہاں کا سفارتی عملہ شامل نہیں ہوتا جبکہ ہمسایہ ممالک کے سفارتی عہدیدار نہ صرف اپنی ہر تقریب میں بلکہ ہماری تقریبات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور یوں اپنے ملک کا نام روشن اور بلند کرتے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں کینیڈا کے سفر کے دوران پہلی بار ہمیں ایک ایسے مرکزی ادارے کا پتہ چلا جو وہاں کے مختلف شہروں میں قائم پاکستانی انجمنوں کا ایک متفقہ فورم یا پلیٹ فارم تھا۔ اس کے روح رواں ہمارے جینیاتی سائنس کے ماہر ڈاکٹر انور نسیم تھے جو ان دنوں کئی برس سے آٹوا میں مقیم تھے۔ لیکن اس ایک نخلستان سے قطع نظر چاروں طرف صحرا ہی صحرا تھا جس کی وسعت ہر نئے سفر کے ساتھ مزید بڑھ جاتی تھی۔

اب جو ہمارے انجینیر دوست احمد بلال محبوب نے ہمیں سمندر پار پاکستانیوں کی انجمنوں کی عالمی ڈائریکٹری بھجوائی ہے تو کبھی ہم اس کو اور کبھی پھر اس کو دیکھتے ہیں کہ ایسا بڑا' اہم' نیک اور معیاری کام تو آج تک ہماری کسی حکومت سے نہیں ہو پایا۔ اوورسیز پاکستانیز انسٹیٹیوٹ والوں نے یہ پہاڑ کیسے سر کر لیا۔ مزید تفصیلا کے لیے کھوج کی تو پتہ چلا کہ یہ پڑھے لکھے اور پروفیشنل پاکستانیوں کا ایک ایسا گروہ ہے جن کے دماغ روشن اور دل وطن کی محبت سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں صدر اور سیکرٹری سمیت کل ۲۳ ممبران ہیں جن کا تعلق گیارہ ممالک سے ہے جبکہ ڈائریکٹری میں کل ۲۱ ممالک میں قائم انجمنوں کے بارے میں معلومات درج کی گئی ہیں۔ صدر پاکستان کے ایس ایم یوسف خاں اور سیکرٹری جنرل و چیف ایگزیکٹو احمد بلال محبوب ہیں جن کا نام سمندر پار پاکستانیوں کے حوالے سے پریس میں اکثر چھپتا رہتا ہے۔ بیرون وطن مقیم تقریبا چالیس لاکھ پاکستانیوں کی یہ نمائندہ تنظیم اگرچہ بہت سے شعبوں میں بہت اہم اور دور رس نتائج کے حامل منصوبوں پر کام کر رہی ہے لیکن ہمیں اس کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کا ہے' وہ وہی اجتماعیت کا خواب اور ایک مرکز کے قیام کا نصب العین ہے جس کی عدم موجودگی میں کئی ملکوں میں اتنی کثیر تعداد ہونے کے باوجود ہماری کوئی آواز اور اجتماعی شناخت نہیں تھی۔

او پی آئی یعنی اوورسیز پاکستانیز انسٹیٹیوٹ کے احباب نے اتفاق اور یگانگت کے اس عمل کو اس ڈائریکٹری کی اشاعت تک ہی محدود نہیں کیا۔ گزشتہ برس انہوں نے اسلام آباد میں ایک دوروزہ عالمی کانفرنس منعقد کی جس میں دنیا بھر میں قائم پاکستانیوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندے شریک ہوئے اور وہیں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر ان بہت سے مسائل پر غور کیا گیا جو سمندر پار پاکستانیوں کو در پیش ہیں اور اس سلسلے کو سالانہ بنیادوں پر مشتمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ مختلف ملکوں کے انفرادی مسائل کے بارے میں کوئی اجتماعی

لائحہ عمل بنایا جاسکے۔

ریاض (سعودی عرب) میں گزشتہ کئی برسوں سے ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کے حوالے سے ایسے لیکچرز کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں دنیا بھر سے ممتاز مقرر اور دانشور آ کر مختلف قومی ملی اور اجتماعی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور یوں باہمی افہام و تفہیم کی ایسی راہیں تلاش کی جاتی ہیں جن کی منزل وطن عزیز کی عظمت اور سربلندی ہے۔

ہم تیسرے کہلائیں

اے میرے دیس کی سوہنی دھرتی ہم تیرے کہلائیں

آترے خواب کی روشن خوشبو گلی گلی پھیلائیں

تیرے سفر کا رستہ قدم قدم مہکائیں

اپنے لہو سے مشعل مشعل روشنیاں بکھرائیں

ہر اک دل پر جادو کر دیں گیت اک ایسا گائیں

پنچھی بنیں اور تیری فضا میں اڑتے گاتے جائیں

تیرے پیار کا پارس چھو کر ہم سونا بن جائیں

ہم تیرے کہلائیں

اے میرے دیس کی سوہنی دھرتی ہم تیرے کہلائیں

◆◆◆

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

صدر فاروق لغاری نے بالآخر اسمبلیاں توڑ ہی دیں۔ انگریزی محاورہ تو یہ کہتا ہے کہ It is never too late لیکن ہمارے خیال میں اس فیصلے میں ہونے والی تاخیر قوم کو بہت مہنگی پڑے گی۔ ہمیں اندازہ ہے کہ صدر لغاری کے لیے ایک ایسی پارٹی کی حکومت ختم کرنا جس کے وہ بانی ممبر رہے ہیں اور جس سے ان کی ذاتی اور نظریاتی وابستگی کی عمر ان کی کل عمر کے نصف سے بھی شائد زیادہ ہے' کس قدر مشکل فیصلہ تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ غلام اسحاق خان کے اس فیصلے سے بھی مشکل تر تھا جس کے تحت میاں نواز شریف کی حکومت برطرف کی گئی تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ فیصلہ عوامی اور قومی امنگوں کے عین مطابق ہے کیونکہ حالات اب اس نہج پر پہنچ چکے تھے جہاں نہ صرف واپسی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں بلکہ خود متعلقہ پارٹیوں کے کچھ حصے بھی (اوپر سے چاہے کچھ کہیں) دل میں اطمینان کا سانس لیتے ہیں جیسے ویرانے میں لڑلڑ کر تھک چکے بچے کسی ایسے مہربان کے انتظار میں ہوتے ہیں جو آ کر ان کی لڑائی ختم کرا دے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عمل سارے مسئلے کا حل ہے؟ کیونکہ یہ ڈرامہ تو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ جو بھی کسی حکومت کو برطرف کرتا ہے اپنے فیصلے کی تائید میں الزامات کی ایک فہرست بھی پیش کرتا ہے' وائٹ پیپر شائع ہوتے ہیں' احتساب' احتساب کا شور مچتا ہے' اگلے الیکشن کی تاریخ دی جاتی ہے لیکن یا تو وہ تاریخ بدلتی رہتی ہے یا الیکشن ہونے کے بعد پھر سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا دوبارہ وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔

ہمیں یہ تو علم نہیں کہ آصف زرداری یا ان کے ساتھیوں نے گزشتہ تین برسوں میں واقعی اربوں کھربوں کی لوٹ مار کی ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کے لیے کوئی قانونی یا دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہاں اگر آواز خلق کو نقارہ خدا سمجھا جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ الزام کلی یا جزوی طور پر صحیح ہو فرض کیجیے یہ صحیح ہے تو کیا اس ساری قومی دولت کو محض اس لیے بازیاب نہ کیا جائے کہ اس کے راستے میں کچھ قانونی پیچیدگیاں اور سیاسی دشواریاں ہیں؟ کیا ان جرائم کا حساب نہ لیا جائے جن کی وجہ سے پوری قوم ایک گروی شدہ مال کی شکل اختیار کر گئی۔ مہنگائی اور ٹیکسوں کی بھرمار نے لوگوں سے سوچنے سمجھنے کی قوت چھین لی ہے۔ اقراء ٹیکس کا اربوں روپیہ تو حکمرانوں کی فضول خرچیوں اور غلط بخشیوں کی نذر ہو رہا تھا کتاب اور علم پر بھی ٹیکس لگا دیا گیا۔ نواز شریف سے انتقام لینے اور اسے

تنگ کرنے کے لیے پورے ملک کی انڈسٹری تباہ کردی گئی' جاگیردار طبقے کو تحفظ دینے کے لیے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو قوم کا مائی باپ بنا دیا گیا' سکوں' کشمیوں اور افغانیوں کے سلسلے میں غلط اور سیاسی بصیرت سے عاری فیصلے کر کے ان کے دلوں میں شک اور نفرت کے ایسے بیج بو دیئے گئے کہ اب ان کی اکثریت ہماری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں۔ ٹیلی ویژن کو جدید کرنے کے چکر میں نہ صرف اس کا تشخص اور معیار تباہ کر دیا گیا بلکہ اسے مالی طور پر بھی تباہی کے دہانے تک لے آیا گیا۔ ہم نے چند ماہ قبل محترمہ رعنا شیخ سے ایک تقریب کے دوران کہا تھا کہ آپ انقلاب کے چکر میں ارتقاء کو بھی داؤ پر نہ لگایئے کہ اندھا دھند اور بے مقصد بھاگنے سے عام طور پر آدمی منہ کے بل گرتا ہے اور اس کے دانت ہاتھوں میں آجاتے ہیں مگر خاتون محترم چونکہ اپنی جگہ پر ''مرد آہن'' ہیں اور خود کو ''پھولن دیوی'' کہلانے میں خوشی محسوس کرتی ہیں اس لیے انہوں نے نہ صرف ہماری بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا بلکہ ٹی وی کے ان تمام سینئر لوگوں کو بھی جو ابتداء سے اس سے منسلک چلے آرہے تھے بے عزت کر کے یا تو استعفی دینے پر مجبور کر دیا یا ان کو اس طرح نکرے لگا دیا کہ وہ محض تماشائی بن کر رہ گئے۔

خیر اس طرح کی چارج شیٹس تو اب آپ روزانہ اخبارات کے مختلف صفحوں پر دیکھتے رہیں گے کہ یہ بھی اس طرح کی کاروائی کا حصہ ہے لیکن اس وقت ہم صدر مملکت کی توجہ جس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ یہی ہے کہ ملک کی دولت جس نے بھی اور جس طرح سے بھی لوٹی ہے اسے بازیاب کیا جائے اور ایسے تمام سودے جن میں اربوں روپے کا ہیر پھیر کر کے قومی خزانے کو نقصان پہنچایا گیا ہے منسوخ کیے جائیں اور ان سے متعلق تفصیلات کو قوم کے سامنے لایا جائے اس ضمن میں ہمیں اپنے ہمسایہ ملک بھارت سے سبق حاصل کرنا چاہیے جو کسی بھی کرپٹ سیاستدان کو قانون کی زد سے باہر نہیں ہونے دیتے۔

امریکہ کے ایک مشہور صدر اور ایک عظیم انسان ابراہیم لنکن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کے لیے عموماً کوئی کہانی یا تمثیل پیش کیا کرتا تھا جس سے اس کا موقف اور نقطہ نظر بہت خوبصورت اور موثر انداز میں لوگوں تک پہنچ جاتا تھا۔ ہم اس کی سنائی ہوئی ایک حکایت یا تمثیل اس دعا کے ساتھ قارئین کی نذر کرتے ہیں کہ خدا ہمارے اکابرین کو بھی ایسی سوجھ بوجھ اور قومی درد اور بصیرت عطا کرے تا کہ ہم بھی قوموں کی برادری میں سر اٹھا کر چل سکیں۔

خانہ جنگی کے دنوں میں لنکن کے کچھ مشیروں نے اسے جنوبی ریاست کے ساتھ صلح صفائی کا مشورہ دیا تو اس نے انہیں یہ کہانی سنائی۔

''ایک شیر لکڑہارے کی بیٹی پر فریفتہ تھا' بیٹی نے شیر سے کہا کہ وہ اس کے باپ سے بات کرے' شیر نے جب لڑکی کے باپ سے

درخواست کی تو باپ نے کہا ''تمہارے دانت بہت لمبے ہیں۔'' تب شیر دندان ساز کے پاس گیا اور سارے دانت نکلوا ڈالے۔ واپس آ کر جب پھر اس نے درخواست کی تو لکڑ ہارے نے کہا ''نہیں ابھی نہیں، تمہارے ناخن بہت لمبے ہیں۔'' شیر نے ناخن بھی نکلوا دیئے۔ اب جو وہ لکڑ ہارے کے پاس آیا تو لکڑ ہارے نے بغیر دانت اور ناخن کے دیکھ کر اس کی پٹائی کر دی۔''

ابراہیم لنکن نے یہ تمثیل سنانے کے بعد کہا تھا۔

''کیا تم میری حالت اس شیر جیسی کرنا چاہتے ہو؟''

ملک معراج خالد ہمارے سیاستدانوں کی اس انتہائی محدود اقلیت میں سے ہیں جن کی واقعی عزت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہم ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس تاریخی ذمہ داری کو نہ صرف خوش اسلوبی سے نبھائیں گے بلکہ اس روز روز کی آنکھ مچولی کے کھیل کو بند کرنے اور قوم کے مستقبل کے لیے کوئی ایسا باقاعدہ، مثبت، مسلسل اور قابل عمل لائحہ عمل بنانے میں بھی کامیاب ہوں گے جو اب کسی بھی مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہے۔

◆◆◆

جڑواں مشاعرے

گزشتہ دنوں کراچی کے دو مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ ایک محل کراچی کلب والوں نے برپا کی تھی اور دوسری کراچی جم خانہ نے۔ برادرم جمیل الدین عالی نے ان دنوں اپنے کالم میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کراچی کے موجودہ انتہائی تشویشناک حالات میں مشاعروں کے انعقاد اور ان میں شرکت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی یہ رائے خلوص، دردمندی اور اس قلبی تعلق کی آئینہ دار ہے جو انہیں شہر کراچی سے ہے لیکن یہ سوال بھی اپنی جگہ ہے کہ اگر اس بگڑتی ہوئی صورتحال کا مقابلہ اہل فکر ونظر اسی طرح کی مفعول غیر جانبداری سے کرتے رہے تو اس سے فائدہ کس کو پہنچے گا؟ کراچی کا مسئلہ اپنی بنیاد میں بہت سارے مسائل کا ایک الجھا ہوا مجموعہ ہے، ایک ایسا مجموعہ، جس پر حفیظ ہوشیار پوری کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے کہ ......

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل سیاست اپنے حوالوں سے کچھ مشورے کر رہے ہیں یا کم از کم ایسا ہونے کا تاثر دے رہے ہیں لیکن ہم جو اپنے آپ کو اہل محبت کہتے ہیں ہمیں ان سے ایک مشکوک خیر کی توقع رکھنے کے بجائے اپنے پیغام کی ترسیل اور پھیلاؤ کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر کراچی میں بسنے والے کم وبیش ایک کروڑ افراد اتنا کچھ ہونے کے باوجود اپنی زندگی کے تمام معمولات کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھے ہوئے ہیں اور مختلف پلیٹ فارموں سے صورتحال کو بہتر بنانے کی مختلف النوع کوشش کر رہے ہیں تو مشاعرے کی محفل منعقد کرنے میں بھی کوئی برائی نہیں کیونکہ جہاں ان مشاعروں میں شعراء براہ راست اور بالواسطہ کراچی کے بارے میں بطور خاص اور وطن عزیز کے بارے میں عمومی طور پر اپنے خیالات، تشویش اور آرزوؤں کا دعاؤں بھرا ذکر کرتے ہیں وہاں سامعین بھی ان کی وساطت سے ایک ذہنی اور روحانی کتھارسس کے عمل سے گزرتے ہیں۔ ان کے تنے ہوئے اعصاب کو چند لمحوں کے لیے ہی سہی، آرام ملتا ہے اور ایک جگہ پر مل بیٹھنے اور کچھ وقت گزارنے سے نہ صرف جی ہلکا ہوتا ہے بلکہ یہ امید بھی چہروں اور آنکھوں میں لہرانے لگتی ہے کہ حالات کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں اگر ہم سب مل کر انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان میں بہتری کی صورت پیدا نہ ہو۔

ایک بیوروکریٹ نے اپنے ایک شاعر ماتحت سے پوچھا:

''یہ بتاؤ کہ مشاعرے کا فائدہ کیا ہوتا ہے! لوگ آتے ہیں' واہ واہ کرتے ہیں اور پھر مزے سے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔''

ماتحت نے جواب دیا: ''سر! میں آپ کو ٹیوب ویل کا فائدہ تو بتا سکتا ہوں مشاعرے کا نہیں کیونکہ مشاعرہ تہذیب کے سیکٹر میں کی جانے والی انوسٹمنٹ ہے جو انسانوں کے قلب و روح میں ترفع اور بالیدگی پیدا کرتی ہے جبکہ فائدہ یا نقصان خرچ کا بتایا اور ناپا جاتا ہے مثلاً یہ کہ ایک ٹیوب ویل سے کتنے ایکٹرز مین زیر آب ہوتی ہے اور زمین کی پیداوار کتنی ہے؟''

کراچی کے یہ دونوں مشاعرے بھی ہمارے خیال میں انتہائی کامیابی' بروقت اور ضروری تھے کہ بہت دنوں کے بعد رات کے چار بجے تک لوگ گھروں سے باہر رہے' ایک دوسرے سے ہمکلام ہوئے' اپنے پسندیدہ شاعروں کو سنا' ان کی شاعری میں اپنے جذبوں اور خیالات کی بازگشت کو چہرہ نما پایا اور یوں ایک ایسے اجتماعی تجربے سے گزرے جس سے زندگی پر ایمان تازہ اور اصلاح حال کی آرزو محکم ہو جاتی ہے۔

کراچی جم خانہ کے مشاعرے میں صدارت کے فرائض بزرگ بیوروکیرٹ سید ہاشم رضا نے کچھ اس طرح ادا کیے کہ جی چاہا کاش ہمارے سارے صدر ایسے ہی ہوں یعنی وہ مشاعرے کے آغاز میں سٹیج پر آئے' اپنی ناسازئ طبع کا ذکر کیا' مخصوص انداز میں آنکھیں بند کر کے قائم اعظم کی وفات کے موقع پر لکھی گئی ایک نظم سنائی (حالانکہ کم از کم اس نظم کی حد تک سامعین سے آنکھیں ملانے میں کوئی قباحت نہیں تھی)' قائداعظم کی شخصیت کے حوالے سے اپنے کچھ ذاتی تجربات و مشاہدات سنائے جو اکثر حاضرین کے لیے قند مکرر کا درجہ رکھتے تھے اور خاموشی سے تشریف لے گئے۔ ان کی چھوڑی ہوئی صدارت ہمارے بزرگ اور محترم شاعر تابش دہلوی کے ہاتھ آئی مگر ان کا انداز چودھری فضل الٰہی مرحوم کا سا تھا کہ جو صدارت کے زمانے میں بھی سرکاری محکموں سے کسی واقف کار کا کام کرانے کے لیے کسی اور واقف کار کو ڈھونڈا کرتے تھے۔

البتہ کراچی جم خانہ کے مشاعرے میں تابش صاحب باقاعدہ صدر تھے جبکہ مہمان خصوصی ریٹائرڈ جسٹس مظہر علی تھے۔ اس مشاعرے کی انفرادیت یہ تھی کہ اس کے صاحب صدر اور مہمان خصوصی دونوں ہی مشارے کے اختتام سے بہت پہلے اپنا کلام سنا کر اور سامعین و منتظمین سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ہمیں اس مشاعرے کے اختتام کا صحیح وقت معلوم نہیں کیونکہ ہمیں اپنی لاہور کی فلائٹ کے لیے ائیر پورٹ پہنچنا تھا۔

ان مشاعروں میں جو کلام پڑھا گیا اس کی تفصیل یا نمونہ کلام کا یہ محل نہیں چنانچہ ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے دوبارہ اسی بات کی طرف آتے ہیں کہ کیا کراچی کے موجودہ ماحولیں مشاعروں کا انعقاد اچھا اور مستحسن ہے یا یہ حالات کی سنگینی سے آنکھیں چرانے کا ایک مجرمانہ عمل ہے۔ ہمارے خیال میں گھٹن کے موسم میں ایسی محفلوں کا انعقاد تازہ ہوا کے جھونکے کا کام کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت کم شاعروں نے براہ راست کراچی اور اس کے حالات کو موضوع سخن بنایا لیکن شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام میں اس کی جھلک کسی نہ کسی حوالے سے موجود نہ ہو۔ سو یہ تو ممکن ہے کہ ان مشاعروں کی وجہ سے کراچی کی فضا میں کوئی نمایاں یا بنیادی تبدیلی نہ آئی ہو لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ وہ سب خواتین وحضرات جو ان دو محفلوں میں شریک ہوئے نہ صرف خود ایک خوشگوار تجربے سے گزرے بلکہ ان کی شخصیتوں پر ایک ایسا خوش آئند تاثر بھی مرتب ہوا جو بہت دنوں تک انہیں اور ان سے ملنے والوں کی روحوں کو شاداب رکھے گا۔ فراز کا کیا اچھا شعر ہے.......

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے!

◆◆◆

یا بندہ صحرائی......

علامہ اقبال نے فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرنے والوں میں بندہ صحرائی اور مرد کہستانی کو جو اہمیت دی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کے زوال کے تاریک ترین اودوار میں بھی ان ہر دو طرح کے علاقوں سے تعلق رکھنے والوں نے بعض خالص اسلامی روایات کی نہ صرف پاسداری کی ہے بلکہ ان کی روشنی اور چمک دمک کو بھی قائم اور برقرار رکھا ہے۔

شہری معاشروں کی مصنوعی چمک دمک' طبقاتی تقسیم اور نام نہاد ترقی کے برخلا آج بھی ان علاقوں کے لوگوں میں برابری اور مساوات کے اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب اور سندھ کے جاگیردار' چودھری' وڈیرے اور پیر سائیں آج بھی اپنے مزارعوں اور کمیوں کو اپنے برابر تو کیا اپنے سامنے زمین کے علاوہ کسی بھی طرح کی نشست پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتے اور ان کے ملازموں یا کم رتبہ لوگوں کو ان کا بچا کھچا ہی کھانے کو ملتا ہے مگر صوبہ سرحد اسور بلوچستان یں سرداروں اور خوانین کے ادارے ہونے کے باوجود ڈیروں پر سب لوگ ایک ہی طرح کی چارپائیوں پر بیٹھتے ہیں اور آقا اور ملازم ایک ہی ساتھ اور ایک ہی جیسا کھانا کھاتے ہیں۔

چند برس قبل ہمیں دوحہ (قطر) میں ایک ایسی ہی دعوت کھانے کا موقع ملا جس کا اہتمام ہم پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں وہاں کے وزیر ثقافت نے شہر سے دور صحرا میں کیا تھا۔ اس دعوت کی سب سے پر لطف بات یہی تھی کہ ہم نے زندگی میں پہلی بار اسلامی مساوات کے تصور کو حقیقی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ باوجود کوشش کے میزبانوں میں سے افسر اور ماتحت کا فرق پتہ کرنا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ہمیں کئی بار دوحہ جانے کا موقع ملا ہے کہ حیرت انگیز طور پر یہ چھوٹا سا ریاستی شہر اس وقت اردو ادب کی ترویج و ترقی اور ثقافتی فروغ کے حوالے سے برصغیر سے باہر کی پوری اردو دنیا میں ایک مثالی حیثیت اور مقام حاصل کر چکا ہے۔ یوں تو یہاں بہت سے احباب دامے' درمے' قدمے' سخنے اس مہم میں پیش پیش ہیں لیکن جو چند دوست' مختلف انجمنوں کے بینر تلے یکسوئی اور تسلسل سے اس میدان میں سرگرم عمل ہیں ان میں عدیل اکبر' شاہد صاحب' رشید نیاز' قاضی اصغر' عبدالحمید مفتاح' راجہ ظفر اقبال' طاہر ابرابر' ممتاز راشد اور انور مرزا کے نام نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں

ابن الحبیب احقر مصیب الرحمن اور دوحہ بینک کے محمد عتیق اور ان کے رفقاء نے ان تمام سرگرمیوں کو ایک نئی اور انقلابی ہمت عطا کی ہے۔ دبئی کے مشہور آرگنائزر اور ہمارے مرحوم دوست سلیم جعفری کے ساتھ مل کر انہوں نے دوحہ میں کل پاک و ہند عظیم الشان مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا اور پھر ایک ایسا انوکھا کارنامہ کیا کہ جس کی مثال پوری اردو دنیا میں اس سے پہلے دیکھی اور سنی نہیں گئی تھی اور وہ ہے عالمی اردو ایوارڈ کا اجراء۔

گزشتہ برس یہ ایوارڈ پاکستان سے جناب احمد ندیم قاسمی اور بھارت سے پروفیسر آل احمد سرور کو ان کی گرانقدر اور طویل علمی و ادبی خدمات پر دیا گیا (جس کے ساتھ ایک ایک لاکھ کی انعامی رقوم بھی شامل تھیں) اور اس بار پاکستان سے جناب اشفاق احمد اور بھارت سے محترمہ قرۃالعین حیدر کو اس اعزاز کے لیے چنا گیا ہے۔ حیرت اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس ایوارڈ کی جیوری میں متعلقہ بزم یعنی بزم فروغ اردو ادب دوحہ (قطر) کے عہدیداروں میں سے کوئی بھی شامل نہیں ہوتا بلکہ پاکستان اور بھارت کے مستند اور سر برآوردہ ادیبوں پر مشتمل دو علیحدہ علیحدہ جیوریاں اپنے اپنا ملکوں میں صلاح مشورے کے بعد ایوارڈ حاصل کرنے والوں کا انتخاب اور نامزدگی کرتی ہیں۔

چند ماہ قبل اس بزم نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ ادب کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں تک بڑھانے کا فیصلہ کیا اور نصرت فتح علی خاں کو ایک شام موسیقی کے لیے مدعو کیا گیا۔ ۴ دسمبر کی تاریخ طے ہوگئی۔ فیصلہ ہوا کہ نصرت فتح علی اس میں شمولیت کے لیے لندن جاتے اور خاں صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی تعزیت کے لیے دوحہ سے برادرم مصیب الرحمن اور دبئی سے ان کے بھائی ملک رویدسمیع کے خصوصی فون آئے اور اس گفتگو کے دوران اس نہ ہوسکنے والے پروگرام کا ذکر بھی آیا۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ بزم کے احباب نے اس تقریب کو نصرت فتح علی مرحوم کی یاد میں منعقد کی جانے والی ایک موسیقی کانفرنس کی شکل دے دی ہے اور اب اسی تاریخ کو اسی ہال میں عابدہ پروین، حامد علی خاں اور اقبال باہو اپنے فن کا جادو جگا کر مرحوم نصرت فتح علی خاں کی روح کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔

یعنی اس اہم تہذیبی اور ثقافتی فریضے کی ادائگی کے لیے سب سے پہلی آواز اور اس کے عملی اظہار کی صورت بھی صحرا ہی سے اٹھی ہے اور ایک بار پھر علامہ اقبال کی فکری بصیرت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے اور اس میں نیا اضافہ یہ ہوا ہے کہ صحرا میں رہنے والے اگر وہاں کی مٹی سے تعلق نہ بھی رکھتے ہوں تب بھی ان میں صحرا والوں کی صفات پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں!

قاسمی صاحب نے کہا تھا۔

ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکوت بھی صدا ہے

مگر اب تو صحرا شہروں سے زیادہ صاف اور اچھی زبان بول رہے ہیں۔

◆◆◆

درد کچھ اور ہے، دوا کچھ اور

ایک بہت امیر اور پوش علاقے کے فائیو سٹار ٹائپ سکول میں بچوں کو ''غریب آدمی'' پر ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا گیا۔ ایک بچے نے لکھا:

''ہمارے بلاک کے کونے والے مکان میں ایک بہت غریب آدمی رہتا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک گاڑی ہے اور وہ بھی پرانے ماڈل کی۔ سارے گھر میں کل دو نوکر ہیں اور اس کے پاس جو مالی ہے وہ بھی پارٹ ٹائم کام کرتے ہے۔ گھر میں ڈش انٹینا بھی نہیں ہے، فرنیچر، قالین، ٹی وی، وی سی آر اور آڈیو ڈیک بھی پرانے ماڈل کے ہیں اور کئی مہینے سے اس کے گھر میں کوئی پارٹی بھی نہیں ہوئی.......''

اب جو حکومت نے ڈبل سواری پر پابندی لگائی ہے تو ہمیں یہ ''ذہین برخوردار'' بہت یاد آیا ہے۔ غور کیا جائے تو جس ماحول، اشیاء کی افراط اور دولت کی فراوانی میں اس بچے نے آنکھ کھولی اس کے حوالے سے غریب آدمی کے بارے میں اس کے یہ تصورات ہمارے لیے تو مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں مگر اس نے وہی کچھ لکھا جو اس کا تجربہ یا تصور تھا۔ لیکن جن بزرجمہروں نے ڈبل سواری پر پابندی لگانے کے جوش میں ''عورتوں'' پر بھی پابندی عائد کر دی ہے ان کی عقل و دانش اور زمینی حقائق سے اس قدر بے خبری پر یقیناً انتہائی افسوس آمیز حیرت ہوتی ہے۔

ہمیں اندازہ ہے کہ امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینے والی دہشت گردی کے پیش نظر اس نوع کے حفاظتی اقدامات بھی ضروری ہیں کہ کسی مسئلے پر قابو پانے کے لیے پہلے اسے کسی مخصوص جگہ یا دائرے مین محدود کرنا ضروری ہوتا ہے تا کہ علاج اور سد باب کی اثر آفرینی میں اضافہ ہو سکے لیکن یہ عمل اس ریچھ کی سوچ کے مطابق نہیں ہونا چاہیے جس نے مالک کی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑانے کے چکر میں اس کی ناک ہی توڑ ڈالی تھی.......!

اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردی کی حالیہ وارداتوں میں موٹر سائیکل کا استعمال بہت کثرت اور تواتر سے کیا گیا ہے اور اس عمل میں ڈبل سواری کی سہولت کو آڑ بنا کر اکثر وارداتیں کی جا رہی ہیں لیکن انتظامیہ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ موٹر سائیکل اس سارے معاملے میں محض ایک ذریعہ ہے۔ اصل مسئلہ تو اس ''مقصد'' کا ہے جس کے لیے یہ ذریعہ استعمال کیا جا رہا ہے یعنی اگر

''مصقد'' کی روک تھام نہ کی جائے تو ذرائع پر عائدشدہ کسی بھی پابندی کا عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہوتا'' وہ لوگ'' کوئی اور راستہ نکال لیں گے۔

چلئے مان لیا کہ ڈبل سواری پر اس پابندی سے وقتی طور پر کچھ فائدہ ہو جائے گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسری سواری کے طور پر''خواتین'' کے بیٹھنے پر کس منطق کے تحت پابندی عائد کی گئی ہے؟ کیا متعلقہ حکام کو یہ علم نہیں کہ ٹرانسپورٹ کی اس قلت اور مہنگائی کے دور میں کتنے لاکھ خاندان موٹر سائیکل کے ذریعے اپنی زندگی کی روٹین کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دفتروں' سکولوں' اور کالجوں میں کام کرنے والی بیشتر خواتین اپنے عزیز واقارب کے ساتھ موٹر سائیکل کے ذریعے سفر کرتی ہیں اور سماجی میل جول اور روزمرہ کی خریداری کے لیے بھی اکثر شادی شدہ جوڑے اسی سواری کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسے میں آنکھیں بند کر کے اور بغیر سوچے سمجھے اس طرح کی پابندی عائد کر دینا یقیناً اسی طرح کا عمل ہے جس کا مظاہرہ اس امیر زادے نے''غریب آدمی'' پر مضمون لکھتے ہوئے کیا تھا۔

امن عامہ کی صورت حال کیوں خراب ہے؟ دہشت گردی کی وارداتوں کے پس پردہ کون کون سے عوامل کار فرما ہیں؟ فرقہ وارانہ بنیاد پر ہونے والی قتل وغارت کے پردہ زنگاری کے پیچھے کون کون سے معشوق کہاں کہاں سے جلوہ نمائی کر رہے ہیں؟ جہالت' پسماندگی' بیروزگاری' تعلیم کی بے حرمتی' منشیات اور کسی قومی نصب العین پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے نوجوان نسل اور تشدد انگیزی میں کیا کیا رشتے پیدا ہو رہے ہیں؟ اور اوپر کی سطح پر اربوں کی لوٹ مار کے باوجود مخصوص طبقے کس طرح''محفوظ و مامون'' پھر رہے ہیں؟

یہ سب وہ باتیں ہیں جن پر سوچنا' غور کرنا اور ان کو حل کرنا ہمارے اصلی مسائل ہیں سو بہتر ہوگا کہ ایک مسئلے کے حل سے بچنے کے لیے دوسرے مسئلے پیدا کرنے کے اس غلط اندیش رویئے کو ترک کیا جائے اور عوام کی پہلے سے تلخ زندگیوں کو تلخ تر بنانے والے عوامل سے گریز کیا جائے۔ ڈبل سواری پر پابندی ضرور عائد کیجیے مگر خواتین کے حال پر رحم فرمائیے۔ خاندانوں کی روزمرہ زندگی کو عذاب نہ بنایئے اور صرف وہاں نشتر لگایئے جہاں سچ مچ پھوڑا موجود ہے۔

معیشت سدھارنے کے لیے چند مشورے

گزشتہ دنوں دوحہ (قطر) جاتے ہوئے ہم چند گھنٹوں کے لیے کراچی رکے۔ برادرم اشرف شاہین کے ڈیرے پر پہنچ کر اختر جعفری کو اطلاع دی گئی اور یوں تیس برس پہلے کی محفلوں کی یاد تازہ کرنے کی ایک صورت نکل آئی مگر ہوا یہ کہ چند منٹ بعد ہی گفتگو ۲۸ مئی سے پہلے اور ۲۸ مئی کے بعد کے اس منطقے میں داخل ہوگئی جو آج کل زبان زد خاص و عام ہے۔ ہمارے یہ دوست چونکہ اپنے اپنے شعبے کا گہرا شعور تجربہ رکھتے ہیں اس لیے ان کی فکر مندری نے ہمیں بھی متفکر اور پریشان کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ زرمبادلہ کے بارے میں حکومت نے جو طریقہ کار اور طرز عمل روا رکھا ہے اس کے دوررس اثرات انتہائی خطرناک ہوں گے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے وقت ملک میں موجود ڈالروں کو محفوظ اور قابو رکھنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں ان سے فائدہ بہت کم اور نقصان بہت زیادہ ہوگا مثال کے طور پر.......

۱۔ حکومت اب تک فارن کرنسی اکاؤنٹ کے سلسلے میں اپنی پالیسیوں اور بیانات میں اس قدر تبدیلیاں کر چکی ہے کہ جذبہ حب الوطنی' قرض اتارو ملک سنوارو اور حالیہ خود انحصاری مہم اپنی جگہ لیکن متعلقہ لوگوں کی بدظنی اس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اپنی فارن کرنسی' پاکستان میں رکھنے پر بالکل آمادہ نہیں ہیں۔

۲۔ ملک میں موجود ڈالرز کی نقل وحرکت پر پابندی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ حکومت کے پاس لوگوں کی طلب کے مطابق زرمبادلہ موجود نہیں تھا اور بڑے پیمانے پر اگر اس کی ادائیگی یا ٹرانسفر ہو جاتی تو ملک معیشت کو بہتر زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ یہ انتہائی خفیہ معلومات پر مبنی فیصلہ کسی نہ کسی طرح اعلان سے پہلے کچھ لوگوں تک پہنچ گیا جس کے نتیجے میں راتوں رات مبینہ طور پر بیس کروڑ ڈالر ملک سے باہر بھجوا دیئے گئے اور اس حوالے سے جن لوگوں کے نام لیے جا رہے ہیں وہ موجودہ حکومت سے انتہائی قریبی روابط رکھنے والے لوگ ہیں۔

۳۔ جنرل سیلز ٹیکس' ساڑھے بارہ فیصد' عجیب و غریب بلکہ انتہائی مضحکہ خیز طریقے سے نافذ کیا گیا ہے یعنی یہ فیصلہ کہ اسے صرف ۵۰ لاکھ روپے سالانہ کا کاروبار کرنے والی دکانوں پر عائد کیا جائے گا ایک انتہائی غیر منصفانہ صورتحال پر منتج ہوگا کہ جب اس دائرے سے باہر رہنے والی دوکانوں پر کوئی چیز سیلز ٹیکس کے بغیر دستیاب ہوگی تو لوگ کیوں بڑی دوکانوں سے خریداری کریں گے؟ اس سے

بڑی دوکانوں کو تو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی حکومت کو بھی کچھ حاصل وصول نہیں ہوگا اور پہلے سے موجود ہمہ گیر مہنگائی کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں اس طرح کے اقدامات مزید الجھاؤ پیدا کریں گے۔

باتیں اور بھی بہت سی ہوئیں لیکن جب ہم نے ان مسائل کے حل اور بہتر ممکنہ پالیسی کے بارے میں استفسار کیا تو غیر ملکی زرمبادلہ کی صورتحال کو سنبھالا دینے کے لیے فوری طور پر جو دو قابل عمل اور مثبت تجاویز سامنے آئیں وہ کچھ یوں ہیں۔

ا۔ ملک میں امپورٹس پر پابندیاں عائد کرنے کی بجائے یہ اصول بنا دیں کہ ہر امپورٹر متعلقہ امپورٹ کے لیے خود ڈالروں کا انتظام کرے اور مطلوبہ ڈالر بنک میں جمع کرا کے لیٹر آف کریڈٹ حاصل کرے۔ اس سے نہ صرف حکومت کی ڈالر فراہم کرنے کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی بلکہ تاجر طبقہ بے فکر ہو کر اپنی ترجیحات کے مطابق امپورٹس کرے گا اور ملک کے اندر ڈالر خود بخود گردش میں آ جائیں گے۔

۲۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مختلف اٹمز (Items) پر بھاری امپورٹ ڈیوٹیوں کی وجہ سے سمگلنگ زوروں پر ہے اور حکومت خود کئی بار تسلیم کر چکی ہے کہ وہ سمگلنگ اور امپورٹ ڈیوٹیوں میں ہونے والی کرپشن پر قابو نہیں پا سکی۔ افغانستان کی مخصوص صورتحال نے اس معاملے کو اور زیادہ گھمبیر بنا دیا ہے۔ گزشتہ دس برس کی خانہ جنگی نے افغانستان کو معاشی طور پر جس قدر تباہ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے لیکن اب بھی کروڑوں ڈالر کا مال پاکستان کے راستے افغانستان میں امپورٹ کیا جا رہا ہے جو اصل میں افغانستان پہنچنے کی بجائے تورخم سے ہی واپس پاکستان پہنچ جاتا ہے اور یوں ہماری مارکیٹیں ایسے مال سے بھری رہتی ہیں جو کسی کتاب یا کھاتے میں نہ ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی سرکاری ڈیوٹے اور ٹیکس سے آزاد رہتا ہے۔

تجویز یہ ہے کہ امپورٹ ڈیوٹی کو اس حد تک کم (مثلاً ۵ فیصد) کر دیا جائے کہ سمگلنگ کرنے والوں کے لے اس کام میں کوئی کشش باقی نہ رہے اگر ایسا ہو جائے تو سنگاپور، تائیوان وغیرہ کا سارا کاروبار پاکستان میں منتقل ہو جائے گا اور حکومت پاکستان کو موجودہ کی نسبت کئی گنا زیادہ آمدنی ہوگی۔

ہم نے یہ باتیں مجلس فروغ ادب دوحہ کے صدر اور دوحہ بنک کے ڈپٹی جنرل منیجر محمد عتیق صاح کے گھر ہونے والے عشائیے میں دہرائیں جہاں سفیر پاکستان میاں افضل حیات، بانی مجلس ملک مصیب الرحمن، سمیر، جمیل الدین عالی اور ہمارے اور حسن رضوی کے علاوہ کچھ تاجر اور بینکار بھی موجود تھے تو کم و بیش سب ہی نے ان دونوں تجاویز کے حق میں رائے دی اور بتایا کہ حکومت پاکستان کی اپنی غیر معتدل اور مستقبل نا اندیش بدلتی ہوئی پالیسوں کے باعث وہ طبقے جو صحیح معنوں میں بڑی تعداد میں ڈالرز پاکستان بھجوا سکتے ہیں

اتنے برگشتہ اور بدگمان ہو چکے ہیں کہ اب وہ کسی بھی خوش آئند بات یا اپیل پر اس ردعمل کا اظہار نہیں کرتے جس کی توقع پر سرتاج عزیز صاحب قومی بجٹ اور میاں نواز شریف اپنی معاشی پالیسیاں استوار کرتے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ۲۸ مئی کے دھماکے کی گرد بیٹھنے کے بعد اس غبار کو بھی صاف کرنے کے لیے کچھ انقلابی اقدامات کیے جائیں جس کے باعث ہمارا معاشی پس منظر تاریک اور پیش منظر ہمہ وقت دھندلایا رہتا ہے۔

ہم نے یہ باتیں کالم میں اس لیے لکھ دی ہیں کہ اہل فکرونظر اور ماہرین معاشیات ان پر غور فرمائیں اور اگر یہ واقعی کلی یا جزوی طور پر قابل عمل ہوں تو ان پر عمل کرنے کے لیے حکومت کے متعلقہ شعبوں پر زور ڈالیں۔ ذاتی طور پر ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس پر کوئی باقاعدہ قسم کی رائے دے سکیں سو یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ خدا ہم سب کو صحیح اور مثبت فیصلے کرنے کی توفیق ارزانی کرے۔

◆◆◆

قومی ترجیحات اوران کا عملی پہلو

کہتے ہیں کہ میدان جنگ میں پہلی گولی چلنے سے پہلے کا سناٹا بے حد اعصاب شکن ہوتا ہے مگر یہ بات توان جنگوں کے بارے میں ہے جن میں ایک دوسرے پر گولیاں چلائی جاتی تھیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو ڈرانے کے لیے ایٹمی بموں کے ایسے دھماکے کر لیے ہیں جن کا غبار تو پوکھران اور چاغی کے صحراؤں میں شائد بیٹھ چکا ہے لیکن جن کی بازگشت دونوں ملکوں کی گلیوں' محلوں' شہروں اور ابلاغ عامہ کے ذرائع پر مسلسل ایک ایسے شور کی شکل میں سنائی دے رہی ہے جس میں نعرے اور اندیشے ایک دوسرے پر اوورلیپ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

وزیر اعظم میاں نواز شریف اور ان کی حکومتی مشینری کے عہدیدار' اقتصادی پابندیوں اور ان کے متوقع نتائج کے حوالے سے قوم کو مسلسل خود انحصاری کی راہ اپنانے کا درس دے رہے ہیں مگر اس سلسلے میں جو اقدامات اب تک کیے گئے ہیں اور جن توقعات کا اظہار عوام سے کیا جا رہا ہے ان کا بہت سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک سرکاری افسران پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کرنے اور انہیں بے جا اصراف سے روکنے کا تعلق ہے تو یہ سارا معاملہ ایک ایسی راست فکری کا متقاضی ہے جو بدقسمتی سے ابھی تک واضح ہو کر سامنے نہیں آئی کیونکہ جتنی بے جا قسم کی مراعات ہیں ان کا ۹۵ فیصد ان لوگوں سے متعلق ہے جنہیں ان پابندیوں سے مبرا قرار دے دیا گیا ہے اور ہر پھیر کر سارا اور گریڈ اٹھارہ اور اس سے نچلے درجے کے سرکاری افسروں پر آزمایا گیا ہے جن میں سے کچھ لوگ ذاتی سطح پر کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی بناء پر یقیناً مال بنا رہے ہوں گے مگر جن کی اکثریت معمولی تنخواہوں' بڑھتی ہوئی مہنگائی' آئے دن حکومت کی طرف سے قربانی کے نام پر کاٹ لی جانے والی تنخواہوں' مہنگائی الاؤنس سے مسلسل محرومی اور گیس' بجلی پانی وغیرہ پر لگنے والے سرچارجوں کے باعث پہلے ہی جاں بلب ہو رہی ہے۔ چند برس پہلے تک اس طبقے کو اپنی سفید پوشی برقرار رکھنے کی پریشانی رہتی تھی' اب زندہ رہنا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ بیس پچیس سال کی ایمانداری سے کی ہوئی سرکاری نوکری کے بعد (جو انہیں سخت محنت اور مقابلے کے بعد حاصل ہوئی تھی) دس بارہ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ میں زندگی گزارنا اپنی جگہ پر ایک امتحان عظیم ہے ایسے میں اگر انہیں سرکاری ٹرانسپورٹ اور جون جولائی کی گرمی میں کام کرنے کے لیے ایئر کنڈیشنر کی سہولت فراہم کر دی جاتی ہے تو اسے اللے تللے قرار دینا کوئی ایسا ہی انصاف کی بات نہیں۔

روکنا تو ان لوگوں کو چاہیے جو ان بنیادی سہولتوں کا یا تو غلط استعمال کرتے ہیں (یعنی کام نہیں کرتے) یا پٹرول کے بے محابا استعمال ایک سے زیادہ سرکاری کاروں پر قبضے اور لاکھوں روپے مالیت کے میڈیکل بلوں کی وصولی کے ذریعے قومی خزانے کو نقصان پہنچا رہے ہیں' لیکن غور کیا جائے تو ایسے لگ بھی تعداد میں کوئی بہت زیادہ نہیں ہیں اصل گڑ بڑ تو وہ اعلیٰ سرکاری افسران کرتے ہیں جو مختلف حکومتوں سے اپنی ''وابستگی'' کی آڑ میں بے محابا لوٹ مار کرتے ہیں اور اوپر والوں تک مال غنیمت پہنچانے کے دوران اپنی تجوریاں بھی بھرتے چلے جاتے ہیں۔ نچلے درجے پر اس طرح کی مالی کرپشن والے محکمے سب کے سامنے ہیں کسٹمز' انکم ٹیکس اور پولیس میں جب کئی کئی لاکھ رشوت دے کر لوگ بھرتی ہوں گے تو ان سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں! یہی صورتحال اس سے نیچے کے درجوں پر ہے جہاں پٹواری' واپڈا کا لائن مین ٹیلی فون کے کارندے اور بعض اور اداروں کے کلرک اپنا اپنا کام دکھاتے ہیں۔ ان لوگوں کو چونکہ تنخواہوں کی فکر نہیں ہوتی اس لیے تنخواہوں میں کمی یا کٹوتی سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اور بقول ایک کارٹونسٹ کے' بیوی اپنے پریشان سرکاری ملازم شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہتی ہے کہ:

''پریشان کیوں ہو رہے ہو تمہاری تنخواہ ہی کم ہوئی ہے آمدنی تو نہیں......''

سو پہلی بات تو یہ ہے کہ بیشتر سرکاری ملازموں کی پہلے سے کٹی ہوئی گردنوں پر مزید چھری چلانے اور پھر ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کی بجائے اس مسئلے کو تدبر اور انصاف سے حل کیا جائے اور خود انحصاری کی پالیسی کی طرف گامزن ہونے کے لیے ان لوگوں پر ہاتھ ڈالا جائے جو صحیح معنوں میں اس ملک کی دولت لوٹ یا ضائع کر رہے ہیں۔

اگر ہم اس بات کو اوپر سے شروع کریں تو صورت کچھ یوں ہوگی کہ:

''اکابرین حکومت بڑی بڑی سرکاری عمارتیں چھوڑنے یا اپنی تنخواہوں اور ان گنت الاؤنسز میں کمی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی صفوں میں موجود ان کالی بھیڑوں کا محاسبہ بھی کریں جو اپنی سیاسی طاقت اور جوڑ توڑ کے باعث قومی دولت سے جھوٹے اور جعلی قرضوں کی وصولی میں اربوں کھربوں روپے ہضم کر چکے ہیں اور اب بھی ڈکار مارنے سے پہلے مزید قرضے حاصل کرتے جا رہے ہیں۔''

سمگلنگ اور منشیات کو روکا جائے اور ان میں ملوث لوگوں سے ان کی کمائی ہوئی رقم واگزار کرائی جائے۔

بڑے جاگیرداروں اور پیروں کی ناجائز قبضہ کی ہوئی زمینوں کو واپس لیا جائے اور زمین کی حد مقرر کر کے اس پر سختی سے عمل درآمد کرایا جائے۔ یہاں بھی نچلے اور متوسط طبقے کے زمینداروں کو نشانہ بنانے کے بجائے ان بڑی مچھلیوں کو پکڑا جائے جن کی کوٹھیاں'

جائیدادیں' باغات اور لگژری کاریں تو بڑھتی چلی جا رہی ہیں مگر جو ٹیکس دینے کی بات کو سننے تک کے روادار نہیں ہیں۔

عام زندگی میں ہر طبقے کے لوگوں میں احساس فرض اور ذمہ داری کی ادائی کا شعور پیدا کیا جائے تاجر طبقے کی لوٹ مار' سمگلنگ کے مال کے کھلے عام ترسیل اور فروخت' بغیر کسی اصول کے قیمتوں کے تعین اور ہر چیز میں ملاوٹ کی روش کو روکا جائے اور بظاہر معمولی پیشوں مثلاً قصاب' دودھ فروش اور حلوائی وغیرہ کی لوٹ مار سے عوام کو بچایا جائے جو مسلسل مہنگائی اور ملاوٹ کے ذریعے نہ صرف لوگوں کے جان و مال سے کھیلتے ہیں بلکہ ٹیکس کے دائرے سے بھی باہر رہتے ہیں۔

جب تک ان تمام امور کو سامنے رکھتے ہوئے ایک یکساں اور مبنی بر انصاف معاشرتی نظام قائم نہیں کیا جائے گا ہم نہیں سمجھتے کہ اس طرح کی پالیسیوں کے کوئی مثبت نتائج نکل سکتے ہیں البتہ ایسا نہ کرنے یا نہ کر سکنے کی صورت میں یہ خدشہ بڑھتا چلا جائے گا کہ کہیں (خدانخواستہ) اس دھماکے سے حاصل ہونے والے فوائد ضائع نہ ہو جائیں۔

◆◆◆

اب یہاں ظالم و مظلوم کی پہچان نہیں

چوبیس برس قبل جب وطن عزیز کا ایک بازو کٹ رہا تھا' فضا آہوں' کراہوں اور افواہوں سے پرتھی اور لوگ اپنے لیڈروں کے بیانات پڑھ پڑھ کر اس حیرت میں گم تھے کہ جو کچھ انہیں اس پستی میں رہ کر دکھائی دے رہا ہے وہ ان بلندی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو کیوں نظر نہیں آتا؟ اس وقت کے مغربی پاکستان میں ہم یہ سنکر بہت حیران ہوا کرتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ہی بھائیوں' ہم وطنوں اور ہم مذہبوں سے برسرپیکار ہیں اور یہ کہ وہاں کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں نسل اور زبان کے مسئلے پر فساد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس حیرت کی جگہ پریشانی نے لے لی اور یہی پریشانی آگے چل کر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ایک پچھتاوے' افسوس اور احساس شکست میں ڈھل گئی اور پھر یوں ہوا کہ ہم نے اس کڑوی گولی کو نہ صرف نگل لیا بلکہ اس کے بارے میں کچھ ایسا رویہ بھی اختیار کرلیا جیسے جدا ہونے والا حصہ ہمارا آدھا ملک اور خواب نہ تھا' ایک کاروباری حصے دار تھا جس نے اپنی دکان ہم سے علیحدہ کرلی ہے۔

اب جب ہم کراچی کے حالات اور مستقبل پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنے لیڈران کرم کے بیانات سنتے ہیں تو کبھی کبھی ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے میں چوبیس سال پہلے کا وہ سانحہ یکدم سانس لینے لگتا ہے اور کچھ ایسے اندیشے خاک سے سر اٹھانے لگتے ہیں کہ جن پر بات کرنے سے پہلے دس مرتبہ "ہمارے منہ میں خاک" کہنا پڑتا ہے لیکن ہر صبح کا اخبار اپنے دامن میں اس قدر اڑتی ہوئی مٹی سمیٹ کر لاتا ہے کہ سانس رکھنے لگتے ہے اور گلہ خشک ہوجاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم قدم بہ قدم چوبیس سال پہلے والی صورتحال کے نزدیک کھسکتے آرہے ہیں اور اس کے باوجود اتنے ہی بے حس ہیں جتنے پہلے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ نظم کراچی پر نہیں ڈھاکہ پر لکھی گئی تھی!

ان زمینوں کی ہوا تند ہے بچ کر چلنا
خون کا نشہ نگاہوں میں اتر آیا ہے
ہر حقیقت کا گماں
خوف اور طیش کی راہوں میں اتر آیا ہے

موت پھر موت ہے جب گھر سے نکل آتی ہے
آہٹیں بین کا آہنگ لیے چلتی ہیں
عورتیں چیختے بچوں کی طرف دیکھ کے رو دیتی ہیں
اور کئی کانپتے ہاتھوں سے عصا گرتے ہیں
سینکڑوں خواب نما رنگ محل ٹوٹتے ہیں
خواہشیں اپنا لہو سنگ لیے چلتی ہیں
موت کی سرد ہوا
شہر پر شور کو بے صوت بنا دیتی ہے
آنے والوں کے سواگت میں فروزاں چہروں
کھڑکیوں اور دریچوں میں بھٹکتی آنکھوں
اور بے نام چراغوں کو بجھا دیتی ہے
راستے اندھے فقیروں کی طرح
کسی رہ گیر کی آہٹ پہ لگے رہتے ہیں
اور ویران مکانوں کے در و بام سے ٹکرا کے ہوا
جانے والوں کو صدا دیتی ہے
بستیاں راکھ ہوئی ہیں لیکن
کس پہ الزام دھریں!
جلنے والوں میں ہی شامل ہیں جلانے والے
مرنے والے ہی جہاں مارنے والے ہوں وہاں
کون بتلائے کہاں ظلم ہوا، کس پہ ہوا، کس نے کیا!
تیغ بر دوش ہیں سب زخم دکھانے والے!

سرخیٔ خوں سے مبرا کوئی دامان نہیں
اب یہاں ظالم و مظلوم کی پہچان نہیں!!
کہتے ہیں جن بستیوں میں یہ پہچان اور تفریق ختم ہو جائے تاریخ ان کے بارے میں خاموش ہو جایا کرتی ہے۔
کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر اس کے بنیادی عوام کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کی جائے تو مندرجہ ذیل باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں مہاجر آبادی کا ارتکاز
۲۔ غریب مہاجر کا غریب تر اور امیر کا امیر تر ہوتے چلے جانا
۳۔ سندھی مہاجر تعلقات (نوکریاں، وسائل کی تقسیم، کوٹہ سسٹم، مقامی غیر مقامی کا جھگڑا)
۴۔ مذہبی فرقہ واریت
۵۔ ایم آر ڈی کی تحریک، سندھی ردعمل (وڈیرا سیاست، نوجوان سندھی کی بدظنی، ڈاکو گردی)
۶۔ ضیاء الحق کی سندھ پالیسی (جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی کو دبانے کے لیے مہاجر کارڈ کا استعمال)
۷۔ ایم کیو ایم (مقبولیت، اندرونی اختلافات، عوامی توقعات کا دباؤ اور انتظامی اقدار کی کمی)
۸۔ بھارت کا کردار (کشمیر میں پاکستانی مداخلت کا جواب، را کی دہشت گردی)
۹۔ بین الاوامی سطح پر بیروت اور ہانگ کانگ کے متبادل کے طور پر کراچی کی اہمیت۔
۱۰۔ پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے معاشی اور صنعتی مرکز کو مسلسل غیر متوازن حالت میں رکھنا۔

یقیناً ان کے علاوہ کچھ اور چھوٹے اور نسبتاً کم اہم عوام بھی ہیں لیکن ہم نے فی الوقت صرف ان عوامل کی نشاندہی کی کوشش کی ہے جنہیں اس کہانی کے مرکزی کراروں کی جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام اہل فکر و نظر ان مسائل اور عوامل سے اچھی طرح باخبر ہیں اور اصولاً ارباب بست و کشاد کو ان سے بھی زیادہ باخبر ہونا چاہیے کہ انہیں نہ صرف بہت سی ایجنسیوں کی خدمات حاصل ہیں بلکہ بہت سے ایسے ذرائع بھی حاصل ہیں جن کی مدد سے ان مسائل کی سنگینی اور شدت کو فوری طور پر کم اور مستقل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر ہم سب کس بات کا انتظار کر رہے ہیں!

◆◆◆

آزاد سوچ اور غلام معاشرے

مکمل آزادی کی طرح مکمل آزاد فکر بھی شاید ایک خیال خام ہے لیکن مسلمان معاشروں میں گذشتہ ایک ہزار برس سے انسانی فکر پر جو پابندیاں عائد رکھی گئی ہیں اور جس طرح سے اسپ تازی کو آنکھوں پر کھوپے چڑھا کر اسے تانگنے میں جوتا گیا ہے اس کے نتیجے میں ہم لوگ آہستہ آہستہ مداری کے بچہ جمورا کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور اپنے مسخ شدہ اعتقادات' مفعولی' فکر اور سوال کرنے کی عادت اور جرات سے محرومی کے باعث مجموعی طور پر انسانی ترقی کی دوڑ میں سب سے پچھلی صفوں کی طرف سمٹتے جا رہے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

آئین نو سے ڈرنا' طرز کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے' قوموں کی زندگی میں

اور ساتھ ہی دعا کے پردے میں ایک بہت بڑی اور انتہائی تلخ حقیقت سے بھی یہ کہہ کر پردہ اٹھایا تھا کہ......!

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام' اے ساقی

اقبال نے یہ دونوں باتیں اس صدی کے آغاز میں کہی تھیں اور اب ہم اس کے اختتام کو چھونے والے ہیں۔ اس دوران میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزرا ہے مگر جہاں تک علوم کے بارے میں ہمارا اجتماعی رویہ ہے ہم آج بھی جدید عقلی انداز فکر سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر ہیں۔ اکا دکا اہل فکر و نظر کبھی کبھار اس ''آزاد فکر'' کے حوالے سے بنیادی سوال اٹھاتے ہیں تو ایک دم جیسے زلزلہ سا آ جاتا ہے اور چاروں طرف ایسی ہاہا کار مچتی ہے کہ ان بے ہنگم اور بے معنی آوازوں کے شور میں سوال کرنے والے کی آواز بھوسے میں سوئی کی طرح گم ہو جاتی ہے۔

ارشد محمود نہ تو کوئی فلسفی ہیں نہ نظریہ ساز اور نہ نام نہاد معلم اخلاق۔ وہ ایک ایسے دانش مند دانشور ہیں جو اس گئے گزرے زمانے میں بھی سوچنے' غور کرنے' سوال کرنے اور اپنے نتائج خود اخذ کرنے کا شوق اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ گذشتہ ۲۳ برس سے تلاش روزگار کے سلسلے میں ابوظہبی میں مقیم ہیں اور اپنے مطالعے اور مشاہدے میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے مضامین اور کتابیں لکھتے رہتے

ہیں۔آج کل ہم ان کی کتاب ''تصور خدا'' پڑھ رہے ہیں۔کتاب پر تو انشاء اللہ کبھی الگ سے باضابطہ طور پر لکھیں گے اس وقت ہم ان کے دیباچے سے کچھ اقتباسات نذرقارئین کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے خیال میں ارشد صاحب کی یہ باتیں انتہائی اہم،قیمتی اور خیال افروز ہیں اوران پر جتنا بھی غور کیا جائے کم ہے۔لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ ان پر تھوڑا بہت عمل بھی کرلیا جائے تو سبحان اللہ.......

''ہمارے ہاں فکر وعقل پر قدغن کی روایت اتنی شدید رہی ہے کہ بیک وقت ریاستی،معاشی اور سیلف سنسر شپ کارفرما ہوتے ہیں، ایسے میں کسی اتھارٹی کو بے لباس دیکھ کر بھی ننگا نہیں کہا جاتا بلکہ ایک دوسرے کی تال پر اسے لباس فاخرہ قرار دے کر واہ واہ کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں کہ ہر ایک کو نہ صرف اپنی جان،مال اور عزت پیاری ہوتی ہے بلکہ ان میں اضافہ بھی درکار ہوتا ہے جو قائم شدہ افکار اور اقدار حیات کی بڑھ چڑھ کر تحسین سے ہی ہوسکتا ہے۔.......

.... تحقیق واصلاح کی مخالف قوتیں معاشرے کو جہالت کی تاریکی میں ڈبوئے رکھنے کے لیے مزید حوصلہ مند ہوجاتی ہیں اس طرح کے حالات میں جامد معاشروں کے ذہین افراد میں بھی افسوس ناک رویئے پیدا ہوجاتے ہیں جو وقت کا پہیہ الٹا چلانے کے مترادف ہوتا ہے۔

مثلاً ہمارے ہاں ''اپنی اقدار'' پر زور دینے کا بہت فیشن ہے۔ذرائع ابلاغ پر کچھ بھی ایسا کرنے پر سختی سے پابندی کی بات کی جاتی ہے جو''ہماری اقدار'' کے خلاف ہو۔اب یہ''ہماری اقدار'' والی ترکیب بڑی عجیب ہے۔پوری انسانی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا کہ اقدار کبھی مستقل طور پر جامد وساکت ہوگئی ہوں۔یا تو معاشرے اپنی پیاری قدروں سمیت فنا ہوگئے یا پھر وہ بدلتی ہوئی اقدار کو اپنا کر فطرت وحیات کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھتے رہے۔سوال یہ ہے کہ یہ''اقدار'' کب تک ''ہماری'' رہیں گی۔تاریخ اور قوموں کے پیمانے تو بڑی بات ہے اگر ہر شخص خود اپنی زندگی کا جائزہ لے تو اسے احساس ہوگا کہ کل کی کتنی عزیز اقدار اسے بتائے بغیر زندگی سے یوں خارج ہوگئیں کہ پتہ بھی نہیں چلا۔

ہمارے ہاں اس فکری جمود کے شاخسانے کا دوسرا فیشن یہ ہے کہ اگر ہم بڑی دانشورانہ ترنگ میں آئیں تو تمام مسائل کا حل زیادہ سے زیادہ کہنہ اقدار کی طرف لوٹ جانا تجویز کرتے ہیں۔دلیل یہ ہے کہ ہم نے پرانی اقدار چھوڑ دی ہیں اس لیے قوم اخلاقی طور پر بے راہ رو ہوگئی ہے جبکہ مسئلہ الٹا ہے۔پرانی اقدار تو اب لوٹ کر نہیں آسکتیں۔معاشرے کی بے راہ روی اس لیے ہے کہ ہم نئی اقدار پیدا نہیں کر رہے یا ان سے خوف زدہ ہیں اور انہیں قبول نہیں کر رہے۔

نہ جانے ماہرین ''ذہانت'' کی کیا تعریف کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی تعریف ''مشکل پسندی'' بھی کی جاسکتی ہے کیونکہ تمام ذہین افراد اصل میں مشکل پسند ہوتے ہیں اور خود کو انتہائی مشکل صورتحال میں ڈالتے اور انتہائی پیچیدہ گتھیوں میں خود کو الجھاتے ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے نئی منزلوں کی جانب راہیں آسان ہوجائیں۔.......

ہمارے ہاں صورتحال مختلف ہے۔ معاشرے کا بیشتر ذہین وفطین طبقہ جسے اپنی فطرت کے مطابق بے چین' مشکل اور اختراع پسند ہونا چاہیے وہ سہل انگیزی کی راہ پر چل رہا ہے اور ان مصنوعی لیکن جذباتی اور مقدس مسائل کی زلفوں کا اسیر ہے جو اسٹیبلشمنٹ نے اپنے مفادات کے لیے پیدا کر رکھے ہیں۔ وہ ایسی بات برملا کہنے کی جرات نہیں کرتا جس سے ہماری سماجی وقومی اقدار خطرے میں پڑ جائیں۔ حالانکہ اقدار ہوں یا نظریات وہ گزرتے وقت کے پہیے کے نیچے آکر ہر آن دم توڑتے رہتے ہیں اور زندہ قومیں ہر وقت نیا انداز نظر وضع کرنے اور نئی اقدار پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔

مقدس چیز وہ ہوتی ہے جس پر زیادہ سے زیادہ عرصے تک ہاں میں ہاں ملائی جاتی رہے اور کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کی جرات نہ ہو اور نہ ہی اس کا خیال آئے لیکن فکر نو کے لیے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو بریک تھرو ہونا ہی ہوتا ہے کہ فطرت کو ٹھہراؤ قطعی نامنظور ہے۔ ہمارے معاشرے کے معزز ذہین افراد اور اہل دانش سے پوچھ لیجیے کہ ان کی فکر میں جو روشنی اور خوبصورتی پیدا ہوئی کیا وہ ایسی تحریروں کے مطالعہ کی دین نہیں جو ہمارے قائم شدہ نظریات اور اقدار کے خلاف تھیں اور اگر ایسا ہے تو عوام کے سامنے ایسی باتوں کو کیوں نہ آنے دیا جائے تاکہ ان کے سوچنے کی سطح بھی بلند ہو اور معاشرہ صحت مند ترقی کی طرف بڑھ سکے۔ ہمارے ہاں عقل وخرد اور تبدیلی وترقی کی مخاصمانہ قوتیں جو دندناتی پھر رہی ہیں' معاشرے یں برداشت کی کمی' فاشزم اور تفرقہ بازی میں اضافہ' کیا اس وجہ سے نہیں کہ ہمارے سوسائٹی صدیوں سے تنگ کنویں کے اندر بند پڑی ہوئی ہے۔ کیا ذہن تک افکار کی تازہ ہوائیں آنے اور علم کی کرنیں پڑنے دی گئیں.......؟

پس ماندہ اقوام میں ایک فکری ''رینی سینس'' (فکر نو کے احیاء کا عہدہ) برپا کرنے کی اشد ضرورت ہے لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک قوم کے افراد اور اداروں کو فکری ''اٹانومی'' (خود اختیاری) نہ ہی ایک آزاد خوش حال اور تعلیم یافتہ پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے...... کیا آج ہمارے ہاں علم اور دیانت کمزور ترین اقدار اور منافقت اور جہالت طاقتور ترین ادارے نہیں بن گئے.......؟''

◆◆◆

ایک ساتھ

قیام پاکستان کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کا آغاز یوں تو یکم جنوری ۱۹۹۷ء سے ہی ہوگیا تھا لیکن جوں جوں ۱۴ اگست کا دن نزدیک آرہا ہے اسے شایان شان طریقے سے منانے کی تیاریوں میں بھی تیزی اور جوش وخروش بڑھتا چلا جارہا ہے مگر سرسری نظر سے دیکھنے پر نہ تو کوئی خلاف معمول قسم کی گہما گہمی نظر آتی ہے اور نہ ہی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کوئی ایسا تاثر بنا رہا ہے جس سے ان ''تیاریوں'' کی وسعت کا کچھ اندازہ ہوسکے یعنی اقبال کے اس شعر میں اگر کچھ معنوی تصرف کرلیا جائے تو صورتحال کچھ ایسی ہے کہ

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے؟

ذاتی طور پر ہم اس طریق کار کے حق میں نہیں ہیں کہ گولڈن جوبلی سال کی تقریبات کو ۱۴ اگست کے دن سے مشروط کردیا جائے اور یوں اس مخصوص صورتحال یعنی وطن عزیز کی پچاس ویں سالگرہ کو اس کے یوم آزادی کے ۲۴ گھنٹوں کے اندر محدود کردیا جائے کیونکہ ایسا تو ہم ہر سال ہی کرتے ہیں بلکہ یہ تو ایک قدم پیچھے جانے والی بات ہے کہ ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں یکم اگست سے چودہ اگست تک ٹی وی اور ریڈیو سے لے کر گھروں کی چھتوں اور مختلف سواریوں پر لگے ہوئے قومی پرچموں تک ایک ایسی فضا سی بن جاتی تھی جس میں آزادی اور یوم آزادی کے ساتھ پوری قوم کسی نہ کسی حد تک رشتہ آرا نظر آتی تھی' ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس بار یہ عمل یکم جنوری سے شروع ہوتا اور ۳۱ دسمبر تک ایک سوچے سمجھے تدریجی ارتقاء کے ساتھ فروغ پذیر رہتا اور اگست کے مہینے میں ہم ایک ایسے نقطہ عروج پر پہنچتے جو اپنی مثال آپ ہوتا۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت نے اپنے گولڈن جوبلی سال کو ۱۵ اگست ۹۷ء سے شروع کیا ہے اور اس کا اختتامی نقطہ ۱۴ اگست ۱۹۹۸ء مقرر کیا ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت پاکستان کو بھی یا تو اسی طریقہ کار کو اپنانا چاہیے تھا یا پھر ۲۳ مارچ ۹۷ء سے ۲۳ مارچ ۹۸ء کو گولڈن جوبلی سال کا زمانہ قرار دینا چاہیے تھا تاکہ ہم اپنے الگ تشخص کے ساتھ ساتھ خواب اور تعبیر خواب' دونوں کی علامتوں کو ساتھ لے کر چلتے۔ الیکشن ۹۷ء کے انعقاد کی وجہ سے گولڈن جوبلی سال کی تقریبات کا تعین اور انتظام تین حکومتوں کی الگ الگ پالیسیوں میں فٹ بال کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکتا رہا جس کے باعث یہ عظیم قومی نوعیت کا فیصلہ ایڈہاک ازم کا شکار ہوتے ہوتے الجھے ہوئے اون کے گولے کی طرح حجم میں بڑھتا لیکن اصل میں بے چہرہ ہوتا چلا گیا۔ اس تکلیف

دہ صورتحال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وفاقی وزیر ثقافت شیخ رشید احمد کو اس وقت اس پراجیکٹ کا انچارج مقرر کیا گیا جب آدھے سے زیادہ سال گزر چکا تھا اور ۱۴ اگست کا تاریخی دن صرف ایک ماہ کے فاصلے پر تھا۔ یوں تو مرکزی حکومت اور چاروں صوبائی حکومتوں کی سطح پر بہت سی کمیٹیوں کی بے شمار میٹنگز میں ہزاروں کے حساب سے کاغذ اکالے کیے گئے ہیں اور فائلوں کی حد تک پورے ملک میں گولڈن جوبلی سال کو مختلف تقریبات سے اس قدر لاد دیا گیا ہے کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رہ جائیں مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ابھی تک عوام نہ صرف ان تمام کارروائیوں سے بے خبر ہیں بلکہ اعتماد میں نہ لیے جانے کا باعث ایک ایسی مخمصے میں گرفتار ہیں جسے بعض لوگ سرد مہری' جذبے کی کمی اور عدم شمولیت سے تعبیر کر رہے ہیں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مختلف حیلوں اور حوالوں سے قوم میں مایوسی اور بددلی کو ہوا دے رہا ہے اور سارا زور اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ جشن کس بات کا منایا جائے؟ ان کا کہنا ہے کہ اس قدر کرپشن' بیروزگاری' غربت' ناانصافی' طبقاتی تقسیم' دہشت گردی' قانون شکنی اور جہالت کے ہوتے ہوئے ہمیں گولڈن جوبلی سال منانے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ شیخ رشید اور اشفاق احمد صاحب نے ایک محفل میں گفتگو کرتے ہوئے اس رویئے کی مذمت کی اور کہا کہ بلاشبہ مذکورہ بالا تمام باتیں اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہیں لیکن ان کے حل اور اس میں ہونے والی کوتاہیوں کو بنیاد پر قومی تاریخ کے اس اتنے بڑے اور اہم سنگ میل سے صرف نظر کرنا گویا ایک غلطی کے جواب میں ایک اور غلطی کرنا ہے کہ کچھ بھی ہو آزادی کی نعمت کی قدر اور شکر ہم پر واجب ہے کہ یہ رب کریم کا عطا کردہ ایک ایسا عظیم اور انمول تحفہ ہے جس کا صرف ہونا ہی بے شمار منفی حوالوں پر بھاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غلامی ایک لعنت اور مجبوری ہے جبکہ آزادی ایک امتحان اور ذمہ داری ہے جو اپنے ساتھ بہت سے تقاضے لے کر آتی ہے ان تقاضوں کی ادائی میں کتنی بھی کمی کیوں نہ رہ جائے بہرحال اس پر غلامی کو ترجیح نہیں دیا جا سکتا۔

ہم چونکہ ان دونوں احباب کے تجزیئے سے اتفاق کرتے ہیں اس لیے ساری باتوں کو ایک طرف رکھ کر گولڈن جوبلی سال کو پورے جوش و خروش اور کمٹ منٹ کے ساتھ منانے کے حق میں ہیں کہ یوں مل جل کر ایک ساتھ اٹھنے' بیٹھنے' سوچنے اور قدم ملا کر چلنے سے نہ صرف باہمی محبت بڑھے گی' راستے صاف اور بہتر نظر آئیں گے بلکہ ہماری قوت عمل اور ترتیب ترجیحات کی تفہیم میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔ ہمارے نزدیک معاشرے میں پھیلی ہوئی مایوسی' بے عملی' بے یقینی' مغائرت اور نفاق کو دور اور کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم ۱۳ اور ۱۴ اگست کی درمیانی رات کو بارہ بج کر ایک منٹ پر کوئی ایسا کام کریں جس میں وطن عزیز کا ہر فرد یکساں طور پر حصہ لے۔ جس طرح عیدالفطر پر گھر کے ہر فرد کا فطرانہ ادا کیا جاتا ہے اسی طرح سب لوگ بچے' جوان اور بزرگ اس موقعے پر اس اجتماعی عمل

میں انفرادی طور پر حصہ لیں شکرانے کے نفل ادا کریں' اپنے اپنے گھروں پر قومی جھنڈے لہرائیں' قومی ترانہ گائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۴ اگست کی تاریخ شروع ہوتے ہی وطن عزیز کا ہر فرد (جہاں بھی وہ موجود ہو) وطن کی آزادی کے نام پر ایک دیا' موم بتی' بجلی کا بلب یا روشنی کا کوئی بھی سمبل ضرور روشن کرے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر تیرہ کروڑ دیئے ایک ساتھ روشن ہو جائیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی ظلمت کا جادو بھی توڑا جا سکتا ہے۔ بس ایک بار ایک ساتھ کھڑے ہو کر دیکھئے تو سہی۔

◆◆◆

یہ عالمی اعزاز......!!

گزشتہ کئی برسوں سے ہر سال ہمیں انگلینڈ اور امریکہ سے بہت خوشنما لفافوں اور بڑے بڑے مرعوب کن ناموں والے کچھ اداروں کے خط موصول ہو رہے تھے جن کا عمومی پیغام یہ ہوتا تھا' بلکہ ہے کہ آپ کی ''عظیم' غیر معمولی' عہد ساز'' وغیرہ وغیرہ قسم کی صلاحیتوں اور کارکردگی کے پیش نظر آپ کا نام بیسویں صدی کے یا اس کے آخری عشرے کے ''نامور' غیر معمولی اور باکمال'' لوگوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے اور یہ کہ یہ اعزاز پوری دنیا میں بعض منتخب افراد کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس نوع کے خط کا فوری ردعمل بہت مثبت ہوتا ہے اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ کنوئیں سے نکل کر سمندر کے سفر پر گامزن ہو رہا ہے اور یہ کہ اس کی غیر معمولی شہرت اور قابلیت کا لوہا گورے ملکوں کے اہل علم وفن نے بھی مان لیا ہے اور اب گویا نوبل انعام چند ہی قدم کے فاصلے پر رہ گیا ہے کہ انعام دینے والے بھی یقیناً ان ''عظیم اور شاندار'' ڈائریکٹریوں سے استفادہ کرتے ہوں گے جن میں ہمارے نام اور کارنامے درج ہو کر ہمیشہ کے لیے جریدہ عالم پر ثبات دوام حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن یہ ساری تصویر ان وقت غیر واضح اور دھندلی ہو جاتی ہے جب آپ اس خط کے ساتھ ایک اور پر فارم نما خط دیکھتے ہیں جس میں درج ہوتا ہے کہ اگرچہ آپ سے اس انٹری کی کوئی قیمت وصول نہیں کی جائے گی (کیونکہ یہ اندراجات ایک عظیم اور عالمی سطح پر قائم کردہ تحقیقی عمل کا نتیجہ ہے۔) لیکن ڈائریکٹری کی کاپی کے لیے آپ کو اپنی جیب خاص سے غیر ملکی زرمبادلہ کی شکل میں تین چار سو پاؤنڈ یا ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ جب ان تین چار سو پاؤنڈ اور ڈالرز کو ۶۵ یا ۴۲ سے ضرب دی جاتی ہے تو نتیجہ کئی ہزار روپوں کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔
اب یہاں سے یقین اور شک کے درمیان ایک کشمکش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ کیا واقعی یہ ادارے سچ مچ کے ادارے ہیں یا ان کا حال بھی ہمارے یہاں کی فنانس کمپنیوں اور کوآپریٹو اداروں جیسا ہے؟ اور یہ محض پیسہ کمانے کے چکر ہیں؟ کیونکہ گورے لاکھ ایماندار' منظم اور علم دوست سہی مگر ان میں بھی کچھ نہ کچھ فراڈیئے تو یقیناً ہوں گے اور آخری بات یہ کہ کیا اس طرح پیسے دے کر اپنا نام کسی کتاب میں لکھوانا یا ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ پر کندہ کروانا کوئی معقول بات ہے؟ ایک دوست نے کہا کہ یورپ اور امریکہ والے کوئی کام مفت نہیں کرتے بلکہ امریکہ میں تو محاورہ ہے کہ ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر آدمی کو اپنا دوپہر کا کھانا خود خریدنا پڑتا ہے۔'' سو ممکن ہے کہ اسی اصول کے تحت وہ لوگ آپ کو آفر کی جانے والی چیزوں کی ''لاگت'' طلب کرتے ہوں؟

بوجوہ ہم نے ان میں سے کسی خط کا جواب نہیں دیا لیکن اب گزشتہ کچھ عرصہ سے جب ہر دوسرے چوتھے کسی اخبار میں یہ خبر چھپنا شروع ہوگئی کہ فلاں صاحب کا نام ان کی عظیم اور غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں امریکہ یا یورپ کے شائع ہونے والی فلاں فلاں ڈائریکٹری میں شامل کرلیا گیا ہے اور یوں انہیں ایک عالمی اعزاز سے نوازا گیا ہے تو ہم نے سوچا کہ اس معاملے کی کوچ تفتیش کر رہی لینی چاہیے' سو ہم نے امریکہ اور انگلینڈ میں اپنے کچھ احباب کو خط لکھے اور ساتھ ہی ان متلعقہ عالمی اداروں کے خطوان کو بجھوائے کہ وہ ذاتی اور مقامی طور پر کھوج لگا کر بتائیں کہ اس معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے؟ ان کے جوابات سے جو مجموعی نتیجہ نکلتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ......

ا۔ان اداروں کو کوئی علمی' ادبی' سماجی حیثیت کم از کم ان کے ملکوں میں نہیں ہے۔

۲۔ان اداروں کی شائع کردہ ڈائریکٹریاں کسی معقول لائبریری میں بھی جگہ نہیں پاتیں۔

۳۔ان نام نہاد اعزازات اور ایوارڈ کے تعین کا سوائے ''کاروبار'' کے کوئی طریقہ کار نہیں اور اگر کوئی طریقہ کار ہے تو وہ اسی طرح کا ہے جیسے ہمارے بچپن میں کچھ خطوط ڈاک سے یا دستی ملا کرتے تھے کہ جو اسے پڑھے اس طرح کے تیس اور لکھ کر لوگوں میں تقسیم کرے ورنہ عذاب کے لیے تیار رہے۔ ہمارے علم کے مطابق اس ''انتخاب'' کا سب سے چالو طریقہ یہ ہے کہ آپ جس شخص کو اس اعزاز کی خوشخبری دیں اسی سے ایک دو یا اس سے زیادہ لوگوں کے ریفرنس حاصل کرلیں اور پھر اس سلسلے کو ''چل سو چل'' کے انداز میں چلاتے رہیں۔ان ایوارڈوں کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ان پی ایچ ڈی کی ڈگریوں جیسی ہے جو امریکہ کی سنچری یونیورسٹی یا اس قبیل کی شعبدہ باز پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی اسناد جیسی ہوتی ہے جو مطلوبہ رقم خرچ کر کے بذریعہ ڈاک حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اس تحریر سے ہمارا مقصد ان احباب کی دل آزاری ہرگز نہیں ہے جنہوں نے یہ اعزازات حاصل کیے ہیں یا ان کی خبریں چھپوائی ہیں۔ہم تو صرف احباب کی توجہ ان کی اصلیت کی طرف دلوانا چاہتے ہیں کہ اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

ہمارے دوست محمود قریشی ایک زمانے میں گھڑیوں کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے انہیں ایک بہت خوبصورت گھڑے دکھاتے ہوئے کہ یہ انہیں تحفے میں ملی ہے' اندازکتنی قیمت ہوگی......؟

محمود قریشی نے غور سے گھڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر مسکرا کر جواب دیا۔''بھئی! اس طرح کی اصلی گھڑی تقریباً چار سو روپے میں ملتی ہے یہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو کی ہوگی۔''

◆◆◆

آہ وہ قوم نجیب وچرب دست وتر دماغ

وطن عزیز کی آزادی اور کشمیر کی غلامی دونوں کی عمر اب نصف صدی کو چھو رہی ہے ان اڑتالیس برسوں میں فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہم جاگ رہے تھے اور کشمیر نیند میں تھا اور آج کشمیر بیدار ہے اور ہم.......

کشمیر اور کشمیریوں کی اس نیند سے بیداری کی داستان بہت طویل ہے۔ جون ۴۸ء کی جنگ اور اس کے نتیجے میں آزاد ہونے والے کشمیر کی علیحدہ حکومت کے قیام سے لے کر ۶۵ء کی جنگ تک مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے کشمیریوں سے زیادہ پاکستانی عوام اور حکومتوں نے سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں گاندھربل میں ہندوستانی فوج کی بہیمانہ کاروائیوں سے لے کر حضرت بل سے موئے مبارک کی چوری تک صورتحال کچھ ایسی تھی کہ بقول شاعر

کہ زخم تجھ کو لگے اور چوٹ آئے مجھے

لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ برف پگھلنے لگی۔ مقبوضہ کشمیر کے ہندوستان پرست کشمیری لیڈروں کے چہروں سے نقاب اترنے لگے اور وادی کے عوام کا اعتبار ان پر سے اٹھنے لگا۔ اس تبدیلی کی ایک اور وجہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک بھی تھی جنہوں نے گولڈن ٹیمپل پر ہندوستانی فوج کے حملے کو اپنی حرمت پر وار تصور کیا اور بالآخر اس قومی توہین کے سب سے بڑے مجرم اندرا گاندھی کو ختم کر کے دم لیا۔

کشمیروں کو ان کے بنیادی حقوق اور آزادی کی نعمت سے محروم رکھنے کے لیے پنڈت نہرو اور شیخ عبداللہ کا گٹھ جوڑ تو مطلوبہ نتائج مہیا کرتا رہا مگر جب بات اندرا گاندھی اور فاروق عبداللہ تک پہنچی تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ کشمیروں کے جذبہ حریت کو عملی جدوجہد کی شکل دینے میں دیگر کئی عوامل کے ساتھ ساتھ سب سے اہم رول افغانستان پر روسی جارحیت اور افغانوں کی شدید اور کامیاب مزاحمت نے ادا کیا کہ روس بہر حال بھارت کی نسبت بہت بڑے طاقت تھا اور اس وقت دنیا کی دوسری بڑی سپر پاور کا درجہ رکھتا تھا۔

سو ہوا یوں کہ وہ کشمیری قوم جس کی آزادی کی بات اب محض ایک رسمی کاروائی بن چکی تھی ایک کروٹ لے کر جاگی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری وادی قابض ہندوستانی فوجوں کے بالمقابل سیسہ پلائی دیوار بن گئی اور سارے علاقے پر سے ہندوستانی ایڈمنسٹریشن کی

گرفت نہ صرف کمزور پڑنے لگی بلکہ کشمیروں نے اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ تبدیلی اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ شروع شروع میں تو کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے اور آئندہ چل کر اس کی کیا صورت بننے والی ہے!

بھارتی حکومت نے حسب معمول اور حسب توقع اس سرے عمل کو پاکستان کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی اور ساری دنیا میں مختلف پلیٹ فارموں پر واویلا شروع کر دیا کہ پاکستان فوج' ایجنسیاں اور حکومتی ذرائع' مقبوضہ کشمیر کی صورتحال کو بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں اور کشمیر کی جنگ آزادی دراصل پاکستانیوں کا چھوڑا ہوا ایک شوشہ ہے۔ دوسری طرف پاکستانی حکومتوں کا یہ عالم تھا کہ جنرل ضیاء الحق' جونیجو صاحب' بے نظیر' نواز شریف اور اب پھر بے نظیر کی حکومت .... سب کے سب کشمیر کی صورتحال کی تفہیم اور اس کے مطابق اپنے رویئے کو متعین کرتے رہے لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

ہم نے پہلے بھی کئی ایک کالموں میں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان اور قوم کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کی کوشش کی ہے اور اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ مسئلہ صرف نعروں' ہڑتالوں اور بیان بازیوں سے حل ہونے والا نہیں۔ بھارت کے عوام کی اکثریت بھی اپنی حکومت کی کشمیر پالیسی سے خوش نہیں۔ ان کے ذرائع ابلاغ کچھ بھی کہتے رہیں یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بھارت کے لیے کشمیر ایک ایسی ہڈی بن چکا ہے جسے اگلنا یا نگلنا اس کے لیے یکساں طور پر دشوار ہے اور اگر کوئی ایسی صورت کسی طرح فراہم ہو جائے جس میں بھارتی حکومت احساس شکست کی ندامت کے بغیر اپنے ذہنی تحفظات کی غیر مرئی گرفت اور کشمیر کی علیحدگی سے بقیہ ہندوستان کی متوقع شکست و ریخت کے اندیشوں سے نکل سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ معاملہ کسی مستقل اور قابل قبول حل کی طرف نہ بڑھ سکے۔ موجودہ تلخ' سنگین اور جذباتی ہیجان کی کیفیت میں ممکن ہے ہماری یہ بات بہت تصوراتی اور بعید از حقیقت محسوس ہو لیکن تاریخ عالم اور خصوصاً دوسری جنگ عظمیٰ کے بعد سے ہمسایہ ملکوں کے مابین اس نوع کے جھگڑوں کی تفہیم کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایسا ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ اگر ذرا سا ہٹ کر اور اوپر ہو کر اس منظر پر نظر ڈالی جائے تو نکلنے کے بہت سے راستے سامنے پڑے دکھائی دیں گے۔ آج نہیں تو کل بھارت اور پاکستان دونوں کو اپنی بقا' سلامتی' ترقی' خوشحالی اور اپنے عوام کی بہتری کے لیے ایک دوسرے کے قریب آنا ہی پڑے گا۔ تلواروں کے قبضوں پر رکھے ہوئے ہاتھوں کو ایک دوسرے کی طرف مصافحے کے لیے بڑھانا ہی پڑے گا چاہے یہ کام عقل اور مدبر سے بغیر خون بہائے ہو یا موجودہ جنگی جنون کے باعث آبادیوں اور بستیوں کو تباہ کرنے کے بعد۔

کشمیر کا مسئلہ ہو یا کوئی اور' پاک بھارت کشیدگی یا جنگ سے دونوں میں سے کسی ملک کو بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا البتہ کچھ اور متعلقہ پارٹیوں کی ضرور چاندی ہو جائے گی۔ سو اگر ہم پاکستانی سچ مچ پورے خلوص قلب سے کشمیر کی آزادی اور کشمیروں کے انسانی حقوق کی

بحالی چاہتے ہیں (اور یقیناً ہم ایسا ہی چاہتے ہیں) تو ہمیں جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینا پڑے گا۔ بعض اوقات بے طرح الجھی ہوئی ڈور کا اگر صحیح سرا پکڑ لیا جائے تو سارے کھنجل کھلتے چلے جاتے ہیں۔

◆◆◆

دسمبر کے آخری دن

آخری	چند	دن	دسمبر	کے
ہر	برس	ہی	گراں	گزرتے	ہیں
خواہشوں	کے	نگار	خانے	سے
کیسے	کیسے	گماں	گزرتے	ہیں

اوراب پھر دسمبر کے آخری دن ہیں۔

عرش صدیقی مرحوم نے کہاتھا........ اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے۔

مگر اس گذشتہ ایک برس میں وہ خود اپنے ہی کہے ہوئے مصرعے کے ''مخاطب'' بن گئے ہیں!

اردو کے عظیم ترین شاعر مرزا اسداللہ خان غالب کا دوسوواں یوم پیدائش بھی دسمبر کے انہی آخری چند دنوں میں ہے اور ہماری آپ کی سب کی عزیزہ پروین شاکر کو اس دارفانی سے کوچ کیے بھی ۲۶ دسمبر کو تین برس ہو جائیں گے جبکہ اس کا پیارا بیٹا گیتو اٹھارہ برس کا ہو گیا ہے!!

اور قومی سطح پر دسمبر ۹۶ء اور دسمبر ۹۷ء کے درمیان پلوں کے نیچے سے اتنا پانی گزر رہا ہے کہ دریا ہی کچھ اور سے اور ہو گیا ہے!

اللہ کرے کہ ۳۱ دسمبر کے صدارتی انتخابات کے ساتھ ۱۹۹۷ء کے اندیشوں اور وسوسوں کا وہ موسم بھی ختم ہو جائے جس نے گذشتہ کئی مہینوں سے ہمارے چاروں طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور ۹۸ء کا سال ہمارے اہل وطن، دنیا بھر کے مسلمانوں اور تمام اہل زمین کے لے امن وسکون اور برکتوں کا سال ثابت ہو۔

آتے جاتے دن اگرچہ انسانوں کی خوشیوں اور غموں سے بے نیاز ہوتے ہیں لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود انسانوں کے تمام دکھ سکھ انہی دنوں کے اندر کہیں سانس لیتے رہتے ہیں۔ایک طرف سورج ڈھلتا ہے اور رات اترنا شروع ہوتی ہے اور دوسری طرف آخر شب کے ستاروں کے عقب میں طلوع سحر کی سرخی دیکھنے والی آنکھوں کو روشن اور منور کر رہی ہوتی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض!
اک براہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"

جبکہ زمانہ حال کا شاعر کچھ یوں کہتا ہے کہ

حالات حاضرہ کو کئی سال ہو گئے

حق بات یہ ہے کہ ہم نے اپنی ادبی تاریخ کے اس بہت اہم واقعے، یعنی غالب کے دوسوویں یوم پیدائش کو جس بے دلی اور دم توجہی سے منایا اور گزارا ہے وہ غالب کے شایان شان تو کیا، ہر اعتبار سے اس کے ساتھ گستاخی کا درجہ رکھتا ہے۔ غالب اپنے آپ کو بجا طور پر شاعر آئندہ کہتا اور سمجھتا تھا۔

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

اور وہی یہ کہنے کا بھی حق رکھتا تھا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامۂ نوائے سروش ہے

اردو زبان کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہیے کہ قدرت نے اسے غالب جیسا عظیم شاعر عطا کیا جو قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھنے کی استعداد اور حوصلہ رکھتا تھا اور جو خدا انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کی ریافت اور بازیافت میں انسانی جبر اور اختیار کے ایسے جرت مندانہ اور تخلیقی مرحلوں کا بھی رازداں تھا کہ

گل غنچگی میں غرقہ دریائے رنگ ہے
اے آگہی! فریب تماشا کہاں نہیں!
دیر و حرمٔ آئینہ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں!

انسانی ذہن میں اٹھنے والے بنیادی سوالات اور ان سے ملحقہ فکری اور فلسفیانہ الجھنوں کو پیش کرنے میں جو کمال غالب کو حاصل تھا

اس میں اس کا کوئی ثانی نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ عبودیت اور سپردگی کے بیان میں بھی جو پیرائے انہوں نے برتے ہیں ان کی مثال بھی پوری اردو شاعری میں کم کم ہی ملے گی۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے' اگر حسن نہ ہوتا خودبیں!

اور یہ کہ

فسردگی میں ہے فریاد بے دلاں' تجھ سے
چراغ صبح' گل موسم خزاں' تجھ سے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اٹھارہویں' انیسویں اور بیسویں صدی اردو شاعری کے حوالے سے بالترتیب میر' غالب اور اقبال کی صدیاں ہیں لیکن ان بلند ترین میناروں کے ساتھ بہت سے اور روشن برج منارے بھی ہیں جو اپنے اپنے وقت اور زمانے کے نہ صرف نمائندے رہے بلکہ اردو کی مجموعی تاریخ میں بھی ان کا نام نامی ہمیشہ عزت اور افتخار سے لیا جاتا رہے گا۔ بیسویں صدی کے آٹھویں اور نویں عشرے میں شاعری کرنے والی پروین شاکر مرحومہ یقیناً ایسی ہی خصوصی توجہ اور تخصیص کی مستحق ہے اور یہ امر باعث طمانیت ہے کہ لوگ اسے اور اس کی خوبصورت شاعری کو بھولے نہیں۔ ہم اس کالم کو ۹۷ء میں جدا ہونے والے تمام اہل ہنر کی یادوں کے نام کرتے ہوئے آخر میں پروین شاکر کی نظم ''کتبہ'' کی ابتدائی تین لائنیں درج کرتے ہیں۔

یہاں وہ لڑکی سو رہی ہے
کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب مول لے کر
وصال کی عمر رتجگے میں گزار دی تھی

کیا واقعی شاعری ''زمان ومکان'' سے آگے کسی اور منطقے میں قیام کرتی ہے!!

◆◆◆

اب قوم کی باری ہے

لیجیے....... وہ دھماکہ تو ہو گیا جس کی گونج سترہ دن سے قوم کے دل و دماغ کو گھیرے میں لیے ہوئی تھی۔ پاکستان نے بالآخر عزت اور خود حفاظتی کا وہ راستہ اپنا لیا جس کے چاروں طرف اندیشوں' وسوسوں اور دھمکیوں کے تہہ در تہہ جالے ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتے جارہے تھے۔ عوامی جوش و جذبہ اور حکومت کے ردعمل اور فیصلے میں تاخیر سے پھیلنے والی مایوسی اور بددلی اپنی جگہ' مگر یہ کہنا کہ دھماکے کی مخالفت کرنے یا اس کے متوقع نتائج کے حوالے سے تذبذب میں مبتلا سب لوگ بزدل' ڈرپوک اور اپنے مفادات کے اسیر تھے' ایک انتہائی غلط اور احمقانہ نتیجہ ہوگا۔ زندہ قومیں اپنے فیصلے جذبات کے ساتھ ساتھ فہم و فراست اور ٹھنڈے دل و دماغ سے وسیع تر قومی مفاد کو سامنے رکھ کر کرتی ہیں۔ ذاتی طور پر ہمارا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ ہندوستانی دھماکے کی گونج ختم ہونے سے پہلے پہلے جوابی دھماکہ کر دیا جاتا مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے اس کی کچھ وجوہات ہوں گی کچھ صلی اور کچھ ہماری عمومی بے عملی اور کوتاہ اندیشی کی پیدا کردہ۔ ان سب کو سامنے رکھنا اور اس عظیم چیلنج کی نوعیت اور وسعت کو مکمل طور پر سمجھ کر بنیادی حفاظتی انتظامات کرنا بہر حال حکومت کی ذمہ داری تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ ''قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں'' کے نعروں کی زبردست جذباتی اپیل کے باوجود حکومت نے فیصلہ کرنے میں جو وقت لیا ہے اس دوران میں آئندہ کے لیے اپنی حکمت عملی پر بھی گہرا اور سنجیدہ غور و فکر کیا ہوگا جس کی جھلک وزیر اعظم کی تقریر میں بھی جگہ جگہ دکھائی اور سنائی دیتی رہی ہے۔ سو اس حوالے سے دیکھا جائے تو اب حکومت کی اس ذمہ داری کی تکمیل اور ادائی میں قوم کی باری ہے۔ پاکستانی قوم کو یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ نعرہ باز' جذباتی' عاقبت نا اندیش اور بڑھکیں مارنے والے لوگوں کا ایک ہجوم نہیں ہے بلکہ ایک ایسا ذمہ دار اور منزل آشنا کارواں ہے جس کا ہر مسافر اپنے حصے کی ذمہ داری کو دل و جان سے پورا کرتا ہے۔

موجودہ صورتحال اگرچہ متوقع ہونے کے ساتھ ساتھ منطقی اور اصولی اعتبار سے ناگزیر بھی تھی لیکن ہمارا دماغ اب بھی یہی کہتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ ایٹمی اسلحے کی اس دوڑ میں انتہائی گراں قیمت دونوں ملکوں کے عوام اور ان کی معیشت کے لیے مزید تباہ کن ثابت ہوگی سامراجی دنیا کی لگائی ہوئی اقتصادی اور دیگر طرح طرح کی پابندیاں پہلے سے موجود پسماندگی کی سطح کو مزید نیچے لے جائیں گی اور یوں دونوں ملکوں کے عوام کی زندگیاں نہ صرف تلخ تر ہوں گی بلکہ مستقبل کی راہوں میں بھی اندھیرا اور بڑھ جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان اس معالے میں ایک ایسی دفاعی پوزیشن میں ہے جہاں اسے آبادی' رقبے اور وسائل کے اعتبار سے ایک چھوٹا ملک ہونے کے حوالے سے اپنی سلامتی اور دفاع کے لیے مجبوراً ہر اس جارحانہ اقدام کا جواب دینا پڑتا ہے جس کا اعلان بھارت کی طرف سے کیا جاتا ہے مگر بھارت کو یہ مجبوری درپیش نہیں اور اگرچین کے حوالے سے وہ اس کا پروپیگنڈہ کرتا ہے تو اس کے لیے پیش کیے گئے تائیدی ثبوت اور دلائل انتہائی بودے اور غیر حقیقی ہیں۔ گزشتہ پچاس برس میں چین نے اپنے کسی اقدام سے توسیع پسندانہ عزائم کا ثبوت نہیں دیا' کسی ہمسائے پر اس نے چڑھائی نہیں کی یہاں تک کہ اپنے تاریخی حصے تائیوان (سابقہ فارموسا) کی بازیافت کے لیے بھی کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں کی' ہانگ کانگ کا ادغام بھی عالمی قوانین اور معاہدوں کی روشنی میں انتہائی امن پسندانہ اور مبنی بر انصاف انداز میں ہوا ہے جبکہ بھارت نے اس عرصے میں اپنے ایک بھی ہمسائے کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا' سکم' بھوٹان' نیپال' سری لنکا' بنگلہ دیش اور پاکستان سب کے سب اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی وجہ سے مستقل اور مسلسل طور پر ایک ناخوشگوار ہمسائیگی کے عالم میں ہیں اور ان سب کا واحد اور بنیادی قصور یہ ہے کہ یہ بھارت کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹے ممالک ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب یہی عمل چین کے ساتھ دہرانے کی کوشش کی گئی تو اینٹ کا جواب پتھر سے ملنے پر دوبارہ اس سے چھیڑ خانی کی نوبت نہیں آئی۔ سو اندریں حالت مسئلہ ''چین کے خطرے'' کا نہیں بلکہ ایشیا کی اس تھانیداری کے خبط کا ہے جو بھارتی رہنماؤں کے ایک گروہ کے سر میں سمایا ہوا ہے۔ ایک گروہ' ہم نے اس لیے کہا کہ بھارت کے سیاسی رہنماؤں کی ایک بہت بڑی اکثریت اپنے ملک کے اس جنگی جنون کے نہ پہلے حق میں تھی اور نہ اب ہے جس کا ثبوت بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے اندرون ملک ردعمل سے بخوبی لیا جاسکتا ہے۔

تاریخ عالم کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ قومیں جو صدیوں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہی ہیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنے تنازعوں کو طے کرنے کے بعد اب گہرے دوستوں اور اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ مستقبل میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات بھی نہ صرف معمول پر آسکتے ہیں بلکہ دونوں ملکوں کے عوام بھی اپنی اپنی سرحدوں میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور خوشگوار ہمسائیگی کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ بھارتی حکومت پاکستان کے وجود کو دل سے قبول کرلے اور باہمی جھگڑوں کو عالمی انصاف کے اصولوں کے مطابق حل کرنے پر رضامند ہو جائے۔

فی الوقت یہ صورتحال ایک خواب اور خواہش اور دور افتادہ امکان ہی سہی لیکن اس کی موجودگی کو بہرحال رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں

یقین ہے کہ بھارتی رائے عامہ کا دباؤ جلد یا بدیر بھارتی قیادت کو یہ ماننے پر مجبور کر دے گا کہ اکیسویں صدی میں جغرافیائی توسیع پسندی' پورس کا وہ ہاتھی ثابت ہوگی جو خود اپنی ہی صفوں کو روند دیتا ہے اور جس کے نتیجے میں دوسروں سے کئی گنا نقصان خود اس کو پہنچے گا (اور پہنچ رہا ہے)

البتہ جب تک یہ عمل شروع نہیں ہوتا پاکستانی قوم کو بھی ایک سے ایک نیا امتحان پیش رہے گا اور ان امتحانوں سے کامیاب اور سرخرو گزرنے کے لیے اسے اپنے ان تمام نعروں کو سچ ثابت کرنا ہوگا جن میں ایٹمی دھماکہ کرنے اور اس کے نتیجے میں ہر طرح کی قربانی دینے کا اعلان' تقاضہ اور وعدہ کیا گیا تھا۔ سو آج ہی سے حکومت کو اپنی ترجیحات از سر نو متعین کرنا ہوں گی اور ملک کے اندر موجود وسائل کی دیکھ بھال' ترقی استعمال اور نشوونما کے لیے ہنگامی بنیادوں پر پروگرام شروع کرنے ہوں گے اور عوام و اپنے عمل سے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ معاشرے سے کرپشن' خود غرضی' بے عملی' سرکاری وسائل کے ناجائز استعمال' میسک چوری' نفع اندوزی' فضول خرچی' سمگلنگ' فرقہ وارایت' صوبائی تعصبات اور فرائض سے غفلت کے رویئے کو بدلنے میں ان توقعات پر پورا اتریں گے جو صرف ان سے وابستہ ہی نہیں کی گئیں بلکہ موجودہ چیلنج کے حوالے سے ایک ایسی کسوٹی کی شکل اختیار کر گئی ہیں کہ جس پر (خدانخواستہ) پورا نہ اترنے کی شکل میں ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں'' والی صورتحال بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ سو اے پاکستانی قوم .... بیدار باش .... اب تمہاری باری ہے.......!

لوگ کیا چاہتے ہیں!

ہمارے محترم بزرگ دوست' اشفاق احمد کو آج سے کوئی تیس برس پہلے ایک سرکاری وفد کے ساتھ عوامی جمہوریہ چین جانے کا موقع ملا' اس وقت ماوزے تنگ اور چواین لائی دونوں زندہ تھے۔ اشفاق صاحب بتاتے ہیں کہ انہوں نے مختلف دنوں پر پھیلی ہوئی ان تقریبات میں وزیر اعظم چواین لائی کو ایک ہی کوٹ پہنے ہوئے دیکھا اور اس شناخت اور پہچان کی وجہ کوٹ کے دائیں بازو کی کہنی کے قریب لگا ہوا ایک پیوند تھا۔

چیئرمین ماوزے تنگ پاکستانی وفد کے ممبران کے ساتھ گروپ فوٹو بنوانے کے لیے آئے تو اشفاق صاحب نے موقع غنیمت جان کر ترجمان کے ذریعے ان سے کسی نصیحت کی درخواست کی۔ ماؤ نے کہا:

''اپنے لوگوں کے پاس جاؤ اور ان سے سیکھو۔''

اشفاق صاحب نے ترجمان کے ذریعے ماؤ کو بتایا کہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں عوام کی بیشتر تعداد ان پڑھ اور جاہل ہے اور ان کی طرح کے صرف چند فیصد پڑھے لکھے لوگ ہیں' انہیں ان جاہلوں سے بات کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے' وہ اپنے طور پر انہیں سمجھانے اور سکھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر یہ نالائق سمجھتے ہی نہیں۔

ماؤ مسکرایا اور اس نے ترجمان سے کہا۔

''اس سے کہو اپنے لوگوں کے پاس جائے اور ان سے سیکھے' انہیں سکھائے نہیں۔''

یہ واقعہ ہمیں یوں یاد آیا کہ ہمارے کم و بیش سب ہی قومی رہنما ہمہ وقت قوموں کچھ نہ کچھ سکھانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ہر بیان میں بزعم خود قومی مسائل حل کیے جاتے ہیں اور عوام کی امنگوں کی ترجمانی کی جاتی ہے اور انہیں خوش خبریاں دیجاتی ہیں کہ ان کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے مستقبل میں کیا کیا منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔

یہ سب باتیں ایک بہت مثبت اور تعمیری سوچ کی آئینہ داری کرتی نظر آتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عوا مکے یہ سارے مسائل اور ان کے مجوزہ اور موعودہ حل یہ لیڈران قوم کو دہی سوچتے اور بناتے رہتے ہیں بے چارے عوام سے کوئی یہ پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کرتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں!

عام طور پر ہماری حکومتیں جو وعدے کرتی ہیں ان سے عوام کا تعلق اتنی دور کا ہوتا ہے جیسے کسی بچے کو کوئی کہانی سنائی جارہی ہو، مثلاً یہ کہ:

ہماری خارجہ پالیسی انتہائی کامیاب ہےہم ایٹمی دور میں داخل ہو چکے ہیں۔

ایکسپورٹس میں نیا ریکارڈ قائم ہوگیا ہے

زرمبادلہ کے ذخائر بڑھ گئے ہیں۔

پاکستان کو اقوام متحدہ کی ایک ذیلی کمیٹی کا صدر بنادیا گیا ہے

ہم گندم میں ایک بار پھر خودکفیل ہو گئے ہیں۔ کپاس کی فصل پچھلے سال سے بہتر ہوگی۔ اپوزیشن کی غلط کاریوں کے مزید ثبوت مل گئے ہیں۔ صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔

نج کاری میں اضافہ کیا جائے گا ٹی وی میں دوررس تبدیلیاں

یہ اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں یقیناً معنی اور اہمیت رکھتی ہیں لیکن یہ سب کو اس کے مسائل ہیں عوام تو حکمرانوں سے صرف اپنے جان مال کی خیر اور امان مانگتے ہیں۔ ان کی ضرورتوں اور ترجیحات کی فہرست بنائی جائے تو سب سے اوپر آنے والے مسئلے یہ ہوں گے۔

۱۔ روزگار کا تحفظ

۲۔ تعلیم

۳۔ عزت نفس

۴۔ قانون کی حکمرانی (سستا اور فوری انصاف)

۵۔ ترقی کے مساوی مواقع

۶۔ صحت اور طبی سہولیات

۷۔ بنیادی ضروریات کی آسان فراہمی

۸۔ سیاسی استحکام

۹۔ مہنگائی سے نجات

۱۰۔ معاشی استحصال کی روک تھام

گویا عام آدمی حکومت سے جن چیزوں کا طلبگار رہوتا ہے وہ سب کی سب بہت سامنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ ان کے ان اصلی مسائل کو عملی طور پر اور صحیح معنوں میں حل کرنے کی طرف ایک قدم اٹھا کر دیکھئے یہ عوام دس قدم آپ کی طرف بڑھائیں گے۔

ہماری موجودہ حکومت کے سامنے حل طلب مسائل کی فہرست یقیناً بہت طویل ہے اور بیک وقت ان سب سے نبرد آزما ہونا ناممکن کی حد تک مشکل بھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ ان سب کو ایک طرف رکھ کر عدالت عالیہ کے ساتھ ایک ایسی بے معنی جنگ میں الجھ جائیں جس میں کسی کی بھی فتح یا شکست سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ مشیران کرام' جو میاں صاحب کو'' ڈٹے رہیئے'' اور'' ہم ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔'' قسم کے مشورے دیتے رہتے ہیں' کبھی یہ نہیں سوچیں گے کہ شادی بیاہ پر کھانے کی پابندی کی سپرٹ کو فروغ اور تقویت دینے کے لیے کوئی ایسا عمل کر کے دکھاتے کہ یہ صرف ایک پابندی نہیں بولکہ سادگی کے حق میں اور فضول خرچی کے خلاف ایک قومی مہم کی شکل اختیار کر جاتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ملکہ برطانیہ (اگر اسے بلوا ہی لیا تھا تو) کے سامنے ان گنت کھانوں کے انبار لگانے کی بجائے ان کے لیے ون ڈش پارٹی یا صرف چائے ٹھنڈے وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا۔ (یہ اور بات کہ اس نے اپنے اعزاز میں تیار کیے جانے والے کسی کھانے کو چھو کر بھی نہیں دیکھا اور اپنے برطانیہ سے لایا ہوا کھانا ہی کھاتی رہی) تا کہ وہ یہ جان سکتی کہ پاکستانی قوم اور حکومت اپنے مسائل کے حل میں کس قدر سنجیدہ ہے۔

اور آخری مگر سب سے اہم بات یہ کہ عوام کے مسائل کا تعین بڑے بڑے عالیشان ایوانوں میں نہیں بلکہ عوام سے پوچھ کر اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کرنا چاہیے یعنی ماؤ کے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ'' عوام کو سکھایئے نہیں ان سے سیکھنے کی کوشش کیجیے۔''

ذرا نم ہو تو......

بری اور دل دکھانے والی خبروں کے ہجوم میں کوئی اچھی بات یا خبر بالکل یوں لگتی ہے جیسے اندھیری رات میں یک دم گھنے سیاہ بادلوں کے عقب سے چاند نکل آئے۔ اب اس چاند کی روشنائی کتنی دیر رہتی ہے اور یہ دوبارہ چہرہ کشا ہونے میں کتنا وقت لیتا ہے اگر ان سوالوں میں الجھنے کی بجائے اس اچانک نمودار ہونے والی روشنی کو سراہا اور اس سے پیدا ہونے والی مسرت سے لطف اندوز ہوا جائے تو یہ بھی کوئی ایسی بری بات نہیں کہ یہ لمحے دھوپ کے طویل سفر میں گھنے پیڑ کی چھاؤں جیسے ہوتے ہیں جو ایک طرف گذشتہ کی تھکن اتارتی ہے اور دوسری طرف آئندہ کے سفر کے لیے مسافر کو تازہ دم کر دیتی ہے۔

تعلیم ہمارے معاشرے کا ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ام المسائل کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی تعلیم کا عنصر ضرور کارفرما نظر آئے گا۔ ہم مختلف وقتوں میں مختلف حوالوں سے تعلیم کی اہمیت نظام تعلیم، خواندگی، تعلیم کے فروغ کے جدید اور انقلابی ذرائع اور قومی تعلیمی پالیسی کے بارے میں لکھتے رہے ہیں لیکن عام طور پر ان تحریروں میں ہمارا لہجہ افسردگی، دل سوزی یا تنقید کا رہا ہے۔ بہت دنوں کے بعد ہمیں اس دشت بے کنار میں ایک نخلستان کی جھلک نظر آئی ہے سو آج کچھ باتیں امید اور مسرت کی فضا میں بھی ہو جائیں۔

ہوا یوں کہ چند دن قبل ہمیں دی ٹرسٹ سکول (ویسٹ وڈ کالونی ٹھوکر نیاز بیگ) کی طرف سے یوم اقبال کی تقریب میں مدعو کیا گیا۔ نومبر کے مہینے میں اس نوع کی تقاریب کچھ اس کثرت سے ہوتی ہیں (اور اس بار بھی ہوئی ہیں) کہ بہت سی دعوتوں کے جواب میں معذرت کرنا پڑتی ہے۔ ابھی ہم اس کی تمہید ہی باندھ رہے تھے کہ سکول کے پرنسپل شیخ مختار احمد نے ہمیں یاد دلایا کہ چند ماہ پہلے انہوں نے ایک ملاقات میں ہمیں سکول کے بارے میں کچھ معلوماتی لٹریچر فراہم کیا تھا جسے ہم نے سراہا بھی تھا۔ تھوڑی سی مزید گفتگو کے بعد انہوں نے ہمیں تقریب میں شمولیت پر تو آمادہ کر لیا مگر اس وقت ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ ٹرسٹ سکول حقیقت میں ہے کیا! کیونکہ آج کل تعلیم کے نام پر قائم ہونے والے ۹۹ فیصد ادارے دراصل کسی نہ کسی رخ سے ''کاروبار'' ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اس دوران میں ہماری ایک سرراہے قسم کی اچانک ملاقات طاہر یوسف صاحب سے بھی ہوئی جو پیشے کے لیے لحاظ سے وکیل اور عہدے کے اعتبار سے اس ٹرسٹ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ ان کی باتوں سے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ یہ کچھ مخلص سے لوگوں کا کوئی گروہ ہے جو اپنی طبعی نیکی، خوف خدا اور معاشرتی فرائض کی بجا آوری کے احساس کے تحت کوئی سکول وغیرہ چلا رہے ہیں۔

اتوار کی صبح دس بجے ڈی آئی جی ٹریفک عرفان محمود کا بھجوایا ہوا ایک ٹریفک کانسٹیبل ہمارے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ عران صاحب بھی سکول کے انتظامی بورڈ کے ٹرسٹی ہیں اور متعلقہ کانسٹیبل سکول تک ہماری ہنمائی کے لیے بھجوایا گیا ہے کیونکہ سکول نہ تو زیادہ مشہور ہے اور نہ ہی کسی بہت معروف جگہ پر واقع ہے۔

سکول کی عمارت چونکہ نوتعمیر شدہ ہے اس لیے اس کی فضا میں اس بوسیدگی' گھٹن اور '' بے نیازی'' کا نہ ہونا تو سمجھ میں آ گیا جو ہمارے ۹۸ فیصد تعلیمی اداروں کا نشان خاص ہیلیکن اس کے بعد کی باتیں تفہیم کے اعتبار سے بے حد خوشگوار ہونے کے باوجود مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی گئیں مثلاً ہمیں پتہ چلا کہ

۱۔ اس سکول میں تعلیم پانے والے تمام لڑکوں کو پانچویں جماعت کے امتحان میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے پر منتخب کیا جاتا ہے۔

۲۔ یہ بچے معاشرے کے پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انکے انتخاب کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ زیادہ تر ایسے بچوں کو ترجیح دی جاتی ہے جن کے والدین ان کی تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔

۳۔ منتخب ہونے والے بچوں کی تعلیم کے مکمل اخراجات (کتابیں' یونیفارم' جوتے' ٹرانسپورٹ) ٹرسٹ سکول کی انتظامیہ خود برداشت کرتی ہے۔

۴۔ ٹرسٹ کو ملنے والی تمام امدادی رقوم صرف اساتذہ کی تنخواہوں اور پانی بجلی فون کے بلوں کی ادائیگی میں استعمال ہوتی ہیں۔ سکول کی عمارت کی تعمیر' مرمت' طلبہ کے یونیفارم' جوتے' فرنیچر اور تقریبات کے اخراجات ٹرسٹ کے اراکین اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔

۵۔ سکول میں تدریسی کمروں کے علاوہ سائنس لیبارٹری' سائنس میوزیم' اور سپورٹس روم بھی بنائے گئے ہیں جن کا معیار کسی بھی اعتبار سے معیاری اور مہنگے سکولوں سے کم نہیں۔

۶۔ بچوں کی ذہانت' معلومات عامہ' بیت بازی اور تقاریر کا معیار ان کی عمر کے اعتبار سے حیرت انگیز حد تک عمدہ تھا۔

۷۔ اس سکول میں تدریس کے آغاز کو صرف ڈیڑھ برس کا عرصہ ہوا ہے اور فی الوقت چھٹی اور ساتویں جماعت ہی کام کر رہی ہے لیکن آئندہ تین برسوں میں یہ معاملہ میٹرک تک اور پھر شاید اس سے بھی کچھ آگے چلا جائے۔

۸۔ ابتداء میں یہ بچے جو معاشی اعتبار سے معاشرے کے غریب ترین طبقے سے متعلق ہیں اپنے مستقبل کے بارے میں مکینک اور مستری ٹائپ کیریئر سے آگے نہیں سوچ سکتے تھےمگر اب ڈیڑھ برس کے عرصے میں ان کی سوچ سول سروس' میڈیسن' انجینئرنگ اور

ایم بی اے تک پھیل چکی ہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ ایک بچہ مستقبل میں وزیر اعظم بننے کا خواہش مند ہے۔ ممکن ہے اس کی یہ خواہش محض ایک بچگانہ امنگ ہو لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس دن اس ملک کا وزیر اعظم سچ مچ کسی غریب کا تعلیم یافتہ اور باشعور بچہ بن گیا تو وہ دن صحیح معنوں میں پاکستان کی آزادی اور ترقی کا روشن ترین دن ہوگا۔

ٹرسٹ سکول قائم کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ہماری اور بے شمار دوسرے لوگوں کی بھی یہی خواہش ہے کہ اس طرح کے سکول ہر شہر، ہر بستی، ہر گاؤں اور ہر علاقے میں قائم کیے جائیں اور ہمارے مخیر اور قومی درد رکھنے والے پاکستانی اسی طرح ان کی اعانت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہیں کہ اقبال اور قائد اعظم کا اصلی پاکستان ان غریب اور بے کس لوگوں کی ترقی کے بغیر صحیح معنوں میں پاکستان کہلانے کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ نومبر کا مہینہ علامہ اقبال اور دسمبر کا قائد اعظم کی پیدائش کا مہینہ ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم ان دو مہینوں میں ہی ہم ایسے کاموں کی بنیاد رکھنے کی عادت ڈال لیں کہ ان سے نہ صرف ان بزرگوں کی روحیں آسودہ ہوں گی بلکہ وطن عزیز کا چہرہ بھی روشن سے روشن تر ہوتا چلا جائے گا۔

حدی خوانو! بڑھاؤ لے اندھیرا ہونے والا ہے
پہنچنا ہے سر منزل، چراغ شام سے پہلے!

◆◆◆

کانٹے سے کھوٹے تک

اپنے اشفاق احمد خان (جو ریڈیو کے حوالے سے بطور ''تلقین شاہ'' اتنے مشہور ہیں کہ اکثر لوگ انہیں اسی نام سے پکارتے ہیں) بات کہنے کا ایک ایسا ڈھب جانتے ہیں جو انہیں ہر محفل میں جان محفل بنا دیتا ہے۔ہم چونکہ ان کے پرانے نیاز مند ہیں اس لیے گزشتہ ربع صدی میں ہمیں بہت سی ایسی محفلوں میں شمولیت کا موقع ملا ہے جس میں خان صاحب نے اپنی جادو بیانی کا رنگ جمایا اور ہماری یادوں کے سرمائے میں کچھ ایسی انوکھی' خوبصورت اور خیال افروز باتوں کا اضافہ کیا جن کی خوشبو ہمیشہ مشام جاں کو معطر رکھتی ہے۔

گزشتہ دنوں ایک محفل میں پاکستان کے گولڈن جوبلی سال کی تقریبات' ان کی نوعیت تیاریوں اور طریقہ کار کا قصہ چل رہا تھا اور مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کمیٹی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔اس دوران میں کچھ احباب نے اخبارات میں چھپنے والی چندی خبروں اور بیانات کا بھی تذکرہ کیا جن میں ان تقریبات کے انعقاد اور جشن کے پروگراموں پر یہ کہہ کر تنقید کی گئی تھی کہ یہ جشن کس بات پر منایا جائے؟ ہم نے بحیثیت قوم کیا کیا ہے جس کی خوشی منائی جائے؟ چاروں طرف پھیلی ہوئی بیزاری' مردم آزادی' دہشت گردی' بے روزگاری' بدنظمی اور سیاست گردی کی موجودگی میں اس نصف صدی کا جشن منایا جائے یا ماتم کیا جائے؟ اور یہ کہ ان پچاس برسوں میں ہم نے سارے کا سارا سفر پستی اور نشیب کا کیا ہے اور یوں ہم اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں جو ۱۹۴۷ء میں وطن عزیز کی آزادی کے ساتھ ہم پر لاگو ہو گئی تھی۔

اشفاق صاحب نے ان ساری باتوں کو صرف ایک ترکیب میں کچھ اس طرح لپیٹا اور سمیٹا کہ مندرجہ بالا سارے خدشے' استفسار اور اعتراضات وزن رکھنے کے باوجود بے وزن ہو گئے۔

انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ پچاس برس کا سفر'' کانٹے سے کھوٹے تک'' کا سفر ہے' اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ہمارے پاس سرکاری کاغذوں کو ترتیب سے یکجا رکھنے کے لیے کامن پن تک موجود نہیں تھی اور ہمارے سرکاری اہلکار اور بڑے بڑے افسران بھی کیکر اور اس نوع کے دوسرے درختوں سے کانٹے اتار کر انہیں بطور پن استعمال کرتے تھے جس کی بہت سی نشانیاں آج بھی ہمارے آرکائیوز میں موجود ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب پورے ملک میں تین یونیورسٹیاں' دو ریڈیو سٹیشن اور چند چھوٹے موٹے صنعتی کارخانوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا جبکہ آج بفضل خدا ہمارے اس ۲۸ یونیورسٹیاں' ایک درجن سے زیادہ ریڈیو

سٹیشن' پانچ ٹی وی سٹیشن' قومی ایئرلائن' سٹیل مل' سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے صنعتی یونٹ' اسلام آباد' منگلا اور تربیلا ڈیم اور دیگر بے شمار ایسی چیزیں ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پاس کہوٹہ ہے' جہاں نمو پانے والے ایٹمی پروگرام نے نہ صرف ہمیں بے شمار خارجی مشکلات سے بچا رکھا ہے بلکہ فی الوقت ہمارے دفاع کا سب سے مضبوط قلعہ بھی ہے' یوں انہوں نے پاکستان کے پچاس برس کے اس سفر کو' کانٹے سے کہوٹے تک'' کا سفر قرار دیا ہے۔

اب اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو ہماری قومی تقری تصویر کا یہ رخ' یہ روشن اور سنہرا رخ' کوئی ایسا معمولی یا کم تاب بھی نہیں ہے کہ ہم اس کی طرف دیکھے بغیر صرف تصویر کا تاریک رخ ہی دیکھتے چلے جائیں اور ہمہ وقت بڑبڑانے اور اردگرد کی ہر چیز پر تنقید کی گرد اڑانے میں ہی لگے رہیں' ممکن ہے کچھ لوگوں کے نزدیک ''کانٹے سے کہوٹے تک'' کی یہ ترکیب محض ایک رعایت لفظی یا صوتی تاثر ہو لیکن ایسے لوگوں کو روک کر ان سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ جن خرابیوں کا رونا وہ ہر وقت روتے رہتے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے (سوائے زبانی جمع خرچ کے) خود انہوں نے اپنے دائرہ کار کے اندر کیا کیا ہے؟ معاشرے میں پھیلی ہوئی گندگی اور غلاظت کو صرف ناک پر رومال رکھ کر تو دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس خصوصی گروہ کے نقاد جو بزعم خود سماج کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں اس ساری صورتحال کو سوائے بگاڑنے اور لوگوں میں بے دلی' مایوسی اور بے عملی پھیلانے کے اور کچھ نہیں کرتے۔ چند برس پہلے ہم نے اپنے ایک ڈرامہ سیریل ''رات'' میں اس موضوع کے حوالے سے ایک سین لکھا تھا کہ یونیورسٹی کے چند طلبا اپنے استاد کے سامنے معاشرے میں موجود برائیوں کا بھرپور نقشہ کھینچنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ سارا معاشرہ ہی تباہ ہو چکا ہے اور کرپشن' لاقانونیت' بے عملی' بے سمتی' غربت' دہشت گردی اور بے انصافی کا کیچڑ اس قدر پھیل چکا ہے کہ اب اس کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے اس پر وہ استاد ان سے کہتا ہے۔

''تمہاری ساری باتیں اگر درست مان بھی لی جائیں تو یہ سوال بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ جتنی جگہ پر تم بیٹھتے ہو اور جہاں تک تمہارا ہاتھ پہنچتا ہے وہاں تک تو تمہیں اس کیچڑ کو صاف کرنے سے کوئی نہیں روکتا اور اگر کوئی نہیں کرتا تو کم از کم تم اپنے حصے کی جگہ کو تو صاف رکھ سکتے ہو!''

◆◆◆

خوش خبری

ایک بار اردو کے بے مثال مزاح نگار شفیق الرحمن نے کسی تحریر کی تعریف کرتے ہوئے اس کے مصنف کو خط میں لکھا تھا۔

''دولہا سائیں، خوش کیتا ای۔''

اور اس ''دولہا سائیں'' کی وضاحت یوں کی تھی کہ ان کے علاقے کی زبان میں یہ طرز تخاطب تحسین اور اپنائیت کے جذبات کی شدت کو ظاہر کرتا ہے اور اس سے کہنے والے کی دلی مسرت کا اظہار ہوتا ہے سو آٹھویں ترمیم کی ترمیم نو کے عمل میں میاں نواز شریف اور ان کے رفقاء نے جو تاریخ ساز قدم اٹھایا ہے اس کی کامیابی پر ہمارا دل بھی کچھ ایسے ہی احساسات سے معمور ہے کہ یہ اقدام اگرچہ اپنی جگہ پر بہت اہم، ضروری اور مفید ہے لیکن اس کی اصل اہمیت حکومت کا قومی مسئل کے حل کے بارے میں وہ مثبت رویہ ہے جو ایک بشارت کی طرح اس تھکی ہوئی، درماندہ، منتشر اور خواب گزیدہ قوم پر وارد ہوا ہے اور اس بات کا آئینہ دار ہے کہ اگر سنجیدگی اور خلوص سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو پیچیدہ سے پیچیدہ اور مشکل سے مشکل الجھنیں بھی سلجھ سکتی ہیں یعنی جہاں نیت ہو وہاں رستے خود بخود نکل آتے ہیں۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے فوراً بعد سے ہی (مستثنیات کو چھوڑ کر) ہم نے اہم قومی مسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں موخر کرنے کا افسوسناک رویہ اپنا لیا تھا اور انگریزی محاورے کے مطابق مسائل کو قالین کے نیچے یہ سوچ کر ڈالتے چلے گئے کہ یوں وہ صرف آنکھوں سے ہی نہیں، روئے زمین سے بھی اوجھل ہو جائیں گے۔ وقتی مصلحتوں، کوتاہ اندیشیوں، قوت فیصلہ کی کمی، بدنیتی اور کم کوشی کی اس فضا میں یہ مسائل سود در سود اور جرمانہ در جرمانہ بڑھتے چلے گئے اور ایک وقت آیا کہ اصل زر، کل مالیت کا محض ایک معمولی سا حصہ رہ گیا اور ہم خود اپنے ہی پیدا کردہ ''ورلڈ بینک'' اور ''آئی ایم ایف'' کے جال میں الجھتے چلے گئے اور پھر یوں ہوا کہ کبوتر کو بند آنکھوں کے باوجود بلی دکھائی دینے لگی اور ہر آدمی اور شعبے نے اپنے اپنے آنگن کی غلاظت دوسرے کے صحن میں پھینکنے کا وطیرہ اپنا لیا اور پورا معاشرہ اس تعفن سے آلودہ ہو کر ایک ایسا مرقع عبرت بن گیا کہ ۱۳ کروڑ عوام پر مشتمل یہ عظیم اور خوبصورت ملک دنیا کے بازار میں ایک ایسے کرسٹل پیس کی شکل اختیار کر گیا جس کے ٹوٹے ہوئے کنارے دیکھ کر کوئی اس پر دوسری نظر نہیں ڈالتا۔

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا!

اب یہاں ہمیں پھر ایک امریکی ضرب المثل یاد آرہی ہے جسے ہم اس سے پہلے بھی اپنے کالم میں درج کر چکے ہیں۔

''If you are not part of the solution you are part of the problem''

یعنی اگر آپ کسی مسئلے کے حل کا حصہ نہیں ہیں تو جان لیجیے کہ آپ خود بھی اس مسئلے کا ایک حصہ ہیں۔

کسی سماج میں رہتے ہوئے اس کی ذمہ داریوں کی بجا آوری سے اپنے آپ کو الگ کرنا ایک غلطی اور اس عمل کو غیر جانبداری سمجھنا ایک ایسی غلط فہمی ہے جو افراد سے ہوتی ہوئی پورے معاشروں کو تباہ کر دیتی ہے اقبال نے کہا تھا:

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

سو مقام شکر ہے کہ ہم نے اپنے اجتماعی گناہوں کو دیکھنے' ماننے' سمجھنے اور ان کا کفارہ ادا کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے' بزرگ کہتے ہیں کہ طویل سے طویل اور مشکل سے مشکل سفر کا آغاز بھی ایک ہی قدم سے ہوتا ہے سو اب کوشش اور دعا یہی ہونی چاہیے کہ ہم انفرادی طور پر بھی اپنی اپنی سمت درست کریں اور پوری قوم یک دل اور یک جان ہو کر اس عظیم چیلنج کا سامنا کرے جو ہمیں درپیش ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وقت اور تقدیر گرتے ہوؤں کو سنبھلنے کے موقعے تو ضرور دیتے ہیں لیکن یہ مواقع بار بار نہیں آیا کرتے۔

لوح تاریخ پہ لکھے ہوئے لفظ
خط تنسیخ سے واقف ہی نہیں
وقت مکتب کے رجسٹر کی طرح ہوتا ہے
اپنے نمبر پہ جو لبیک نہیں کہہ پاتے
ان کا کچھ عذر نہیں' کوئی بھی فریاد نہیں
یہ وہ طائر ہیں جنہیں' اپنی نوا یاد نہیں

◆◆◆

خبر کی تلاش

جوں جوں اخبارات کے صفحات میں اضافہ ہو رہا ہے خبریں کم پڑتی جا رہی ہیں سو آج کل اخبارات میں بہت سا ایسا مواد شائع ہو رہا ہے جس کی حیثیت محض Filler یعنی خالی جگہ پر کرنے والی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اخبارات دبلے پتلے اور چھریرے بدن کے ہوا کرتے تھے یعنی ان کی ضخامت چار سے لے کر آٹھ صفحوں کے درمیان ہوا کرتی تھی لیکن ان میں بہت سارے مستقل عنوانات' اشتہارات' کالموں اور اداریئے کے باوجود مقامی' ملکی اور بین الاقوامی خبروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی تھی اور یہ چھ چھ آٹھ آٹھ کالمی سرخیاں تو انتہائی اہم اور غیر معمولی خبروں کو بھی شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی تھیں۔

قتل' اغوا' دہشت گردی اور ڈاکے کی خبروں کو صفحۂ اول پر اس طرح نمایاں کر کے چھاپا جاتا ہے کہ ایک بار تو زندگی سے ایمان اٹھنا شروع ہو جاتا ہے اور صبح صبح ناشتے سے پہلے نہار منہ ان خبروں کا مطالعہ زبان پر ایک ایسی کڑواہٹ سی جما دیتا ہے کہ لوگ سارا دن ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی فرسٹریشن کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں اور یوں شام کو شہر کی فضا میں ماحولیاتی آلودگی کے ساتھ ساتھ بے یقینی اور اداسی کا دھواں بھی اس طرح تن جاتا ہے کہ بعض اوقات یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ چاند کب نکلا اور کب ڈوب گیا۔

مانا کہ پھڑکتی ہوئی خبر' اخبار کی کمزوری بھی ہے' ضرورت بھی اور غذا بھی' لیکن یہ جوتڑ کا لگا کر خبروں کو چٹپٹا بنانے کی وبا پھیل گئی ہے اس نے سنسنی خیزی کو ایک فیشن بنا دیا ہے اور یہ عمل بالآخر اسی صورت میں ڈھل جاتا ہے جس کا ذکر مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں بری اور گھٹیا شاعری کے حوالے سے کیا ہے کہ پہلے شاعر سوسائٹی کے دباؤ میں آ کر شاعری کو بگاڑتا ہے اور پھر یہ بگڑی ہوئی شاعری' شاعر اور سوسائٹی' دونوں کو بگاڑنے لگتی ہے۔

آج کل الیکشن کی سردمہری کو گرم جوشی میں تبدیل کرنے کے لیے سیاسی رہنماؤں کی باتوں میں سے ایک دوسرے پر کسی جانے والی پھبتیاں' الزامات اور سکینڈلز چن چن کر نکالے جاتے ہیں اور بعض اوقات تو ان لوگوں کے بیانات پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے' جیسے بھانڈ تماشہ کر رہے ہوں' اس کے ساتھ ساتھ کچھ گڑے مردے بھی اور کچھ نیم مردے کھود کھاد کر نکالے جاتے ہیں اور کئی کئی سال پرانے سکینڈل' نئے ساز و سامان کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں اور پھر یوں ہوتا ہے کہ الیکشن کا ہنگامہ ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ خبریں اسی پراسرار طریقے سے ایک دم غائب ہو جاتی ہیں جس طرح شروع ہوئی تھیں۔ مثال کے طور پر گزشتہ الیکشن کے دنوں میں میاں نواز

شریف کا نام مرحوم جنرل آصف نواز کی موت کے حوالے سے بار بار لیا گیا' مرحوم کی بیوہ کے بیانات' ملکی اور غیر ملکی ایجنسیوں کی نام نہاد تحقیقات اور نت نئے سراغوں کی دریافت سے اخبارات کے صفحے بھرے ہوتے تھے لیکن اس کے بعد سے آج تک اس کیس کا کبھی سرسری حوالہ تک سننے میں نہیں آیا.......!

چلئے یہ بھی مان لیا کہ اس طرح کی خبریں ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے'' کے اصول کے تحت بنائی اور پھیلائی جاتی ہیں لیکن یہ جو گزشتہ چند دنوں سے قادیانیوں کو احمدی یا غیر مسلم لکھنے کی بحث ہے یا مصر کے کسی نام نہاد عالم دین کا اٹھایا ہوا بہن اور بھائی کی شادی کا مسئلہ ہے یا ایران سے کسی صاحب کا متعہ کے بارے میں بیان ہے ان خبروں کو اچھالنے' اس طرح پبلسٹی دینے اور تردید در تردید چھاپنے سے معاشرے کے کم تعلیم یافتہ طبقوں اور نوجوان اذہان پر جو منفی اثر پڑ رہا ہے اس کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں؟ یہ درست ہے کہ معلومات اور میڈیا کی آزادی اور فراوانی کے اس زمانے میں زندگی کے حقائق سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا لیکن اس حقیقت نگاری کی آڑ میں ہر چیز کو ننگا کر کے دیکھنا اور دکھانا بھی کوئی ایسا مستحسن فعل نہیں کہ حجاب ہو یا بے حیائی دونوں کی اپنی اپنی حد بہرحال ہوتی ہے۔ فیملی پلاننگ یا ایڈز کے بارے میں اشتہارات یا معلوماتی مضامین میں سیکس سے متعلق معاملات اگر زیر بحث آتے ہیں تو ان کی وجہ اور گنجائش تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ ایک رات یا مختصر مدت کا متعہ یا بہن بھائی میں سے کسی ایک کا اپنی ماں کی ناجائز اولاد ثابت ہونے کے باعث آپس میں شادی کر سکنا یقیناً ایسے مسائل نہیں جنہیں اخبارات کے پہلے صفحے پر سنسنی خیز اور بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جائے!!

حال ہی میں شائع ہونے والے شام کے اخبارات نے تو حد ہی کر دی ہے۔ اخبار بیچنے اور سرخیوں سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان میں بیشتر ایسی خبریں نمایاں کر کے چھاپی جاتی ہیں جن میں سے اکثر کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ عام طور پر سرخی کی عبارت کا نفس مضمون سے تعلق بھی نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ شام کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپنے والی بیشتر خبروں کو اگلے دن کے اخبارات میں ایک کالمی خبر جتنی جگہ بھی نہیں ملتی۔

اقبال نے کہا تھا۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہمیں اجتماعی طور پر وہ ''نظر'' یا ''چشم بینا'' تو نجانے کب ملے گی لیکن اگر ہماری ''خرد'' ہمیں اسی طرح کی خبریں فراہم کرتی رہی

تو وہ دن دور نہیں جب ''خبر'' بھی اس کے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور غالب کا یہ شعر ایک نئے معانی کا لباس پہن کر ہمارے چاروں طرف پھیل جائے گا کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

◆◆◆

طلوع وغروب

ہر روز شام کو سورج غروب اور اگلے دن صبح طلوع ہوتا ہے کہ یہی قانون قدرت ہے۔ ایک طرف رات کے ہم سفر ستارے ایک ایک کر کے فلور کراسنگ کرتے ہیں اور دوسری طرف چڑھتے سورج کے پجاری ہاتھوں میں کاسے لیے صفیں باندھ کر دورویہ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح کچھ روشنی چرا کر اپنی جیب میں بھر لیں۔

۳ فروری کو ہمارے سیاسی افق پر بھی کچھ ایسے ہی طلوع و غروب کا منظر پیش ہوا ہے۔ بے نظیر بھٹو (جنہیں ان کے بہت سے اہل خاندان بے نظیر زرداری کہنے پر مصر ہیں) ایوان اقتدار میں تیسری بار قدم رنجہ فرمانے سے محروم ہو گئیں اور میاں نواز شریف ''یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے'' گنگناتے ہوئے ایک بار پھر اس سنگھاسن پر بیٹھنے والے ہیں جس کے پائے اس بار ان کے پہلے دور حکومت سے بھی زیادہ مضبوط اور پائیدار ہیں لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اصل طاقت صاحب اقتدار کی کرسی میں نہیں بلکہ اس کے کردار میں ہوتی ہے اور اگر اس علاقے میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو اس کرسی کے پائے بیساکھیوں میں بدل جاتے ہیں جو بعض اوقات ایک معمولی سے دھکے سے بھی بغلوں سے نکل جاتی ہیں۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

محترمہ بے نظیر پر یہ شعر اس لیے صادق نہیں آتا کہ ان کے محضر پر شروع سے آخر تک ساری مہریں خود انہی کے نام اور ہاتھ کی لگی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ہونا ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ موجودہ انتخابات کے نتیجے میں جو صورتحال سامنے آئی ہے اس کا اندازہ ان کو تو کیا شائد ان کے سیاسی مخالفین کو بھی نہیں تھا۔ انتخابات سے دو دن پہلے تک (اور غالباً اس کے بعد بھی) وہ ٹی وی پر اپنے ''الیکشن آور'' میں نہ صرف بات بات پر سوا کرنے والوں کو ڈانٹ رہی تھیں بلکہ بار بار اعداد و شمار اور مختلف شرحوں کے حوالے دے دے کر اس بات پر اصرار بھی کر رہی تھیں کہ ان کی حکومت کے دوران سب اچھا تھا' ملک ترقی کر رہا تھا' شرح خواندگی بڑھ رہی تھی' مہنگائی کم ہو گئی تھی' غیر ملکی سرمایہ ملک میں دھڑا دھڑ آ رہا تھا' خارجہ پالیسی کے میدان میں معجزے رونما ہو رہے تھے اور ملک سے بجلی کی لوڈ شیڈنگ (جو ان کے بقول سولہ گھنٹے روزانہ ہوتی تھی) ختم کر دی گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ زی ٹی وی پر ایک سوال کے جواب میں

اعلان کر چکی تھیں کہ ان کے شوہر نامدار ایک مخصوص وزارت کے نہ صرف اہل تھے بلکہ اس کے لیے موزوں ترین تھے۔ کیونکہ وہ دو دفعہ قومی اسمبلی کے ممبر ہونے کے دوران اس شعبے میں اپنی مہارت کا حیرت انگیز مظاہرہ بار بار کر چکے ہیں' خاتون ہونے کے ناتے سے انہوں نے اپنا طعنے کا حق استعمال کیا اور صدر لغاری (جنہیں وہ آج کل طنزاً فاروق الحق کہہ کر بلاتی ہیں) کا حوالہ دے کر وہ تین مرتبہ یہ بات دہرائی کہ میں نے تو اسمبلی کے منتخب ممبر کو وزیر بنایا تھا جبکہ انہوں نے اپنے ایک کزن کو یہ وزارت دے دی ہے اور ان سے کوئی اس بارے میں سوال تک نہیں کرتا....... اس پر کسی نے تبصرہ کیا کہ کزن تک تو اعتراض سمجھ میں آتا ہے لیکن ''منتخب ممبر'' والی بات پلے نہیں پڑتی کہ اسمبلی کی عدم موجودگی میں لغاری صاحب ''منتخب ممبر'' کہاں سے لے کر آتے!!

ٹی وی الیکشن ٹرانسمیشن کے آخری سیشن میں انتخابات کے بعد کی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے برادرم مجیب الرحمن شامی نے دو بہت ہی اہم اور پتے کی باتیں کی ہیں پہلی تو یہ کہ کیا صرف ۱۸ سیٹوں کے ساتھ محترمہ بے نظیر قومی اسمبلی میں بطور اپوزیشن لیڈر اپنا استحقاق ثابت کرنے کی پوزیشن میں بھی ہوں گی یا نہیں (کہ اب یہ کام حق پرست گروپ کا کوئی نمائندہ بھی کر سکتا ہے) دوسری بات صوبہ سندھ کے حوالے سے ہے کہ وہاں بھی پہلی بار ایک ایسی صورتحال پیدا ہو گئی ہے جس میں پیلز پارٹی کی روایتی اکثریتی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور ممکن ہے کہ وہاں بھی اس کی حکومت نہ بن سکے یعنی وقتی طور پر ہی سہی پیپلز پارٹی ملکی سیاست میں ایک ایسی دولت بن گئی ہے جس سے صرف اس کے اپنے گھر کا خرچہ چل سکتا ہے۔

اس سارے منظر نامے کو سامنے رکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے بالترتیب پاکستان مسلم لیگ اور میاں نواز شریف ہی اس وقت ملک کی واحد سیاسی قوت اور رہنما ہیں اور یہی وہ الجھاؤ' واہمہ یا التباس حقیقت ہے جو ان دونوں کو غلط راہ پر ڈال سکتا ہے۔ ابھی چند دنوں میں میاں نواز شریف کے چڑھتے ہوئے سورج کو سجدہ کرنے والوں میں بہت سے بہروپیے نت نئے سوانگ بھر کر آئیں گے۔ ان کے گرد موجود پرانے اور تیم پرانے لوگوں میں سے بھی کچھ اوچھے جٹ پانی پی پی کر آ پھرنے کے رستوں کی تلاش میں نکلیں گے اور لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہونے والوں کا گروہ بھی سرگرم عمل ہو گا جس طرح پیپلز پارٹی کی ۸۸ء والی حکومت کو کوڑے کھانے اور کھانے کے دعوے کرنے والوں نے اپنی ڈال دی تھی اور بے نظیر بھٹو کے لیے ان زخموں کو گننا مشکل ہو گیا تھا جن کے اندمال کے مدعی ہمہ وقت ان کے دروازوں پر کھڑے رہتے تھے اور جن کی طرف مرحومہ پروین شاکر نے اپنی ایک مشہور نظم ''شہزادی کا المیہ'' میں بہت کھل کر اشارہ بھی کیا تھا' اسی طرح کے لوگ اب میاں صاحب کو بھی گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گے۔ یہ اناج کی بوریاں کترنے والے چوہے پارٹی کے اندر موجود ان چھوٹے بڑے تنازعات کو بھی ہوا دینے کی کوشش کریں گے کیونکہ یہ ایک ایسی بلیک

میلنگ ہے جہاں بڑے سے بڑا ایماندار، صائب الرائے، مخلص اور دور اندیش انسان بھی لڑکھڑا جاتا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ میاں نواز شریف نے ان تین برسوں میں بہت کچھ سوچا اور سیکھا ہوگا...... اپنی کمزوریوں خامیوں اور کوتاہیوں پر نہ صرف نظر ڈالی ہوگی بلکہ ان سے سبق بھی حاصل کیا ہوگا اور اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ میچور سیاست دان کی حیثیت سے عنانِ اقتدار سے جاری رکھیں گے یا ان کا تسلسل برقرار رکھیں گے اور اس دوران میں حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں انہیں زیادہ معروضی اور حقیقی انداز میں دیکھیں اور چلائیں گے۔

آخر میں ہم دونوں پارٹیوں کی خدمت میں دو شعر پیش کرتے ہیں کہ اس میں دونوں کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی باتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ توفیق منجانب اللہ ہوتی ہے۔

اپنی پستی کا نہ الزام کسی پر رکھو
پاؤں پھسلے تو اسے پھر سے جما کر رکھو
قوم کے قصر کی تعمیر وفا مانگتی ہے
اس کی بنیاد میں انصاف کا پتھر رکھو

◆◆◆

خمارِ گندم

گندم اور انسان کا رشتہ اس کائنات کے قدیم ترین رشتوں میں سے ایک ہے اور اگر اپنے آدم اور حوا کی کہانی والے دانہ گندم کے حوالے سے دیکھا جائے تو شائد یہ کرہ ارض پر حضرت انسان کی آمد کا بنیادی اور مرکزی حوالہ ٹھہرے۔

مرزا غالب نے اسی بات کو ایک اور رنگ میں کچھ یوں کہا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا' کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے' نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

دانہ گندم اور خمار گندم سے ہوتی ہوئی یہ کہانی آج کل ایک عجیب و غریب موڑ پر آ کر ٹھہر گئی ہے کہ دنیا کے قدیم ترین اور تاریخی حوالے سے زرخیز ترین علاقے کے لوگ بازاروں میں ''ہائے آٹا ہائے آٹا'' پکارتے پھر رہے ہیں اور آٹا ہے کہ ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔ اخباری بیانات کے مطابق اس صورتحال کی ذمہ داری بہت سے عوامل پر ڈالی جارہی ہے۔ ظاہر ہے اس فہرست میں سب سے پہلا نمبر تو گزشتہ حکومت ہی کا ہوگا کہ یہ رویہ اب ہمارا مستقل سیاسی شعار بن چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ گندم کی سمگلنگ' زرعی شعبے کے ناقص انتظامات' فلور ملوں کی بدانتظامی اور دکانداروں کی ناجائز منافع خوری کا بھی بہت چرچا ہے' حکومتی بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ بحران یا تو تھا ہی نہیں یعنی یہ ایک مصنوعی صورتحال ہے' یا اس پر قابو پا لیا گیا ہے اور مستقبل ''بہت قریب'' میں یہ صورتحال ایک قصہ پارینہ بن جائے گی اور عوام حسب معمول اس نعمت کو آسانی سے حاصل کر سکیں گے۔ اب اگر اس سارے معاملے میں روٹی کا سائز اور حجم کم اور قیمت بڑھ جائے' آٹا مستقل طور پر مہنگا ہو جائے اور عوام کی بدحالی کا گراف بلند ہو جائے تو.......

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

ہمیں موجودہ حکومت کی مشکلات کا احساس ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مسائل کا یہ کوہ گراں چٹکی بجانے یا کوئی اور چمتکار دکھانے سے ختم نہیں ہوگا اس کے لیے محنت' منصوبہ بندی' پولیٹیکل ول حفاظتی تدابیر' عوامی شعور کی بیداری اور سرکاری اہلکاروں کی از سر نو تربیت کی ضرورت ہوگی کہ ان سب کے بغیر جو کچھ ہوگا وہ ہم گزشتہ پچاس برسوں سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

آٹے کی یہ موجودہ گرانی کوئی اتفاقی عمل نہیں ہماری معلومات کے مطابق نہ صرف اس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں بلکہ یہ ایک ایسا مافیا ہے جو منشیات کے مافیے سے بھی زیادہ مضبوط اور خطرناک ہے۔ گندم کی کاشت' خرید' سب سڈی' سٹوریج' نظام تقسیم'

تھیلوں کی بنوائی' سپلائی اور فلور ملوں کے کوٹے کے تعین میں ایسے ایسے خوفناک گھپلے برسوں سے کیے جارہے ہیں کہ ان کی تفصیل سن کر بچ مچ پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

کیسے افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ ہمارے ہمسایہ ملک میں صوبہ پنجاب (جونسبتاً کم حصہ ہے) وہاں کی گندم کی ضرورت (جو ہم سے کئی گنا زیادہ ہے) کا بیشتر حصہ پیدا کر رہا ہے اور ہم ہر سال لاکھوں ٹن گندم امپورٹ کرتے ہیں! اور وہ قیمتی زرمبادلہ خرچ کرتے ہیں جس کی کمی کے باعث ہماری معیشت پہلے ہی سر کے بل ہو چکی ہے اور اس کے باوجود اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہیں!

عین ممکن ہے کہ میاں نواز شریف ان کے رفقاء بچ مچ آئندہ چند دنوں میں آٹے کی موجودہ قلت پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ تو مرض کی نشانی ہے۔ وہ پھوڑا ہے جو کچھ فاسد مادے کے ساتھ جلد کی بیرونی تہہ پر ابھر آیا ہے۔ اصل انفیکشن تو کہیں اندر ہے جب تک اس کو جڑ سے ختم نہیں کیا جائے گا یہ مسئلہ چہرے اور وقت بدل بدل کر بار بار سر اٹھاتا رہے گا اور ہر بار ہمیں اس صورتحال کے پیدا کرنے والوں سے بلیک میل ہونا پڑے گا اور تمام کی تمام برائیاں اپنی اپنی جگہ پر قائم رہیں گی۔

گزشتہ چند دنوں میں آٹے کی قلت اور گرانی کے حوالے سے چند بہت عمدہ اور معنی خیز کارٹون دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوم کن خطوط پر سوچ رہی ہے اور اگر وہ اتنی تکلیف کے باوجود مسکرانے یا ہنسنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس صورتحال کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جہاں یہ ایک خوش آئند رویہ ہے وہاں اس بات کا بھی غماز ہے کہ عوام کے صبر کو زیادہ نہیں آزمانا چاہیے کیونکہ لبریز ہونے والا پیمانہ چھلکتے وقت کسی کے بھی قابو میں نہیں رہتا۔

زراعت کا شعبہ فوری توجہ اور مستقل منصوبہ بندی کا متقاضی ہے اور سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ اسے جاگیرداروں کے چنگل سے نکالا جائے اور اس کے دائرے کو وسیع کر کے ایسے دوررس اور مثبت اقدام کیے جائیں کہ یہ بچ مچ قومی معیشت کی ایسی ریڑھ کی ہڈی بن جائے جس کے تمام مہرے مضبوط اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ اس مسئلے پر علامہ اقبال نے کیا عظیم اور بنیادی نوعیت کا استفسار کیا ہے' اگر غور کیا جائے تو اس مسئلے کے حل کا مرکزی نقطہ اسی مصرعے کے اندر موجود ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون!

◆◆◆

یہی وقت ہے

آج کے اخبارات میں بڑی تفصیل سے نومنتخب وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف کی تقریب حلف برداری کی خبریں چھپی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تقریب کی سب سے نمایاں بات لیگی کارکنوں یا ان کے روپ میں آنے والے تماش بینوں اور موقع پرستوں کی وہ دھکم پیل' ہلڑ بازی اور بدنظمی تھی جس نے تقریب کے تمام انتظامات کو درہم برہم کر دیا۔ مہمانوں کی کرسیوں' پریس گیلری اور دوسری مخصوص نشستوں پر زبردستی قبضہ کر لیا' سکیورٹی اور انتظامیہ کے ارکان کے ساتھ دھینگا مشتی اور گالی گلوچ کیا اور زبردست سٹیج پر چڑھنے کے ساتھ تقریب کے دوران بھی نعرہ بازی اور دخل اندازی کرتے رہے۔

فلم انڈسٹری کے حوالے سے امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کا شہر ہالی وڈ ایک حوالے کی حیثیت رکھتا ہے' اس کی رعایت سے بھارت اور پاکستان کی فلم انڈسٹری کے لیے بھی ''بالی وڈ'' اور ''لالی وڈ'' کے نام استعمال ہونے لگے ہیں۔ شاید اسی اصول کے تحت اب پیپلز پارٹی کے جیالوں کے جواب میں مسلم لیگی ورکرز کو ''متوالوں'' کا خطاب دیا گیا ہے (یا انہوں نے لے لیا ہے؟) ہمیں اچھی طرح یاد ہے بے نظیر صاحبہ کی پہلی حکومت کے ابتدائی دن تھے' گورنر ہاؤس لاہور میں ۲۵ دسمبر کے حوالے سے ایک تقریب تھی جس میں شرکت کے لیے محترمہ پہلی بار (وزیر اعظم بننے کے بعد) لاہور تشریف لا رہی تھیں' سفارتی حلقوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۳۰۰ افراد کو مدعو کیا گیا تھا جو وہاں پر موجود کم و بیش دو ہزار جیالوں کے ہجوم میں آٹے میں نمک کی طرح گھل مل گئے تھے' گیٹ پر جو طوفان بدتمیزی برپا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ ہم دھکے کھاتے کھاتے ایک ایسے گوشے میں پہنچ گئے' جہاں برادرم اعتزاز احسن' سرور سکھیرا (ایک عزیز دوست جو رسالہ ''دھنک'' کے مالک اور ایڈیٹر تھے اور پیپلز پارٹی کی ۸۸ء کی حکومت میں وزیر اعظم کے پریس سیکرٹری رہنے کے بعد دلبرداشتہ ہو کر امریکہ چلے گئے اور ۹۳ء میں پارٹی حکومت دوبارہ بننے کے باوجود واپس نہیں آئے) اور اکادمی ادبیات پاکستان کے تاحال چیئرمین فخر زمان پہلے سے موجود تھے ہم نے ان کی توجہ اس طوفان بدتمیزی کی طرف دلائی تو تینوں کا مشترکہ جواب کچھ اس طرح کا تھا کہ یہ ضیاء الحق (مرحوم) کے مارشل لاء کے جبر و تشدد کا ایک ہنگامی ردعمل ہے' لوگ آزادی ملنے اور ابتلاء کا دور ختم ہونے کی خوشی میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے ہیں مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ہم نے عرض کیا کہ چیزیں اسی طرف کو بڑھتی ہیں جس طرف ان کا رخ ہوتا ہے سو ہمیں خدشہ ہے کہ آہستہ آہستہ یہ صورت حال

سدھرنے کے بجائے مزید خراب ہوگی اور بوتل سے نکلا ہوا یہ جن نہ صرف یہ کہ دوبارہ بوتل میں بند نہیں ہوسکے گا بلکہ یہ اردگرد کی تمام چیزوں کو بھی توڑ پھوڑ دے گا۔ ہمارے یہ دوست اپنے تجزیے پر اڑے رہے اور بات وقتی طور پر آئی گئی ہوگی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

اب جو ہم نے برادران مسلم لیگ کی یہ کاروائی پڑھی ہے تو ایک بار پھر وہی باتیں دوہرانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ہمارے خیال میں جو کارکن اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں ان کا فوری اور سخت محاسبہ کرنا چاہیے کیونکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ الیکشن کی اس ساری سرگرمی کا مقصد محض لوٹنے اور شور مچانے والے چہروں کی تبدیلی تھی سو جیالے گئے اور ان کی جگہ متوالے آگئے۔

ہمیں یقین ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر اور میاں نواز شریف فیملی اس معاملے کو اس طرح سے نہیں دیکھتے لیکن اگر انہوں نے اس خطرناک روش پر اس وقت قابو پانے کے لیے بروقت' موثر اور مستقل نوعیت کے اقدامات نہیں کیے تو یاد رکھنا چاہیے کہ وقت کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتا' ہر فرد اور گروہ کو اپنے عمل کا حساب دینا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عوام کی یہ عظیم جدوجہد اور تاریکیوں کے چھوٹنے والی روشنی کی یہ کرن بھی اسی طرح کا ایک سراب بن جائے جس کے دھندلکوں میں بھٹکتے بھٹکتے اس قوم کی نصف صدی گزر گئی ہے۔

مسلم لیگ اپنے آپ کو قائداعظم کی سوچ کا آئینہ دار کہتی ہے' سو ہم یہاں مبارک بادوں کے شور میں گھرے ہوئے لیڈران کرام کو قائد ہی کے الفاظ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ''اتحاد' ایمان اور تنظیم'' صرف ان کا نعرہ ہی نہیں تھا ایک ایسا منشور بھی تھا جس پر وہ تمام زندگی نہ صرف خود عمل پیرا رہے بلکہ دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ تنظیم یعنی ڈسپلن کے حوالے سے ان کا رویہ ظاہری طور پر بے حد سخت تھا لیکن جس طرح اولاد کی بہتری کے لیے ماں باپ کو بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے اسی طرح قوم کے لیڈروں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے کارکنوں اور سپورٹرز کی تربیت کریں اور انہیں سیاسی عمل میں محض ''ہجوم'' کے طور پر استعمال نہ کریں۔ یقین جانئے کہ جو کارکن اپنی بدتمیزی' بدنظمی یا ہلڑبازی کے لیے پارٹی سے اپنی وفاداری' خدمات یا الیکشن میں کی گئی محنت کی آڑ لیتا ہے وہ کارکن نہیں' ایک کاروباری یا دیہاڑی دار مزدور ہے جو بازار میں ٹھیلا لگا کر یا سگریٹ کے سوٹے لگانے کے درمیان کچھ اینٹیں ادھر سے ادھر رکھ کر مزدوری کا طالب ہوتا ہے۔

قائداعظم اس نام نہاد ''عوامی جوش و خروش'' یا لیڈر کو چہرے دکھانے والی کارروائیوں کو بے حد ناپسند کرتے تھے اور یہ باتیں ریکارڈ پر ہیں کہ انہوں نے ٹرین سے اترنے یا کسی جلوس میں شامل ہونے سے محض اس لیے انکار کردیا کہ متعلقہ منتظمین تنظیم اور ڈسپلن سے عاری تھے' ظاہر ہے اس بات سے ان کا مقصد کوئی احساس برتری یا اظہار خود پرستی نہیں تھا بلکہ وہ کارکنوں کی ذہنی' فکری اور عملی

تربیت کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ تربیت اس احساس ذمہ داری کو پیدا اور مستحکم کرے جس کی ضرورت مستقبل میں بننے والے پاکستان کو تھی۔

سو یہی وقت ہے اگر ہمارے میاں صاحبان واقعی وطن عزیز کو ایک نیا' خوشحال' ترقی پذیر اور مہذب پاکستان بنانا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اس ''کلچر'' کو ختم کرنا ہوگا۔ کارکنوں سے محبت' ان سے قربت اور ان کے حقوق کے تحفظ کا اظہار اگر جلسے جلوسوں اور نعرے لگانے والوں کی بھیڑ سے ہوتا تو یہ کام کب کا ہو چکا ہوتا۔ جو معاشرے ہجوم اور قافلے کے درمیان موجود ''تنظیم'' کی ضرورت سے غافل ہو جاتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ

ہجوم سے تو کبھی کارواں بنا ہی نہیں!

◆◆◆

نیکی کا بدلہ

جس دن سے میاں نواز شریف نے ''قرض اتارو ملک سنوارو'' کا نعرہ دیا ہے ہمیں بابا گرونانک کی ایک بات رہ رہ کر یاد آرہی ہے۔انہوں نے فرمایا تھا:

ایک نے کہی دوسرے نے مانی
نانک کے دونوں گیانی

اخباری اطلاعات کے مطابق عوام پورے جوش وخروش سے اس مہم میں حصہ لے رہے ہیں۔تاجر برادری اور مالیاتی ادارے بھی خاصے سرگرم ہیں اور سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ملازمین نے بھی فوج سمیت اپنی ایک ایک دن کی تنخواہ اس فنڈ میں جمع کرانے کا اعلان کیا ہے۔ظاہر ہے یہ ساری سرگرمی گزشتہ حکومت کی پالیسیوں سے بیزاری اور موجودہ رہنماؤں پر یقین' اعتماد' امید' توقع اور اطمینان کی آئینہ دار ہے۔گزشتہ رات خواجہ سرور کی بیٹی کی شادی کی دعوت میں ایس ایم ظفر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ حالات جیسے بھی ہیں قوم پر امید اور پر جوش ہوگئی ہے اور پتہ نہیں کیوں مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سوچنے کو جی چاہ رہا ہے۔

محفل میں مختلف لوگوں سے مختلف باتیں ہوئیں لیکن چونکہ یہ ایک شادی کا موقع تھا اس لیے میاں صاحب کا یہ اعلان بھی موضوع گفتگو رہا کہ ۱۵ مارچ کے بعد شادی کی دعوتوں میں صرف ''چائے پانی'' ہی پیش کیے جائیں گے اور ہر قسم کے کھانے کی ممانعت ہوگی۔اس پابندی کے اصل مخالف تو ہوٹلوں اور شادی گھروں والے ہوں گے۔جنہوں نے گزشتہ چند برسوں میں شادیوں کی تقریبات کا کلچر اور رنگ ڈھنگ ہی بدل ڈالا ہے مگر اکثریت کا خیال یہی تھا کہ یہ پابندی اسراف' بے جا نمود ونمائش اور اظہار امارت پر ہونی چاہیے جس کے باعث پہلے سے غریب اور پسے ہوئے طبقوں کے لیے بچیوں کی شادی کرنا ایک عذاب بن گیا ہے اور اس سادگی کی مہم کا اطلاق' ہر طرح کی ایسی دعوت پر ہونا چاہیے جس میں پندرہ یا بیس سے زیادہ افراد شامل ہوں۔اس حوالے سے ون ڈش پارٹی کا ذکر بھی بار بار آیا کہ کھانے کو سرے سے غائب کر دینے سے بہت سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں کہ اس موقع پر باہر سے آنے والے بھوکے پیاسے مہمانوں کو اگر صرف چائے یا شربت پر ٹرخا دیا جائے تو یہ نہ صرف زیادتی ہوگی بلکہ اس سے اسلام کے اس

تصور مہمان نوازی کی بھی نفی ہوگی جس میں مہمان کی پذیرائی کی خاطر میزبان کے لیے خصوصی اہتمام والتزام کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ خود خواجہ سرور نے بھی ان دونوں حدوں کے درمیان توازن کی ایک بہت خوبصورت مثال قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

اگرچہ اس پابندی کا سب سے زیادہ نقصان خود میاں صاحبان کو ہوگا کہ اعلیٰ اور نسلی کشمیری ہونے کے ناتے سے ان کا شوق خورد و نوش اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان رکھتا ہے ان کے عارضی اور مستقل دونوں طرح کے مہمان اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ میاں صاحبان کا دسترخوان نہ صرف بہت وسیع ہے بلکہ اس میں ہمیشہ ان کا کشمیری پن بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ صبح کے وقت ان کے مہمان ہوں اور ناشتے میں نمکین سبز چائے اور باقر خانیاں شامل نہ ہوں۔

کسی دعوت میں ایک بٹ صاحب کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے سے مستقل مصروف طعام تھے جب وہ میز سے ذرا پیچھے ہٹ کر پسینہ پونچھ رہے تھے تو ایک صاحب نے ازراہ تفنن کہا:

''کیا بات ہے بٹ صاحب...... رج گئے او'' (یعنی پیٹ بھر گیا ہے۔)

''نہیں تھک گیا ہوں'' بٹ صاحب نے بڑی سنجیدگی اور آزردگی سے جواب دیا۔

اسی طرح کے ایک اور کشمیری بھائی کو دیر تک مسلسل کھاتے دیکھ کر کسی نے مذاق کیا ''بٹ صاحب...... کھانے کے درمیان پانی بھی پی لیا کرتے ہیں۔''

''درمیان آئے گا تو پی لوں گا۔'' جواب ملا۔

خیر یہ تو آپس کی چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ شادیوں رکی جانے والی اس فضول خرچی اور بے جا رسموں نے معاشرے کے غریب اور سفید پوش طبقے کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور اس طرح کے قانون یا قوانین کے صحیح اور بھرپور اطلاق سے بے شمار والدین کو آسانی ہوگی اور لاکھوں گھروں میں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی بچیوں کے خوابوں کی تعبیر کا ایک راستہ نکل آئے گا۔ سوچنے اور دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس قانون کو نافذ کرنے سے پہلے ان مسائل اور قباحتوں کا جائزہ لے لیا جائے تاکہ اسے متعلقہ تدارک اور ترامیم کے مراحل سے گزرا جا سکے اور اس قانون کو ایسی شکل دی جائے کہ یہ مکمل طور پر موثر اور فائدہ مند ہو سکے۔

جہاں تک میاں نواز شریف کی ملکی قرض اتارنے کی مہم کا تعلق ہے اس کے ضمن میں ہمیں ہمارے برادر خورد احسن اسلام نے ایک بہت ہی دلچسپ' کارآمد اور دوررس نتائج کی حامل تجویز بتائی ہے جو اس کے بقول عوام کے مختلف حلقوں میں گردش کر رہی ہے اور جس پر عمل کر کے میاں صاحب کی حکومت نہ صرف لوگوں کے دل جیت سکتی ہے بلکہ ان کی پریشانیوں کو ختم اور کم کرنے کے سلسلے میں ایک

ایسا ٹھوس قدم اٹھا سکتی ہے جو حکومت اور عوام کے درمیان نہ صرف اعتماد کو بڑھائے گا بلکہ اس ساری مہم میں ایک نئی معنویت پیدا کر دے گا۔

اس تفصیل کا اجمال کچھ یوں ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں مختلف عوامی ضروریات اور سہولیات مثلاً بجلی، گیس، تیل، اشیائے خوردو نوش اور روزمرہ استعمال کی چیزوں پر بے شمار سرچارج لگائے گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ بعض درآمد یا سمگل شدہ غیر ملکی اشیاء پاکستان میں بنی ہوئی چیزوں سے بھی سستی ہو گئی ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ عوام کے اس پر جوش تعاون کے جواب میں اعلان کر دے کہ جوں جوں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے قرضے اترتے جائیں گے ان کی ہر قسط کی ادائیگی کے ساتھ ان کی پالیسیوں کے نتیجے میں عائد ہونے والے یہ سرچارج بھی ختم ہوتے چلے جائیں گے اور یوں عوام کو عملی طور پر اس بات کا ثبوت پیش کیا جائے گا کہ ان کی محنت اور قربانی رنگ لا رہی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر سرتاج عزیز صاحب اس تجویز پر ہمدردی اور سنجیدگی سے غور کریں تو خود ان کے نام میں کی گئی عوام ترمیم ''سرچارج عزیز'' کو بھی عوام واپس لے لیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔

◆◆◆

عمراں لنگھیاں پباں بھار

گزشتہ دنوں انگلستان میں ہونے والے جشن عطاء الحق قاسمی کی مختلف تقریبات میں شرکت کرتے کرتے جب ہم لندن پہنچے تو ابرار ترمذی نامی ایک شخص کا مضمون مقامی اخبار میں چھپا دیکھا جو بظاہر منصور آفاق کے کسی پرانے انٹرویو کے حوالے سے لکھا گیا تھا مگر جس کا اصل ہدف عطاء اور اس کے دوستوں کا حلقہ تھا۔ عطاء نے مضمون پڑھ کر حیرت سے ہماری طرف دیکھا اور کہا ''سمجھ میں نہیں آتا یار اس شخص نے میرے خلاف یہ زہر کیوں اگلا ہے میں نے تو اس پر کوئی احسان نہیں کیا۔'' احسان کی نفسیات کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس انتہائی گہرے اور بلیغ قول میں انسانی فطرت کے جس مشاہدے اور شعور کی عکاسی ملتی ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ فون پر ایک دوست سے پاکستان بات ہوئی تو پتہ چلا کہ حال ہی میں تمغہ حسن کارکردگی حاصل کرنے والے ہمارے ایک مہربان اس مضمون کی فوٹو کاپیاں پورے ملک میں تقسیم کرتے پھر رہے ہیں' یوں وہ بات صاف ہوگئی کہ یہ احسان کا بدلہ کون اتار رہا ہے! اتفاق سے ایک جگہ ہماری ملاقات اس اخبار کے ادبی انچارج مظہر ترمذی سے ہوئی تو وہ ہمارے پرانے شناسا نکلے۔ ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں خالد احمد کے نسبت روڈ والے حلقے میں وہ بھی باقاعدگی سے آیا جایا کرتے تھے۔ گفتگو اہل ادب کے باہمی تنازعات اور ادب کی آڑ میں سرگرم ان مختلف طرح کے ''گھس بیٹھیوں'' کی کارروائیوں سے ہوتی ہوئی اس وقت ایک عجیب سے دائرے میں داخل ہوگئی جب مظہر ترمذی نے بڑے وثوق اور شکوہ بھرے لہجے میں کہا کہ اسد امانت علی کا گایا ہوا مشہور گیت جو وہ خواجہ غلام فرید کی کافی کہہ کر گاتا ہے دراصل ان کا یعنی مظہر ترمذی کا لکھا ہوا ہے۔ ہمارے لیے چونکہ یہ خبر بہت عجیب اور چونکانے والی تھی اس لیے ہم نے اس کی تفصیل جاننا چاہی' مظہر ترمذی نے بتایا۔

''یہ گیت سب سے پہلے ۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے چھپنے والے ایک پنجابی رسالے ''رت لیکھا'' میں میرے نام سے شائع ہوا تھا' پھر مرحوم حسن لطیف کی موسیقی میں اسے اسد امانت علی خاں نے ٹی وی کے ایک پنجابی پروگرام میں گایا' اس کے بعد یہ ریڈیو پر نشر ہوا اور پھر پرائیویٹ محفلوں اور موسیقی کے پروگراموں میں اسد امانت نے اسے اپنی ہٹ آئٹم کے طور پر پیش کرنا شروع کیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ۱۹۹۳ء میں لاہور کی ایک عدالت نے ٹی وی' ریڈیو اور اسد امانت کو اس سلسلے میں ایک قانونی نوٹس بھیجا اور انہی دنوں میں ''ڈان'' لاہور میں اس حوالے سے ایک تفصیلی خبر بھی شائع ہوئی اس ساری کاروائی کے نتیجے میں ٹی وی

نے مدعی یعنی مظہر ترمذی کو گیت کا معاوضہ بھی ادا کر دیا تھا لیکن باقی دونوں پارٹیاں یعنی ریڈیو اور اسد امانت اب بھی اسے خواجہ غلام فرید کی کافی کہہ کر سناتے اور گاتے ہیں۔"

ہم نے مظہر ترمذی سے ان کے لکھے ہوئے گیت کے بول حاصل کیے جو کچھ یوں ہیں۔

حالے نہ ویں اوے کالیا

عمراں لنگھیاں پباں بھار

پھلاں دے رنگ کالے

سرخ گلاباں دے موسم وچ

پھلاں دے رنگ کالے

کدی نہ کنڈے لگے

رڑھدے رڑھدے موت دے شوہ دریاواں اندر

اندروں اندریں وگدا رہندا

پانی درد حیاتی دا

ساڈیاں عمراں توں وی وڈی عمرا ے تیری

حالے نہ وس اوئے کالیا

اب اس سے قطع نظر کہ یہ لائنیں ترتیب اور ٹیکنیک کے اعتبار سے گیت بنتی ہیں یا نہیں! مظہر ترمذی کا دعوی اس اعتبار سے وزن رکھتا ہے کہ بقول ان کے نہ تو ان کے علاوہ اس گیت کا اور کوئی دعویدار ہے اور نہ ہی یہ لائنیں خواجہ غلام فرید کے مطبوعہ کلام میں کہیں ملتی ہیں۔ گزشتہ روز ہم نے ایک ملاقات کے دوران پنجابی کے نامور شاعر احمد راہی سے اس ضمن میں استفسار کیا تو انہوں نے اس سارے معاملے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی ایک نئی اطلاع بھی دی کہ یہ لائن "حالے نہ ویں وے کالیا" ذرا سی تبدیلی کے ساتھ پچاس برس قبل پرکاش کور اور سریندر کور ایک لوک گیت میں گا چکی ہیں سو کم از کم اس لائن کا مظہر ترمذی کا ہونا محل نظر ہے۔

وہ قارئین جو پنجابی زبان سے کم یا عدم واقفیت رکھتے ہیں ان کی سہولت کے لیے ہم واضح کر دیں کہ اس سارے قضیئے میں جو مرکزی مصرعہ ہے اور جس کی شعری قوت لاجواب ہے وہ ہے "عمراں لنگھیاں پبھاں بھار" جس کا آسان اردو ترجمہ کچھ یوں ہوگا کہ

''ہماری زندگی پنجوں کے بل کھڑے کھڑے گزر گئی'' پنجوں کے بل یا پباں بھار کھڑے ہونے میں دراصل انتظار اور اس کی بے چینی کا اظہار پایا جاتا ہے کہ اس طرح کھڑا ہو کر انسان زیادہ دور تک دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس منظر میں آپ گاؤں کے مکانوں کی پانچ چھ فٹ اونچی بیرونی دیوار کو بھی شامل کرلیں جس کے اوپر سے اچک اچک کر گاؤں کی عورتیں آنے والوں کی راہ دیکھتی ہیں تو اس ''عمراں لنگھیاں پباں بھار'' کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

یہ مصرعہ بیس برس پرانا ہو یا سوڈیڑھ سو برس' ایک بات طے ہے کہ اطلاقی اعتبار سے یہ آج کا بالکل نیا اور انتہائی مبنی بر حقیقت مفہوم کا حامل ہے مثلاً جب ہم اسے اپنی قومی سیاسی زندگی پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں تو واقعی ''عمراں لنگھیاں پباں بھار'' کی سی صورت سامنے آجاتی ہے کہ گزشتہ ۲۰ برس سے کم از کم تین نسلیں ''پباں بھار'' کھڑی ہو کر جمہوریت' مارشل لاء' اسلام اور سوشلزم کی بدلتی ہوئی دیواروں کے اس طرف سے آنے والے ''امن'' ''سماجی انصاف'' ''استحصال سے پاک معاشرے'' ''ترقی کے مساوی مواقع'' ''اسلامی فلاحی ریاست'' ''دینی اتحاد'' اور اس بہتر مستقبل کا انتظار کر رہی ہیں جن کے دھندلے دھندلے نقوش برسوں سے حد نظر کے آس پاس کہیں جل بجھ رہے ہیں۔

''پب'' پنجابی میں پاؤں کے پنجے اور انگریزی میں شراب خانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لندن میں عارف وقار نے اس لفظ کی ذو معنویت کے حوالے سے ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا جو ہم آپ کی تفنن طبع کے لیے درج کر رہے ہیں۔

''ہمارے ایک نامور موسیقار چند سال پہلے لندن گئے۔ ان کے میزبانوں کو علم نہیں تھا کہ وہ مے نوشی سے شوق کرتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے بہت طریقے سے باتوں باتوں میں پوچھا۔

''کیا خیال ہے کسی پب وغیرہ میں چلیں؟''

اس پر ہمارے موسیقار نے ایک طویل انگڑائی لی اور تقریباً جھوم کر کہا۔

''کیوں نہیں جی! ساڈیاں تے (ہماری تو) عمراں لنگھیاں پباں بھار''

◆◆◆

بارودی سرنگیں

رحمت سید لولاک پہ کامل ایمان
امت سید لولاک سے خوف آتا ہے

یہ کیسی سپاہیں ہیں جو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے صحابہ کرام کے ناموس پر قائم ہوئی ہیں اور شب وروز اپنے ہی ہم وطنوں اور مذہبی بھائیوں کے گلے کاٹنے پر تلی رہتی ہیں! یہ کیسا جہاد ہے! جس میں اہل ایمان ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہیں اور دونوں طرف سے چلنے والے تیروں کا ہدف اپنوں ہی کے سینے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں جو ناموس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناموس صحابہ اور ناموس اہل بیت کا نام لیتے ہیں اور اپنے ہی دینی بھائیوں کے خون سے شب وروز ہولی کھیلتے ہیں۔ قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے کہ یہ اپنے اوپر روا رکھا تو وہ دن دور نہیں جب ہر طرف خون ہی خون ہوگا اور رحمت حق ہم سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لے گی کہ اللہ اپنے حق تو معاف کر دیتا ہے اپنے بندوں کے حقوق غضب کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور جو لوگ بے گناہ انسانوں سے ان کے زندہ رہنے کا حق چھین لیتے ہیں تحقیق کہ ان کے لیے کوئی معافی نہیں۔

ہم نے اور ہمارے ساتھ بہت سے لکھنے والوں نے بار بار اہل وطن اور ارباب اقتدار کو مذہبی جنونیوں کی تشدد پسند ذہنیت اور جہالت کے شاخسانے تھے جن کی نوعیت وقتی ہنگامی اور محدود ہوتی تھی لیکن اب گزشتہ چند برس سے جو کچھ ہو رہا ہے یہ کھلی کھلی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کی جانے والی دہشت گردی ہے جس کے پیچھے ایسا غیر ملکی سرمایہ ہے جو بدقسمتی سے کچھ ایسے مسلمان ممالک کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے جو اس کے ذریعے اپنی لڑائی ہماری سرزمین پر اور ہمارے لوگوں کی جانوں کی قیمت پر لڑ رہے ہیں۔ اس ضمن میں جن چار ملکوں کا نام بار بار لیا جاتا ہے ان میں ایران' سعودی عرب' لیبیا' اور عراق شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی تمام جماعتوں اور تنظیموں کا تعلق کسی نہ کسی طرح انہی چاروں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر یہ الزام سچ ہے تو ہماری حکومتوں' انتظامیہ اور دفتر خارجہ نے ان ملکوں کو اس مذموم فعل سے روکنے اور ان کے ایجنٹوں کو امن عامہ کی بربادی اور اس آئے دن کی دہشت گردی سے باز رکھنے کے لیے کیا کیا ہے؟ اور اگر کچھ نہیں کیا تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

اس سارے فساد کی جڑ اگرچہ امت مسلمہ کے ماضی میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے لیکن برصغیر کی حد تک اسے اہل فرنگ کی عیار

عقل کے حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریز نے جان لیا تھا کہ مسلمان قوم اپنے تمام تر زوال' پسماندگی' بے راہ روی' انتشار اور بے جہتی کے باوجود خدا اور رسول کے نام پر ہمیشہ ایک ہو جاتی ہے اور جب تک یہ حبل متین اور سانجھ کی ڈوری ان کے درمیان قائم ہے یہ ان کے حکومتی عزائم کے لیے ہمیشہ خطرہ بنے رہیں گے۔ سو انہوں نے ایک ایسی پالیسی وضع کی جس کا مقصد اس رشتے کو اس حد تک کمزور کرنا تھا کہ یہ آئندہ کبھی ان کے لیے خطرہ نہ بن سکے اور یوں فرقہ واریت کا زہر ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ہمارے معاشرے کی رگ جاں میں شامل کر دیا گیا اور پھر چشم عالم نے دیکھا کہ مسجد جو تمام مسلمانوں کی عبادت گاہ اور جائے مشورت تھی اس کے دروازوں پر لکھا جانے لگا کہ اس میں کس مسلک کے مسلمان نماز پڑھ سکتے ہیں اور کن کن کے لیے یہ جائے ممنوعہ ہے! ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے جب کسی دوسرے مسلک کے مسلمان کے کسی مخصوص مسلک والوں کی مسجد میں نماز پڑھنے کی وجہ سے مسجد کو غسل دے کر پاک کیا گیا مگر موجودہ دور میں ہونے والے ظلم' بربریت اور دہشت گردی کے سامنے یہ بات محض چند بگڑے ہوئے بچوں کا ایک کھیل لگتی ہے کہ اب تو لوگ کلاشنکوفیں لے کر آتے ہیں اور سجدے میں پڑے ہوئے نمازیوں پر فائر کھول دیتے ہیں جیسے یہ فرضی پولیس مقابلوں میں ہلاکت کے لیے جمع کیے گئے بدمعاش اور قاتل ہوں.......

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت جو تمام دنیا کے لیے اتفاق' محبت اخوت اور یگانگت کی ایک روشن مثال تھی آج اس فرقہ واریت کے زہر سے نیلی ہو رہی ہے اور اس کے انتشار کا یہ عالم ہے کہ اس کے مذہبی لیڈر جب باہمی اتفاق اور مشترکہ تحریک چلانے کے لیے جمع ہوتے ہیں تو نماز کے وقت علیحدہ علیحدہ صف بندی کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب محمود و ایاز' بندہ اور بندہ نواز کی جگہ شیعہ اور سنی کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں۔

حالیہ رشید نے فون پر اس سانحے کے بارے میں ہمارے تاثرات پوچھے تو ہمیں خیال آیا کہ یہ سوال تو اصل میں ہمارے ان سیاسی لیڈروں سے کیا جانا چاہیے جنہیں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور اقتدار کی ہوس کے سوا نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ کچھ سنائی دیتا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ان سب لوگوں سے عوام اس بات کا وعدہ لیں کہ ان میں سے جو بھی اقتدار میں آئے گا اس مسئلے کا حل اس کی ترجیحات میں سرفہرست ہو گا۔

یاد رکھیے کہ اگر ہمارے درمیان سے فرقہ واریت کی یہ بارودی سرنگیں ہٹائی نہ گئیں تو دھماکاوں کا یہ سلسلہ قوم کے پہلے سے شکستہ اور لرزیدہ در و بام کو آگ اور خاک کا ڈھیر بنا دے گا اور یہ تباہی ایسی ہوگی جس سے کسی کو بھی پناہ نہیں ملے گی۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے "پاکستاں" والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

◆◆◆

ہماری کشمیر پالیسی

ہم یہ تونہیں جانتے کہ قاضی حسین احمد صاحب کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے جماعت اسلامی کا کردار کس حد تک تبدیل ہو چکا ہے لیکن جہاں تک اس کے مزاج' انداز اور اپروچ کا تعلق ہے اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں اب کسی تعارف کی محتاج نہیں رہیں۔ یوں تو مولانا مرحوم کی زندگی میں ہی جماعت کا سیاسی کردار اس کے علمی' مذہبی' تنظیمی اور تبلیغی کردار کے قدم بقدم چلنا شروع ہو گیا تھا مگر یہ کسی کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس پر سیاست نہ صرف اتنی غالب آجائے گی بلکہ یہ اپنے مزاج سے بالکل ہٹ کر اسی رنگ میں ڈھل جائے گی جو ہماری بے سمت' بے روح اور بے اصول سیاست کی پہچان بن چکا ہے۔

عبدالرشید ترابی صاحب جماعت کے پرانے کارکن اور لیڈر ہیں آج کل آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر بھی ہیں اور آزاد کشمیر میں جماعت اسلامی کے غالباً سب سے اہم اور فعال نمائندے ہیں۔ ہمیں ان سے دو چار بار ملاقات کا موقع بھی ملا ہے لیکن چونکہ ہر بار گفتگو کا موضوع ''جہاد کشمیر'' تھا لہٰذا ہمیں یہ جاننے کا موقع نہیں مل سکا کہ ان کی شخصیت میں قاضی صاحب' مولانا مودودی اور ان کی اپنی فکر اور ذات کا تناسب کیا ہے؟ البتہ جہاں تک جہاد کشمیر اور اس میں جماعت کی شمولیت کا تعلق ہے اس حوالے سے ہم نے انہیں بہت سنجیدہ' متعلق اور پر جوش پایا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں جہاد اور تحریک آزادی کے حوالے سے وادی میں جو صورتحال بنی اور بدلی ہے اس میں پاکستان کا کردار انتہائی اہم ہونے کے باوجود بے حد غیر متوازن رہا ہے۔ ضیاء الحق' محمد خان جونیجو' بے نظیر زرداری' میاں نواز شریف اور ایک بار پھر بے نظیر کی حکومتوں میں اگر تین نگران حکومتوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو گزشتہ تقریباً گیارہ برسوں میں ہماری کشمیر پالیسی میں چھوٹے بڑے آٹھ موڑ آئے ہیں۔ اس دوران میں جہاں چھ لاکھ بھارتی فوج نے وادی کا محاصرہ کیے رکھا ہے وہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کشمیری بچے' بوڑھے' جوان اور خواتین اپنی عزت جان' مال اور آزادی سے محروم ہوئے ہیں۔ ظلم وستم اور ایمان وایقان کی ایسی ایسی داستانیں رقم ہوئی ہیں کہ جن کی مثال انسانی تاریخ میں کم کم ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جدوجہد کا اصل کریڈٹ تو مقبوضہ کشمیر کے ان حریت پسندوں کو ہی جاتا ہے جو کب سے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے اپنی صبح آزادی کے منتظر ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف اسلامی ممالک کے ان مجاہدین کا جذبہ بھی لائق تحسین ہے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر اس جہاد میں حصہ لینے کے لیے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب کو اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے نوجوانوں کو سب سے زیادہ مدد اور

رہنمائی اگر کسی نے فراہم کی ہے تو وہ آزاد کشمیر کی جماعت اسلامی ہی ہے جو پاکستانی حکومتوں کی دم بدم بدلتی ہوئی پالیسیوں سے قطع نظر اپنے تنظیمی اور امدادی کام میں ہمہ تن مشغول رہی ہے۔

جہاد کشمیر جن مراحل سے گزرا ہے اور اس وقت وہاں جو صورت حال ہے اس کے تجزیے میں اہل فکر و نظر میں جزوی اور کہیں کہیں بنیادی اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے شائد کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کشمیر نہ صرف پاکستان کی شہ رگ ہے بلکہ وہاں منصفانہ بنیاد پر امن قائم ہوئے بغیر برصغیر میں عوام کے معیار زندگی کی ترقی ممکن ہی نہیں۔ ہماری اکثر حکومتیں افغانستان کے مسئلے میں پاکستان کی شمولیت کے نتائج سے ڈر کر ایک ایسی کشمیر پالیسی پر عمل پیرا رہی ہیں جس نے نہ صرف ہمیں دیوار کے ساتھ لگا دیا ہے بلکہ کشمیری عوام کے دل و دماغ میں بھی ہماری یہ بے دلی انتہائی منفی رجحانات کو جنم دے رہی ہے۔

رشید ترابی صاحب نے اپنے ایک حالیہ خط میں اپنے کچھ تاثرات اور اندیشوں کا اظہار کیا ہے کشمیر کے مسئلے اس کی نوعیت اور موجودہ صورتحال کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر سے جزوی اختلاف تو ممکن ہے لیکن عمومی طور پر ان کی باتیں اپنے اندر ایک ایسا سوز' دردمندی' فکر اور وزن رکھتی ہیں کہ جن پر ہم سب کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

کشمیر کی تحریک آزادی ہم سب کے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران انتہائی نامساعد حالات میں بیش بہا قربانیاں پیش کر کے وہاں کے مجاہدین اور مجاہد صفت عوام نے اس تحریک کو زندہ رکھا۔ پاکستان کے اپنے حالات کی وجہ سے انہیں مطلوبہ امداد نہ مل سکی اس کے باوجود مایوس ہوئے بغیر وہ اپنی تحریک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بھارت نے تمام ہتھکنڈے آزمانے کے بعد گزشتہ دنوں انتخابات کا ڈھونگ رچایا لیکن اللہ کے فضل و کرم سے اس کا یہ وار بھی بے نتیجہ رہا' اس عرصہ میں مجاہدین کی کارروائیوں میں اضافہ ہوا خود فاروق عبداللہ مجاہدین کی طرف سے کیے گئے کئی حملوں میں بار بار بچا۔ حیرت کانفرنس کے قائدین جان ہتھیلی پر رکھ کر عوام کے درمیان موجود ہیں اور سیاسی سطح پر اقدامات کر رہے ہیں تمام قائدین پر متعدد قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں اس کے باوجود وہ اپنی تحریک کے حوالے سے پرعزم ہیں اس پس منظر میں پاکستان کی طرف سے موثر اقدامات ہونے چاہئیں تھے لیکن بعض واقعات تشویشناک اشارات کر رہے ہیں مثلاً.......

ا۔ چینی صدر کے دورہ اسلام آباد کے موقع پر روایتی پر جوش موقف سے ہٹ کر اسے دوطرفہ معاملہ قرار دے کر حل کرنا یا اس سمت متنازعہ مسائل کو فریز کرنے کا مشورہ دینا!

۲۔ ایرانی سفیر' اسلام آباد اکبر زادہ کی طرف سے بھارت کے ساتھ تجارتی تعلقات کی وکالت کرنا!

۳۔ جکارتہ میں او آئی سی کے وزراء کارجہ کی کانفرنس کے موقع پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے ساتھ پہلی مرتبہ شملہ معاہدہ کو بھی نتھی کرنا!

۴۔ گلگت بلتستان کو ٹی وی پر ریاست جموں وکشمیر کا حصہ دکھانے کی بجائے پاکستان میں ضم کر کے پیش کرنا!

۵۔ حالیہ سارک کانفرنس میں سارک ممالک کو ٹریڈ فری زون قرار دینا اور سرکاری سطح پر بھارت کے ساتھ تجارت کی وکالت کرنا!

۶۔ پیپلز فورم کے تحت دوسوسے زائد دانشوروں کا دورہ بھارت جسے دونوں طرف ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی گئیں!

◆◆◆

دوسرا رخ

میاں نواز شریف کی حکومت نے اتنی بڑی تعداد میں اعلیٰ سرکاری ملازمین کو معطل کر کے گویا ایک طرح سے اس آپریشن کلین اپ کا آغاز کر دیا ہے جس کی ان سے توقع کی جارہی تھی فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب کے اعتبار سے کرپٹ یا کرپشن میں شرکت کے ''ملزمان'' کی پکڑ دھکڑ تیسرے چوتھے نمبر پر متوقع تھی اور غالب خیال یہی تھا کہ حکومت اس کا آغاز قومی قرضوں کے نادہندگان اور ان سیاستدانوں سے کرے گی جو اربوں نہیں بلکہ کھربوں روپے ڈکار کے بیٹھے ہیں اور یہ بھی نہیں کہ یہ لوگ ڈھکے چھپے ہوں یا ان کے جرائم کی تفتیش اور ثبوتوں کی فراہمی کے لیے کوئی زیادہ تردد کرنا پڑے۔ قومی بنکوں کے ریکارڈ اور مختلف حکومتی ایجنسیوں کی وساطت سے ایسے لوگوں کی فہرستیں آسانی سے تیار کی جاسکتی ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مختلف صورتوں میں یہ فہرستیں کئی بار شائع بھی ہوچکی ہیں۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر حکومت صرف چار سو بااثر خاندانوں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لے لے تو اس ملک کے سارے قرضے ایک ہفتے کے اندر اندر ادا ہوسکتے ہیں اور اگر بیرون ملک منتقل کیے گئے غیر ملکی زرمبادلہ کا تیس فیصد بھی واگزار کرا لیا جائے تو یہ ملک اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرکاری عمال اور افسران کی مدد بدانتظامی اور بعض صورتوں میں حصہ داری کے بغیر مندرجہ بالا دونوں ''کارہائے نمایاں'' آسانی سے سرانجام نہیں دیئے جاسکتے لیکن بڑے مجرم اور شریک جرم کو پکڑنے کے سلسلے میں تقدیم وتاخیر کا خیال رکھ لیا جائے تو یہ بات زیادہ مناسب ہوتی ہے۔

یہ معطل شدہ افسران' کرپٹ ہیں یا نہیں .... ؟ ان کا انتخاب صرف کرپشن کے حوالے سے کیا گیا ہے یا اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں؟....... چند ان سے کہیں زیادہ بدنام افسران کو کس بات کی رعایت دی گئی ہے؟ بیورو کریسی کی اس تطہیر کی مہم میں کہیں کچھ بے گناہ اور ایماندار لوگ تو نہیں رگڑے جارہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر بہت سی باتیں ہوسکتی ہیں لیکن اس وقت ہم اس تصویر کے دوسرے رخ کی بات کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ یہ کہ اپنے وسائل سے باہر اور بالاتر زندگی گزارنے والے چند فیصد سرکاری افسران کی پڑتال تو ہوگئی مگر وہ جوان کی خاموش' مجبور اور درماندہ اکثریت ہے اس کی طرف کب نظر ہوگی! ہمیں یقین ہے کہ ارباب اختیار کے سامنے وہ صورتحال بھی اپنی پوری تفصیل کیساتھ واضح ہوگی جس میں بیشتر سرکاری ملازمین زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی اس

افسوسناک حالت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایمانداری سے کمائے ہوئے رزق حلال کے قائل ہیں اور اپنے اس اصول کی سزا کے طور پر زندگی کو ایک جبر مسلسل کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ یہاں ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ہمارا اشارہ سچ مچ کے ایمانداروں کی طرف ہے اس مخصوص گروہ کی طرف نہیں جو اچھی اور منافع بخش پوسٹنگ ہونے کی وجہ سے کمائی سے محروم رہتے ہیں۔

گزشتہ پانچ برس میں سب سے زیادہ ظلم اسی طبقے کے ساتھ ہوا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی تنخواہیں نہ بڑھنے کی حد تک بڑھی ہیں بلکہ اس دوران میں ہونے والی مہنگائی نے ان کی پہلے سے نیم مردہ قوت خرید کو اس قدر کم اور نڈھال کر دیا ہے کہ ان کے لیے سفید پوشی تو ایک طرف ستر پوشی قائم رکھنا مسئلہ بن گیا ہے۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات' یوٹیلیٹی بلز' کھانے پینے اور روزمرہ استعمال کی اشیاء' لباس' جوتے' ٹرانسپورٹ کے کرائے' پھل' مشروبات' کون سی چیز ایسی ہے جس میں ہوشربا گرانی نہیں ہوئی! سو عالم یہ ہے کہ عملی طور پر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں ہر بجٹ کے ساتھ مزید کمی واقع ہو رہی ہے اور کوئی ان کا پریشان حال نہیں۔ محکمہ جاتی ترقیوں میں ان کی ایمانداری بونس کے بجائے رکاوٹ بن جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کو ان کے بیشتر افسر اور ماتحت یکساں طور پر پسند نہیں کرتے۔ بعض صورتوں میں یہ ناانصافی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اس کے شکار لوگ چڑچڑے' زود رنج' مردم بیزار اور خود اذیتی کے مریض بن جاتے ہیں۔ دفتر' گھر اور معاشرے سے پڑنے والی سہ طرفہ مار کھا کھا کر ان کے دل و دماغ زخموں سے چور چور ہو جاتے ہیں اور ان کی ایمانداری اور ادائی فرض کی صلاحیت کو یہ کہہ کر نشانہ تضحیک بنایا جاتا ہے کہ "یہ کون سے احسان کی بات ہے آدمی کو ایماندار اور فرض شناس تو ہونا ہی چاہیے۔" زخم پر نمک چھڑکنے کا یہ عمل اس وقت اور زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جب ایسی باتیں کرنے والے لوگ اپنے تمام کالے کرتوتوں کے باوجود معاشرے میں نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ عام طور پر عزت کی نگاہ سے بھی دیکھے جاتے ہیں۔

اس نوع کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کی مثالیں تو سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہیں لیکن اس وقت ہم صرف ایک مثالی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی بنیاد پر منتخب ہونے والے پی سی ایس افسروں کے آخری گروپ کو اب ملازمت میں ۲۹ برس ہو چکے ہیں لیکن انہیں ابھی تک انیسویں گریڈ میں ترقی نہیں ملی اور یہ لوگ ڈپٹی سیکرٹری یا اس کے مساوی پوسٹوں پر کام کرتے چلے آ رہے ہیں کیونکہ ان کے لیے مخصوص سیٹوں پر سی ایس پی حضرات قبضہ کیے بیٹھے ہیں جبکہ اسی گروپ کے دوسری پوسٹوں پر (جو پوزیشن کے اعتبار سے ان لوگوں سے پیچھے تھے) فائز لوگ اپنے اپنے محکموں میں سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ چکے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان افسران کی فرسٹریشن کس کھاتے میں ڈالی جائے۔ اتفاق سے ہم اس گروپ کے چند لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں

اس لیے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس محکمہ جاتی بے انصافی کے باوجود یہ انتہائی محنتی، صاف ستھرے اور دیانتدار سرکاری اہلکار ہیں۔

مقصد اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ عدل کے لیے جہاں سزا کی ضرورت ہے وہاں جزا بھی اس کا لازمی جزو ہے سو اس تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر رکھیے۔

◆◆◆

دلوں جیسی تنگ سڑکیں

ایک زمانہ تھا' ویسے کوئی اتنا پرانا بھی نہیں تھا یہی کوئی بیس پچیس برس درمیان میں پڑتے ہیں' ہم اپنے عزیزوں' رشتہ داروں سے ملنے سیالکوٹ جایا کرتے تھے تو گوجرانوالہ تک پہنچنے میں کم و بیش ایک گھنٹہ لگتا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ روزانہ اخبارات نے بتانا شروع کیا کہ پاکستان مسلسل ترقی کر رہا ہے اور ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے اس تیزی سے گڑ رہے ہیں کہ میدان چھوٹا پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ برآمدات نے درآمدات کی جگہ لے لی ہے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ اب یہ اعلانات اور اعداد و شمار چونکہ حکومت کے ذمہ دار اداروں اور افراد کی وساطت سے آ رہے تھے اور ہیں اس لیے انہیں تسلیم نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ ممکن ہے پاکستان نام کے دو ملک ہوں اور ہم اس کے دوسرے یا غلط حصے میں رہ رہے ہوں!!

اب دیکھئے نا یہ کیا بات ہوئی کہ نئی سے نئی اور طاقتور انجن والی موٹریں آ گئیں' شیر چیتے اور دیگر بہادر اور اعلیٰ نسل کے جانوروں کی برق رفتاری کو مات دینے والی پٹرول کی قسمیں دریافت ہو گئیں' سنگل کی جگہ اس سے کئی گنا بڑی دوہری یا دو رویہ سڑکیں بن گئیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کئی نئے محکمے وجود میں آ گئے لیکن لاہور سے گوجرانوالہ کے سفر کا دورانیہ ایک گھنٹے سے بڑھ کر پونے دو گھنٹے تک پہنچ گیا ہے!!

یہ ان دونوں کی بات ہے جب سوویت روس مجتمع تھا اور امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی پیدائش میں نہ صرف ایک رکاوٹ بنا ہوا تھا بلکہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک تھا اور دونوں ملک دو بلاکوں کی صورت میں ساری دنیا کو اپنے پیچھے پیچھے لے کر چل رہے تھے اور دیگر کارروائیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف لطیفے بھی چھوڑتے رہتے تھے۔

ایک روسی اور امریکی اپنے اپنے ملک کی برتری جتانے کی کوشش کر رہے تھے امریکی پائپ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں روسی کے منہ پر چھوڑتے ہوئے بولا۔

''ہماری ریاست ٹیکساس میں ایسے ایسے زراعتی فارم ہیں کہ اگر آپ علی الصبح ٹرین پر بیٹھ کر اس کے گرد چکر لگانا شروع کریں تو شام تک فارم کا ایک چکر بمشکل پورا ہوتا ہے۔''

روسی نے چند لمحے سوچا پھر افسردہ انداز میں سر جھٹکتے ہوئے بولا:

''ہمارے ملک میں بھی ٹرینیں بہت سست ہیں۔''

ہوا یوں کہ ہم اپنے گھر سے جی ٹی روڈ پر چڑھنے کے لیے حبیب اللہ روڈ' ڈیوس روڈ' شہراہ قائداعظم (مال روڈ)' لوئر مال' داتا صاحب اور راوی پل کا روٹ بنا کر نکلے تو حبیب اللہ روڈ کے مانوس مگر خوفناک اور مسلسل گڑھوں سے آنکھ مچولی شروع ہوگئی۔ چونکہ یہ گڑھے اب خاصے سینئر ہو چکے ہیں اور ہمارا یہاں سے روز کا آنا جانا ہے اس لیے ان سے متعلق دھچکوں اور جھٹکوں کی نہ صرف ہمیں بلکہ ہماری گاڑی کو بھی عادت ہو چکی ہے۔ ڈیوس روڈ تک (جس کا آسان نام اب سر سلطان محمد شاہ آغا خاں سوئم روڈ رکھا گیا ہے) بھی خیریت گزرتی لیکن اب جو ہم نے چیئرنگ کراس کو کراس کیا ہے تو ایک دم ٹریفک رک سی گئی معلوم ہوا کہ سڑک کے درمیان کئی دن سے سیمنٹ کے بڑے بڑے سلیب رکھ دیئے گئے ہیں تا کہ سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اب اس سے قطع نظر کہ میاں میر پل سے پی ایم جی آفس تک سڑک کے اس ٹکڑے کی ایک اپنی خوبصورتی اور گریس (GRACE) ہے جس کی نظیر ہمیں یورپ اور امریکہ میں بھی کم کم دکھائی دی ہے اس کی چوڑائی اور وضع کچھ ایسی ہے کہ یہاں ٹریفک خود بخود ایک غیر مرئی وسطی لائن کی پابندی کرتی ہے اور اگر کوئی گاڑی اپنی حد سے تجاوز کر کے سامنے سے آنے والی ٹریفک کے علاقے میں قدم رنجہ فرماتی ہے تو وہ عام طور پر پولیس کی گاڑی ہوتی ہے یا مبینہ طور پر پولیس کے اشتراک سے چلنے والی کوئی ویگن ہوتی ہے جس کے ڈرائیور کو سات سے زیادہ خون معاف ہوتے ہیں پتھر کے یہ ٹکڑے آج کل صرف مال روڈ پر ہی نہیں لاہور کی بیشتر پرہجوم سڑکوں کی پہلے سے ناکافی چوڑائی کو مزید کم کرنے کے لیے برسرِعمل نظر آتے ہیں' تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ان کے درمیان دائیں بائیں مڑنے کے لیے آٹھ آٹھ دس دس فٹ کے وقفے رکھے جاتے ہیں تا کہ دونوں طرف سے آنے جانے والی گاڑیاں یہاں مڑنے کی تگ و دو میں ایک دوسرے کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں اور ان کے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو اپنے ہارن چیک کرنے کا موقع مل جائے' سو ہوتا یوں ہے کہ بڑے بڑے چوراہوں میں لوڈ شیڈنگ کے بغیر بھی لوڈ شیڈنگ ہی رہتی ہے اور ٹریفک پولیس کا عملہ چاروں طرف تا حد نظر پھنسی ہوئی گاڑیوں کو ایک ادائے بے نیازی سے گزرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ حبیب اللہ روڈ پر ممدوٹ والا نامی ایک پرانی عمارت ہے۔ کہتے ہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے قائداعظم لاہور تشریف لاتے تو اکثر اسی عمارت میں قیام کرتے تھے۔ اب اس کے سامنے کی تنگ سڑک بڑے بڑے گڑھوں سے اٹی رہتی ہے۔ اسی طرح شاہراہ قائداعظم پر ہائیکورٹ کے عین سامنے ٹریفک کا نظام دن میں کئی کئی بار جمہوریت کی طرح عدم اعتماد کا شکار نظر آتا ہے۔ ہمارے سفر کا اگلا مرحلہ داتا دربار کے سامنے سڑک کے اس حصے سے گزرنا تھا جو حاسد کے دل اور غاصب کی آنکھ کی طرح تنگ ہے۔ اور یہ دراصل ابتداء ہے اس طویل ٹریفک جام کی جس کا سلسلہ عام طور پر بادشاہی مسجد' چوک یاد

گاڑ بندروڈ چوک اور پل راوی سے اس گول چکر والے چوک تک پھیلا ہوا ہے جہاں سے دائیں بائیں بہت سی سڑکیں نکلتی ہیں۔ بعض اوقات یہ تین چار کلومیٹر کی مسافت تقریباً ایک گھنٹے پر محیط ہو جاتی ہے۔ متعلقہ محکموں والوں کا بیان ہے کہ اس صورتحال کی ذمہ داری سڑک کی کم چوڑائی اور ٹریفک کے شدید دباؤ پر عائد ہوتی ہے جس کا فی الوقت کوئی حل کسی کے پاس نہیں ہے۔

بسوں، ویگنوں، تانگوں، رکشوں اور پھل والوں کی دکانوں کے اردگرد پھیلے ہوئے کیچڑ میں سے رستہ بناتے ہوئے جب ہم بالآخر سڑک کے اس حصے پر پہنچے جسے عرف عام میں ''ہائی وے'' کہا جاتا ہے تو وہاں بھی ٹریفک کا یہ حال تھا کہ بقول سودا:

تری گلی سے گزرتا ہوں اس طرح ظالم
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گزرے ہے

دوطرفہ ٹریفک والی سڑک کہیں سنگل روڈ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کہیں ایک دم چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور پتھر کی کم و بیش چار فٹ اونچی دیواریں سڑک کے بیچوں بیچ استادہ یا زیر تعمیر نظر آتی ہیں۔ بہت غور کے باوجود ہم پر ان ''عناصر اربعہ'' کا مقصد واضح نہیں ہو سکا کہ کیا اس طرح ہلکی اور بھاری ٹریفک کے لیے علیحدہ علیحدہ رستے بنائے جا رہے ہیں یا انگلستان کی طرح راستے میں آنے والی آبادیوں کے لیے مرکزی سڑک سے اگزٹس (EXITS) بنانے کا پروگرام ہے کیونکہ تنگ اور ناہموار سڑک پر اوور ٹیک کرتی ہوئی گاڑیاں آپ کو سوچنے کا وقت ہی نہیں دیتیں۔ ہمارے عزیز دوست اور ہم سفر شمیم اختر سیفی کا خیال تھا کہ سڑکوں کے ساتھ یہ تمام کارروائیاں صرف کارروائی ڈالنے کے لیے ہیں کیونکہ اس طرح کے ناقابل عمل اور عوام کی مشکلات میں اضافہ کرنے والے منصوبے ہی رزق حرام کے لیے موزوں ترین ہوتے ہیں یعنی یا تو عوام اور اخبارات کی چیخ و پکار سے ان فیصلوں کو بدل کر کسی ایسے ہی نئے منصوبے کا ڈول ڈالا جاتا ہے (جس میں نہ صرف پہلے سے موجود تعمیر کو ختم کرنے کے چکر میں سرکاری مال بغیر ڈکار کے کھایا جاتا ہے بلکہ نئے منصوبے میں بھی بڑھتی ہوئی مہنگائی کو بطریق احسن شامل کیا جاتا ہے) یا پھر وقتاً فوقتاً آنے والے سیلاب ان محکموں کے حق میں ''کنارا'' ثابت ہوتے ہیں۔

واپسی پر ہم نے مینار پاکستان سے بائیں مڑ کر لاری اڈے اور ریلوے سٹیشن کا راستہ اختیار کیا جہاں ایک موریہ اور دو موریہ پلوں کے نواح میں غالباً چندر گپت موریہ کے زمانے سے ٹریفک اس طرح چل رہی ہے کہ آدمی خواہ مخواہ تقدیر کا قائل ہو جاتا ہے۔ سٹیشن سے علامہ اقبال روڈ کی طرف مڑے تو ون وے ہونے کے باوجود ٹریفک سات آٹھ قطاروں میں بکھر کر رکی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھا تو تین چار قطاروں میں بسیں اور ویگنیں انتہائی بے تکلفی سے پارک تھیں اور باقی کی بچی کھچی جگہ پر ڈرائیور حضرات اپنے

اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک جگہ کوئی چار فٹ جگہ خالی تھی مگر اس سے چند قدم ادھر ایک ٹریفک سارجنٹ صاحب اپنی بڑی سی سٹارٹ موٹر سائیکل پر کالی عینک لگائے بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ ہم نے ان سے عرض کی کہ اگر آپ ٹریفک کو کنٹرول کرنے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں تو کم از کم یہ راستہ ہی چھوڑ دیجئے کہ آپ کی سواری لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کر رہی ہے۔ اس پر ان صاحب نے جو جواب دیا اس پر صرف جھگڑا ہو سکتا تھا لیکن چونکہ ہم ایک پڑھے لکھے اور باشعور شہری ہیں اور اس طرح کے جھگڑوں کے انجام سے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے ہم نے حق پرستی پر عزت بچانے کو ترجیح دی اور اس کی بات کو ان سنا کر کے ایک رکشے اور ویگن کے درمیان حادثاتی طور پر پیدا ہونے والے خلا میں گم ہو گئے۔

◆◆◆

ریل یا جیل

سٹیفنسن نے جب سٹیم انجن ایجاد کیا تو شائد اس کے سان وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ آگے چل کر پاکستان کا محکمہ ریلوے اس کی اس ایجاد کا کیا حشر کرنے والا ہے! یوں تو وطن عزیز کا ہر سرکاری محکمہ اپنی مثال آپ ہے مگر ریلوے کو اگر چیمپئن آف چیمپئنز کہا جائے تو یہ غیر مناسب نہ ہوگا۔ ضلع کچہری' پولیس تھانہ اور ریلوے سٹیشن انگریز کی وہ باقیات ہیں جنہیں ہم نے اب تک جوں کا توں سینے سے لگا رکھا ہے۔ ریلوے والوں نے تو یہ محبت اس حد تک نباہی ہے کہ سٹیشنوں کے جالے اور ریلوے ٹریک کے تختے تک اسی حالت میں سنبھال کر رکھے ہیں جس میں گورے انہیں چھوڑ گئے تھے۔

اتنی وسیع اراضی' افرادی قوت اور اجارہ داری کے باوجود یہ محکمہ بدتر خدمت کی ایسی بدترین مثال پیش کرتا ہے کہ کتاب عقل جس طاق پر ہو وہیں دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ بہت مدت کے بعد گزشتہ دنوں تین چار مرتبہ لاہور/ راولپنڈی والی ریل کار میں سفر کا تجربہ ہوا۔ بتایا گیا تھا کہ یہ اس وقت پاکستان ریلوے کی سب سے مستعد' مقبول اور معیاری ٹرین ہے جو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہونے کے ساتھ ساتھ مسافروں کو سفر کی ایسی سہولتیں فراہم کرتی ہے کہ وہ عش عش اور واہ واہ کرتے رہ جائیں۔ یہ بیان کوئی اتنا غلط بھی نہیں کیونکہ املا کی تھوڑی سی تبدیلی کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو لاہور سے پنڈی تک سارا راستہ ائیر کنڈیشنڈ خراب ہونے کی وجہ سے ہم نے بچشم خود لوگوں کو غش غش کھاتے دیکھا اور آہ آہ کرتے سنا ہے۔

سہولیات کا یہ عالم ہے کہ باتھ روم کے اندر جانا تو بڑی ہمت کی بات ہے' اس کے نزدیک سے گزرنا بھی ایک مہم سے کم نہیں' خصوصاً ائیر کنڈیشنر کی خرابی کے باعث جب مجبور ہو کر سانس لینے اور تنور کی حدت کو کم کرنے کے لیے دروازہ کھولا جاتا تو پورے ڈبے میں بدبو کا ایک طوفان سا در آتا تھا۔ چند برس قبل ریلوے والے ٹکٹ کے اندر ہی ناشتے یا چائے وغیرہ کے لیے ایک مخصوص رقم چارج کر لیا کرتے تھے جس سے کم از کم اتنا ہوتا تھا کہ پانچ گھنٹے کے سفر میں کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو مل جاتا تھا جو یقیناً آج کل سپلائی کی جانے والی ''اشیاء'' سے بہت بہتر تھے۔ متعلقہ سٹاف ٹرین چلتے ہی مسافروں کے سر پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اصرار کرتے ہے کہ اگر چائے پینی ہے تو ابھی آرڈر دے دیں اور فوراً پی لیں کیونکہ اس کے بعد آئندہ چار گھنٹے تک یہ سہولت فراہم نہیں کی جا سکے گی' سو ہوتا یہ ہے کہ جو چائے پیتے ہیں' وہ بھی پچھتاتے ہیں اور جو نہیں پیتے وہ بھی...... ریل کار کے ساتھ جو باقی ڈبے لگائے جاتے ہیں ان کا

حال تو اللہ بہتر جانتا ہے مگر جو دو ایئر کنڈیشنڈ بوگیاں لگتی ہیں' ان کی حالت (سوائے ایک سرخ پوشش والی بوگی کے ...... کہ اس میں باوجود کوشش کے ہمیں کبھی سیٹ نہیں مل سکی۔) کچھ ایسی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں بننے والی انگریزی فلموں کی ریلیں ان سے کئی گنا اچھی نظر آتی ہیں' انجن اگرچہ اب وہ کالے رنگ کے چھک چھک شاں شاں کرنے والے نہیں لیکن جہاں تک کارکردگی کا تعلق ہے' ان میں سے اکثر اپنی ریٹائرمنٹ کی معینہ عمر کب کی ختم کر چکے ہیں اور ان کی کارکردگی بالکل ویسی ہی ہے جیسی سرکاری دفتروں میں کنٹریکٹ پر کام کرنے والے بزرگ افسران کی ہوتی ہے کہ اکثر کو کنٹریکٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس دفتر میں تھے اور وہاں کیا کر رہے تھے! کوئلے اور بھاپ سے چلنے والے ان پرانے انجنوں کے زمانے کا ایک واقعہ نما لطفیہ ہے کہ ایک صاحب دوستوں کی محفل میں پہنچے تو ان کے ہونٹوں پر ایک دوائی نما کریم بری طرح تھپی (لگی) ہوئی تھی' ماجرا پوچھا تو بولے:

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اتنی مہنگی ٹکٹ اور فخر سے پیش کی جانے والی ریل گاڑی کے مسافروں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے تو سستی ٹکٹ والے عوامی ڈبوں میں خلق خدا کا کیا حشر ہوتا ہوگا؟

ریلوے بکنگ پر جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ آئندہ کئی کئی دن کی بکنگ ہو چکی ہے' ٹرینوں میں مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوتے ہیں' اس کے باوجود ہر سال بجٹ کے دنوں میں یہی سننے میں آتا ہے کہ ریلوے کا محکمہ مسلسل خسارے میں جا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر نئے انجن اور بوگیاں نہیں خریدی جا رہیں' جو موجودہ ہیں' ان کی حالت یتیم اور بے آسرا بچوں جیسی ہے' ٹکٹوں کی قیمتوں میں وقفے وقفے سے اضافہ ہو رہا ہے اور ریلوے ٹریکس عدم توجہ اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے موت کے گولے بنتے جا رہے ہیں تو پھر اس مسلسل خسارے کا سبب کیا ہے!!

کس رات کی آنکھوں میں پیمانِ سحر ہوگا!
یہ خواب جو کونپل ہے کس رت میں شجر ہوگا؟

◆◆◆

دھند اور جگنو

کہا جاتا ہے کہ گزشتہ چالیس برس میں دھند کا اتنا طویل دورانیہ دیکھنے میں نہیں آیا جیسا کہ اس دسمبر میں رہا ہے۔ اس کی وجہ موسمی حالات کی وہ تبدیلیاں بتائی جاتی ہیں جنہوں نے پورے کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اب اس دھند کا پاکستان کے موجودہ حالات سے کیا تعلق ہے اور اس کے بننے کی وجوہات اور چھٹنے کے امکانات کیا ہیں؟ یہ اپنی جگہ پر ایک الگ بحث ہے جس میں فی الوقت ہم پڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ یہ بیان کسی ایک کالم میں سمٹنے کا متحمل نہیں۔

اس وقت تو ہم اس سچ مچ کی دھند کی بات کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے راتوں کو گاڑی کی فل لائٹس کی باوجود پانچ قدم آگے تک کچھ دکھائی نہیں دیتا اور صبح کے وقت' دوپہر بلکہ دوپہر کے بعد تک دھند لگے کے باعث ہوائی جہاز پرواز نہیں کرسکتے۔ گزشتہ دنوں ہمیں ''دھند'' کی اسی غیر معمولی شدت کے سبب بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں تک ان مشکلات کے آفات سماوی والے حصے کا تعلق ہے وہ تو ایک ایسی مجبوری ہے جس کے آگے ہم آپ اور پی آئی اے کے کارپردازان سب کے سب' مساوی طور پر بے بس ہیں لیکن جہاں تک اس پریشانی میں اضافے کے انسانی اسباب کا تعلق ہے ان پر یقیناً بات ہونی چاہیے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے دھند کے باعث جہازوں کی روانگی اور آمد میں تاخیر اور کچھ پروازوں کا سرے سے کینسل ہوجانا سمجھ میں آتا ہے۔ بلاشبہ پی آئی اے کا عملہ اور گراونڈ سٹاف اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے تھے لیکن مسافروں کی سہولت (یعنی تکلیف میں کمی) اور بروقت معلومات کی رسائی' دو ایسے ضروری کام ہیں جنہیں خوش اسلوبی سے سے ادا کرنا ہر ائیر لائن کے بنیادی فرائض میں شامل ہے اور ظاہر ہے'' بے مثال لوگ لاجواب پرواز'' کا نعرہ لگانے والوں پر یہ ذمہ داری کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہمیں ۲۶ دسمبر کو پی کے ۳۱۲ پر اسلام آباد سے کراچی روانہ ہونا تھا جہاں شام چار بجے مرحومہ پروین شاکر کی تیسری برسی کی تقریب منعقد ہو رہی تھی ہوٹل سے صبح آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک فلائٹ انکوائری نمبر ۱۱۴ پر مسلسل فون گھمایا مگر ہر بار آگے سے انگیج کی گھنٹی ہی سنائی دی۔ ۱۷ اسے پتہ کیا کہ کوئی اور نمبر ہو تو بتادیں' انہوں نے دو تین نمبر دیے مگر وہاں سے کسی نے فون اٹھانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ ہم نے اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کیا کہ کم از کم پندرہ مختلف ممالک میں فلائٹ انکوائری کے سلسلے میں ہمارا زیادہ سے زیادہ تاخیر کا دورانیہ کیا تھا تو جواب ڈیڑھ منٹ نکلا۔ ہم نے سوچا کہ اس پرواز پر بہت

سے ملکی اور غیر ملکی مسافر ایسے بھی سفر کر رہے ہوں گے جنہیں آگے منسلکہ پروازوں کے ذریعے اپنی اپنی منزل مقصود پر پہنچنا ہے۔ اگر ہماری تشویش کا یہ عالم ہے تو ان بے چاروں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ خیر ہم نے اللہ کا نام لے کر ائیر پورٹ جانے کی ٹھانی اور تقریباً سوا نو بجے وہاں پہنچ گئے معلوم ہوا کہ ہماری فلائٹ تین گھنٹے لیٹ ہے اور اب ایک بجے جائے گی۔ ڈیپارچر لاؤنج مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا کہ پانچ چھ پروازوں کے مسافر وہاں جمع تھے جن میں سے کچھ لوگ گزشتہ رات سے وہاں بیٹھے تھے۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ مژدہ سنایا گیا کہ اب روشنی اس قابل ہوگئی ہے کہ جہاز آ جا سکیں اور اس کے بعد بیچ میں دو تین جہاز اڑے بھی! جن میں سے ایک میں ہمارے ساتھی شاعر شہزاد احمد لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہمارے قریب ایک بہت بزرگ جوڑا بڑی پریشانی حالی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ خاتون ویل چیئر پر تھیں اور بزرگوار ان پڑھ ہونے کے باعث ہر آنے جانے والے کو بورڈنگ کارڈ دکھا کر پوچھ رہے تھے کہ ان کا جہاز کب جائے گا؟ معلوم ہوا کہ وہ پی کے ۳۱۹ کے مسافر ہیں جس کی فلائٹ گزشتہ رات کینسل ہوگئی تھی اور اب انہیں اس بہلاوے پر وہاں روکا گیا تھا کہ کراچی سے جمبو اور ائیر بس کی بڑی پروازیں آ رہی ہیں انہیں کسی میں ایڈ جسٹ کر دیا جائے گا۔ کوئی دو بجے کے قریب بتایا گیا کہ ہماری فلائٹ پونے تین بجے آ رہی ہے اور اسے ساڑھے تین بجے روانہ کر دیا جائے گا۔ ہم نے حساب لگایا تو تقریب کے آخری حصے میں شمولیت کا امکان بن سکتا تھا سو ہم نے اس اطلاع کو غنیمت جانا اور ذہنی طور پر مطمئن سے ہو کر بیٹھ گئے۔ جہاز واقعی پونے تین بجے آ گیا اور الیکٹرانک اطلاع نامے پر روانگی کا وقت بھی ساڑھے تین بجے درج ہو گیا مگر اس کے بعد دو واقعے ہوئے ایک تو پی آئی اے کے عملے کے تین چار لوگ جو وقتاً فوقتاً دکھائی دے رہے تھے ایک دم غائب ہو گئے اور دوسرے پانچ بجے تک پی آئی اے کے مطابق ہماری روانگی کا وقت ساڑھے تین ہی رہا۔ یعنی ان کے حساب سے ہمیں جہاز میں بیٹھے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا اور جہاز کراچی پہنچنے ہی والا تھا۔ لوگوں کا ہجوم ان کی بے چینی اور بے قراری' آگے کی منسلکہ بین الاقوامی پروازوں کے مسافروں کے اندیشوں بھرے چہرے اور ایک ہمہ جہت کی افراتفری میں کسی کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کا جہاز کب چلے گا؟ کیوں نہیں چل رہا' انہیں سیٹ ملے گی یا نہیں اور یہ کہ وہ ان سارے سوالوں کے جواب کہاں سے حاصل کریں؟

لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے جن میں پی آئی اے کو برا بھلا کہنے کا عمل سب سے زیادہ تھا۔ ایک نوجوان پکار پکار کر لوگوں کو بتا رہا تھا کہ اس کی آج رات کراچی میں شادی ہے اور وہ کل رات سے فلائٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ ایک اور صاحب کا خیال تھا کہ عملے کا یہ عدم تعاون پی آئی اے کی اندرونی سیاست کا نتیجہ ہے۔ بعض کے خیال میں اس کا تعلق ایم این اے شاہد خاقان عباسی کی پالیسیوں اور ان کے ردعمل سے تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں والا معاملہ چل رہا تھا مگر امر واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں (یعنی

تین بجے سے پانچ بجے تک) مسافروں سے انتہائی زیادتی روا رکھی گئی۔ پرائیویٹ ائیر لائنوں کے طیارے تیزی سے آ جا رہے تھے مگر پی آئی اے کی فلائٹ کا اعلان سننے کو کان ترس گئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ لاہور پہنچ کر تعلقات عامہ کی انچارج یاسمین ہارون کو یہ ساری کتھا سنائیں گے تا کہ وہ عوام کو درپیش مسائل سے متعلقہ حکام کو آگاہ کر سکیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے چند برس پہلے تک پی آئی اے کا معیار خدمت اس حد تک نہیں گراتھا اور اس کا مسافروں کی دیکھ بھال سے متعلق عملہ کسی نہ کسی حد تک کام کرتا نظر آتا تھا۔ لاہور ائیر پورٹ پر فلائٹ انچارج افتخار ملک کو ہم نے کئی بار اسی طرح کی صورت حال میں ایسے اقدامات کرتے دیکھا ہے جن سے اگرچہ مسافروں کے مسائل سو فیصد حل نہیں ہو سکتے تھے مگر انہیں کم از کم اتنی تسلی ضرور ہو جاتی تھی کہ ائیر لائن والے اپنی سی کوشش کر رہے ہیں لیکن اب تو سرے سے متعلقہ سٹاف جادو کی ٹوپی پہن لیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ پریشان حال مسافروں میں سے کچھ لوگ تلخ کلامی بھی کرتے ہیں اور بعض کا رویہ ضرورت سے زیادہ جارحانہ ہوتا ہے لیکن ان کا سامنا نہ کرنے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ باقی کے سینکڑوں مسافروں کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور خاص طور پر وہ لوگ جو پڑھے لکھے یا ہوائی سفر کے عادی نہیں ان کی خون پسینے کی کمائی سے خریدی ہوئی ٹکٹوں کی اس طرح سے توہین کی جائے!

خدا کرے کہ ۱۹۹۸ء کے آغاز کے ساتھ پی آئی اے سمیت ہمارے باقی ادارے بھی اپنا قبلہ درست کر لیں کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ وقت اور قریب آ جائے گا جب معاملات ہاتھوں سے بالکل ہی نکل جاتے ہیں۔

◆◆◆

عام آدمی متاثر نہیں ہو گا!

آج کے اخبار میں وزیر خزانہ سرتاج عزیز صاحب نے روپے کی قیمت میں کمی کی جو وجوہات بیان کی ہیں اور جس جس طرح سے عوام کو یقین دلایا ہے کہ حکومت کے اس اقدام سے ان کی زندگی کے کسی شعبے پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑے گا' انہیں پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وزیر موصوف عوام کو بے وقوف سمجھتے ہیں یا انہیں بے وقوف بنا رہے ہیں!!

کچھ اور کہنے سے پہلے ان کے متعلقہ بیان کی کچھ سرخیاں ملاحظہ کیجئے!

۱۔ بجلی' ڈیزل' مٹی کے تیل کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

۲۔ گندم کی قیمت اور ٹرانسپورٹ کے کرائے نہیں بڑھیں گے۔

۳۔ مہنگائی روکنے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔

۴۔ پٹرول کی قیمت میں صرف ۵ فیصد اضافہ کیا ہے۔

۵۔ برآمدات میں اضافہ ہو گا۔

۶۔ جرمنی' جاپان اور فرانس کی کرنسیاں روپے کے مقابلے میں گری ہیں۔

۷۔ اقدامات کے مثبت نتائج نکلے ہیں۔ کشارہ میں ۱۸ فیصد کمی ہوئی۔

۸۔ سٹاک مارکیٹ میں تیزی آئی اور کھاد کی پیداوار بڑھی۔

۹۔ کھانے پینے کی اشیاء مہنگی نہیں ہوں گی۔

۱۰۔ دفاعی بجٹ متاثر نہیں ہو گا۔

۱۱۔ تنخواہ دار طبقے پر بھی اثر نہیں پڑے گا۔

۱۲۔ درآمدی اشیاء مہنگی ہونے سے مقامی اشیاء زیادہ فروخت ہوں گی۔

۱۳۔ روپے کی قیمت میں کمی نہیں' ایڈجسٹمنٹ کی ہے۔

ویسے تو سرتاج عزیز (جنہیں میاں نواز شریف کی گزشتہ حکومت کے دنوں میں سرچارج عزیز کا نام دیا گیا تھا) صاحب کے ان

بیانات پر سردھنا اور پیٹا ہی جاسکتا ہے کہ اس کے علاوہ ہر ردعمل میں نقص امن کا اندیشہ ہے۔ لیکن گزشتہ ۲۴ گھنٹوں میں اس خبر کا جو اثر معاشرے کے مختلف شعبوں پر ہوا ہے اس کی کچھ جھلکیاں پیش خدمت ہیں۔ انہیں پڑھیے اور پھر سوچیے کہ ''عوام'' سے جناب سر تاج عزیز کیا مراد لیتے ہیں!

ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ان کا اشارہ فیصل آباد سے نکلنے والے مرحوم خلیق قریشی کے اخبار ''عوام'' کی طرف ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتے چلیں کہ فیصل آباد سے ہی ایک زمانے میں ایک لوکل اخبار ''غریب'' کے نام سے نکلا کرتا تھا (ممکن ہے آج کل بھی شائع ہوتا ہو!) سو اس معاملے کو زیادہ گہرائی میں جا کر سمجھنے کے لیے آپ ''عوام'' کے ساتھ ''غریب'' کو بھی شامل سمجھیں۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ عوام اس ٹھوکر سے کیسے متاثر نہیں ہوں گے! یہ ساری سرخیاں اخبار کے اسی صفحے سے لی گئی ہیں جس پر سرتاج عزیز صاحب کا مذکورہ بالا بیان شائع ہوا ہے۔

۱۔ ریگولر اور سپر پٹرول کی قیمتوں میں ۳ فیصد اضافہ

۲۔ ڈالر چالیس سے سوا چوالیس روپے کا ہوگیا

۳۔ روپے کی قیمت آئی ایم ایف سے قرض لینے کے لیے گھٹائی گئی

۴۔ اس اقدام سے پوری معیشت پر منفی اثر پڑے گا۔

۵۔ دفاعی بجٹ میں ۱۳ سے ۱۵ ارب روپے کی کمی ہوگی۔

۶۔ زمیندار اور جاگیردار لابی کو فائدہ

۷۔ روپے کی قیمت میں اس کمی سے افراط زر ۲۰ فیصد سے بھی بڑھے گا۔

۸۔ تنخواہ دار طبقہ بری طرح متاثر ہوگا' تنخواہوں میں عملاً کمی واقع ہوگی۔

۹۔ قرضوں کی ادائیگی اور تجارتی خسارہ کی مد میں ۳۰ ارب روپے فاضل ادا کرنے پڑیں گے۔

۱۰۔ نواز دور میں مجموعی طور پر ۵۷ء۹ فیصد کمی ہو چکی ہے۔

۱۱۔ بجلی کے ریٹ بھی بڑھیں گے۔

۱۲۔ روپیہ بونا اور ڈالر جن بن گیا۔

۱۳۔ مہنگائی کا نیا ریلا شروع۔ گھی اور سونے کی قیمتوں میں فوری اضافہ۔

۱۴۔ مارکیٹ سے کئی اشیائے صرف غائب' قیمتوں میں ۲۰ سے ۴۰ فیصد اضافے کا امکان۔
۱۵۔ ادویات کی قیمتیں' پی آئی اے' ریلوے اور عام ٹرانسپورٹ کے کرائے بھی بڑھیں گے۔
ہمیں اندازہ ہے کہ کوئی بھی حکومت ایسے اقدامات سے حتی الامکان گریز کرتی ہے جن سے عوام میں بے چینی پھیلے اور اس کے ووٹ بینک کے ٹوٹنے یا اس میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہو سو یہ کہنا کہ میاں نواز شریف اور سرتاج عزیز صاحبان نے یہ اعلان اور فیصلہ کرنے سے پہلے اس کے متوقع نتائج و عواقب پر غور نہیں کیا ہوگا ایک فضول' بے معنی اور ناممکن سی بات ہے یقیناً ہماری معیشت اس سطح پر پہنچ چکی ہوگی جہاں اسے سنجالا دینے کے لیے یہ ناخوشگوار فیصلہ ناگزیر ہو چکا ہوگا جیسے کسی زخم کے ناسور بن جانے پر خواہی نخواہی اپنے ہی جسم کے کسی حصے کو کٹوانے کا فیصلہ کرنا پڑ جاتا ہے لیکن اصلی سوال یہ ہے کہ یہ زخم کیوں اور کیسے لگا! اور ناسور بننے سے پہلے اس کا علاج کیوں نہیں کیا گیا! ہر حکومت تمام الزامات کا بوجھ پچھلی حکومت کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ''پچھلی حکومت'' کو ہٹایا ہی کیوں جاتا ہے اگر آخری نتیجے میں عوام کو ذلت' غربت' مہنگائی' بیروزگاری اور مایوسی ہی کا سامنا کرنا ہے تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ان تحفوں کے پیش کرنے والے کون ہیں؟
عوام نے مسلم لیگ اور میاں نواز شریف کو ووٹ پچھلی حکومت کے محاسبے کی کارروائیاں سننے کے لیے نہیں بلکہ اپنے مسائل کے حل کے لیے دیئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جاگیرداروں اور وڈیروں کے مقابلے میں یہ ''تاجر لوگ'' زیادہ خلوص' مہارت اور معاملہ فہمی سے عوامی ترقی پر زور دیں گے سوسئس بینکوں کے اکاؤنٹس کا حساب ضرور کیجئے اور سابقہ حکمرانوں کے عوام دشمن کارناموں سے بھی قوم کو بے شک آگاہ کیجئے لیکن آپ کے وہ عوام (جو بقول آپ کے نمائندوں کے' ہر قسم کے خدشوں اور تکلیفوں سے محفوظ' بہت مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہے ہیں) جنہوں نے آپ کو ووٹ دیا (یا نہیں بھی دیا تب بھی) آپ سے اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ چلیے مکمل حل نہ سہی اس کی طرف کوئی پیش رفت ہی ہو جائے' کوئی امید کی ایسی کرن ہی مل جائے جسے پھیلا کر چاندنی بنا لیا جائے۔
عوام کسی بھی حکومت سے عزت نفس' تحفظ' یکساں اور مساوی انصاف اور صحت مندانہ اور عوام دوست معاشی پالیسیوں کے سوا اور کچھ نہیں مانگتے۔ انہیں ان کے یہ حقوق لوٹا دیجئے' یہ آپ کو وہ سب کچھ دیں گے جس کی آپ ان سے توقع کرتے ہیں' اصل مسئلہ روپے کی قیمت میں کمی یا ڈالر کی قدر میں اضافے کا نہیں ایک ایسے معاشرے کے قیام کا ہے جس کی بنیاد معاشی انصاف اور سماجی بھلائی پر ہو۔
موجودہ حکومت کی نیت کی صفائی اور صلح پر ہمارے سمیت ملک کی بیشتر آبادی ابھی تک گمان اور خوش گمانی کے دائروں سے نکل کر

بدگمانی اور مایوسی کے دشت بے کنار میں داخل نہیں ہوئی لیکن ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ بہت تیزی سے سکڑتا جارہا ہے اور اگر معاملات کے بگڑنے کی اس رفتار پر قابو نہ پایا گیا تو شائد ہمیں ایک بار پھر تاریخ یہ بتانے پر مجبور ہو جائے کہ جب عام آدمی کے متاثر ہونے سے مسلسل بے خبری کا اظہار کیا جائے تو وہ کیا کرتا ہے!

◆◆◆

علاج اہل حسد

سرشت انسانی' کہنے کو تو گنتی کے چند جذبوں کا مجموعہ ہے لیکن غور کیجئے تو ہر انسان کے اندران کی کیمسٹری مختلف ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے اربوں انسانوں میں سے دو افراد کے نشان انگشت کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ شاید اسی طرح یہ جذبے بھی اپنی ایک الگ انفرادیت اور شناخت رکھتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں حسد ایک ایسا جذبہ ہے جو آدم کی پہلی نسل میں ہی قابیل کی صورت میں اپنا ظہور کرتا دکھائی دیتا ہے۔

شیخ سعدی نے حکیم لقمان کے حوالے سے اسے ایک لاعلاج مرض قرار دیا تھا مگر پیر و مرشد اسد اللہ غالب اس مکمل تاریکی میں روشنی کی ایک کرن دیکھے اور دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں' فرماتے ہیں۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے' گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شائد کثرت نظارا سے وا ہو!

اگرچہ اس ''شائد'' میں استفہام انکاری کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے لیکن انگریزی محاورے کے مطابق غالب اس امکان کو یکسر مسترد یعنی Write Off کرنے کو تیار نہیں' جب کبھی زیادہ گھبرا جاتے ہیں تو اپنی جدت طبعی اور معنی آفرینی کے فطری وصف کے مدد سے اس دھوپ میں ایک انوکھی چھتری تان دیتے ہیں یعنی

حسد' سزائے کمال سخن ہے' کیا کیجئے
ستم' بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے!

لطف کی بات یہ ہے کہ اردو شاعری میں جس دوسرے شاعر نے حسد کے مضمون پر بھرپور توجہ کی ہے' وہ اپنے آپ کو غالب شکن کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا اور اپنے بارے میں یوں گویا ہوتا تھا کہ

میں پیمبر نہیں' یگانہ سہی
اس سے کیا کسر شان میں آئی!

تو یگانہ حسد کے موضوع پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

علاج اہل حسدؔ زہر خند مردانہ
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

دراصل یہ سارے شعر ہمیں اس مہم کے حوالے سے یاد آئے ہیں جو آج کل عمران خان کے حوالے سے ایک دم چل پڑی ہے۔ ہمارے خیال میں جب بھی کسی زوال آمادہ معاشرے میں کوئی غیر معمولی صلاحیتوں والا شخص پیدا ہو جائے تو وہی منظر سامنے آتا ہے جو بونوں کی بستی میں گلیور کے آنے پر رونما ہوا تھا۔ وہ لوگ جنہیں رستے میں پڑی ہوئی کوئی اینٹ اٹھا کر ایک طرف رکھنے کی توفیق نہیں ہوتی' ایدھی اور عمران سے اکاؤنٹس کا حساب اس طنطنے اور ڈھٹائی سے مانگتے ہیں کہ ناطقہ سچ مچ سر بگریباں ہو جاتا ہے۔ قدرے معتدل مزاج لوگوں کا خیال ہے کہ جب کوئی شخص قومی سطح کی شخصیت بن جائے تو معاشرے کو اس کا مکمل ایکسرے کرنے کا حق پہنچتا ہے' سو جب کوئی وکیل عدالت میں یا سرفراز نواز' ملک قاسم کے حضور یا کوئی اور زید بکر' پریس میں اس بات کو اچھالتا ہے تو اس پر کسی کو معترض یا پریشان نہیں ہونا چاہیے بلکہ عمران خان کو چاہیے کہ اپنی تمام آمدنی' خاندانی جائیداد' ذرائع آمدنی اور اثاثے کھول کے لوگوں کے سامنے رکھ دے تاکہ مہربانوں کی انا کی تسکین اور شکوک کا ازالہ ہو سکے۔ ہسپتال کے سلسلے میں ہونے والی تمام آمدنی اور خرچ کا پائی پائی کا حساب ان کے حضور پیش کر دیا جائے تاکہ ان کروڑوں روپوں کی نشاندہی ہو سکے جو ان کے بقول عمران خان کھا گیا ہے یا گلبرگ کے کسی شاپنگ پلازہ کی تعمیر میں خرچ کر رہا ہے۔

ہماری سمجھ میں ان معترضین کی باتوں کی طرح زکوٰۃ کے اشتہارات کی بندش' ٹی وی کوریج اور سرکاری میڈیا پر عمران خان کی تصویر' آواز اور بیانات کے بائیکاٹ کا مسئلہ بھی نہیں آیا یہ بے معنی اور انتہائی تکلیف دہ روش کیسے آغاز ہوئی؟ اس کے محرک کون ہیں؟ اور متعلقہ سرکاری حلقے اپنی پوزیشن کو کیوں مشکوک سے مشکوک تر بناتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ سوالات بھی فوری وضاحت اور جواب کے طالب ہیں۔ شیخ سعدی نے ایک حکایت میں لکھا ہے کہ اگر بادشاہ ایک مرغی کا انڈہ ناجائز طور پر حاصل کرے تو اس کے درباری اور عمائدین سیکڑوں مرغوں کو سیخوں میں پرو دیتے ہیں' سو ممکن ہے اصل بات ایک انڈے کے برابر ہی ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا نتارا کون کرے گا اور کب کرے گا؟ کیونکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ مرغے روسٹ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ایک دوست کے بقول شوکت خانم میموریل ہسپتال کی طرف رستوں پر جو نشانی کے بورڈ وغیرہ نصب تھے' پنجاب پولیس کے اہلکار انہیں توڑتے یا ہٹاتے دیکھے گئے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے افسوسناک اقدام ٹی وی خبرنامے کی کھیلوں کی خبروں کے ٹیلپ سے عمران خان کی تصویر کا غائب کرنا ہے

اور یہ کام چونکہ حال ہی میں ہوا ہے' اس لیے یقیناً اس کی تفتیش کے لیے انکوائری کمیشن نہیں بٹھانا پڑے گا' کیا کوئی اللہ کا بندہ اس بدذوقی کی کوئی وجہ بتا سکتا ہے؟

ان سب باتوں سے ہمارا مقصد عمران خان نامی ایک شخص کا دفاع یا حمایت نہیں بلکہ اس اقداری افلاس کے شکار معاشرے کی بچی کچھی آبرو کا تحفظ ہے کہ چند بیمار ذہن اور حاسد افراد کی تنگ نظری کی یہ تشہیر اور حکومتی اداروں پر ان کی اثر اندازی ہمیں اخلاقی طور پر مزید کمزور کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گی۔ حسد کی آگ اپنے ایندھن کی تلاش میں ہمارے چاروں طرف شعلے بکھیرتی پھر رہی ہے' یہ اس کی مجبوری ہے' بالکل اسی طرح جیسے ایک ویگن کے پیچھے لکھا تھا کہ

''توں تے ہولی چل' ساڈی تے مجبوری اے''

(ترجمہ:......... تم تو آہستہ چلو' ہم تو تیز چلنے پر مجبور ہیں)

کھیت' کھلیان' خرمن' گھر بار اور وجود تو ہمارے خطرے میں ہیں۔ سو مسئلہ عمران شوکت میموریل ہسپتال کے پچپن کروڑ یا زکوٰۃ کے پیسوں اور ٹی وی پر ان سے متعلق اشتہارات کا نہیں' مسئلہ اس رویئے کا ہے جو اس کی آڑ میں ہمیں اخلاقی اور روحانی طور پر غریب سے غریب تر کر رہا ہے۔

حکومت بے نظیر کی ہو یا نواز شریف کی' یا کسی اور کی' اگر اس میں اتنا اعتماد نہیں کہ وہ ایک غیر سیاسی شخصیت کی عوامی مقبولیت کا سامنا کر سکے تو اسے اتنا ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ''بونے اپنے اعضاء کے بڑے ہونے کی تمنا رکھتے ہیں' مگر اپنے دماغ کے حجم سے وہ پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں۔''

◆◆◆

اگلے وقتوں کے لوگ

انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ Age is to be Respected یعنی بڑوں کی عزت کرنی چاہیے ہمیں یقین ہے کہ دنیا کی ہر زبان اور تہذیب میں یہ یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات ضرور ہوگی کہ اس کا تعلق ان عالمی حقیقتوں سے ہے جو ابن آدم کا اجتماعی سرمایہ اور ورثہ ہیں۔ فارسی میں یہی بات ذرا بدلے ہوئے انداز میں ''خطائے بزرگان گرفتن خطا است'' کی صورت میں کہی گئی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے اصول سمجھا جائے یا رویہ۔ یعنی اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ بزرگوں کی کہی ہوئی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینا اور اسے بلا چون و چرا تسلیم کرنا چاہیے یا بالفاظ دیگر مکھی پر مکھی مارتے رہنا چاہیے تو اس کے بہت سے منفی اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ انسانی ذہن کی ساری ترقی اور ارتقاء کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے اور یوں ایک ایسی صورتحال پیدا ہو جائے گی جس میں کسی قسم کی معیاری یا مقداری تبدیلی کا امکان معدوم ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ نہ تو فطرت کا منشا ہے اور نہ ہی عقل سلیم اسے تسیم کرتی ہے۔ انسانی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر دور میں نئے ذہن نے پرانی سوچ کے سامنے اپنے شکوک اور اعتراضات رکھے ہیں اور رد و بدل کا وہ عمل جاری و ساری رہا ہے جسے کارل مارکس کے حوالے سے جدلیات کا نام دیا گیا اور جس کی وجہ سے انسانی زندگی کی یہ ساری ترقی ممکن ہوئی ہے اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ بزرگی کا تعلق صرف جسمانی عمر سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل حوالہ ذہنی عمر اور بلوغت سے ہے مثال کے طور پر گدھا اگر بوڑھا ہو جائے تب بھی گدھا ہی رہتا ہے۔

کسی نے کہا تھا کہ چالیس کی دہائی انسان کی جوانی کا بڑھاپا ہوتی ہے اور پچاس کی دہائی کو اس کے بڑھاپے کی جوانی کہا جا سکتا ہے اسی حوالے سے ایک بڑی مزیدار لطیفہ نما حکایت بھی ہے کہ ازل میں جب عمریں تقسیم ہونے لگیں تو تمام مخلوقات کو چالیس چالیس سال کی زندگی دی گئی۔ انسان نے متعلقہ فرشتے سے اعتراض کیا کہ میں اشرف المخلوقات ہوں اور آپ نے گدھے کتے اور الو کو میرے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ فرشتے نے جواب دیا کہ میں تو حکم کا غلام ہوں اپیل کرنی ہے تو اوپر جا کر کرو۔ انسان نے یہ رسک لینے کی بجائے اپنی عقل پر زور دیا اور براہ راست گدھے، کتے اور الو سے مذاکرت کیے کہ وہ اتنی لمبی عمر لے کر کیا کریں گے کہ آخر انہوں نے بالترتیب بھونکنا' بوجھ اٹھانا اور بے معنی قسم کا غور و فکر ہی تو کرنا ہے۔ تینوں جانوروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور انہوں نے رضا کارانہ

طور پر اپنی عمروں کے بیس بیس سال انسان کو دے دیئے۔

چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ انسان پہلے چالیس سال تو اپنے حصلے کے گزارتا ہے' اس کے بعد گدھے کی طرح بیس برس خانہ داری کا بوجھ اٹھاتا ہے اس کے بعد کے بیس برس کتے کی طرح ہر بات پر بھونکتا رہتا ہے اور آخر میں آلو کے بیس برس گزارنا شروع کر دیتا ہے۔

سفید بالوں والے سر کو دانشمندی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے تجربے' مشاہدے' سوجھ بوجھ اور وقت فیصلہ میں اضافہ اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ طبیعت کے ہیجان اور جذباتی تموجات میں کمی کے باعث اس کی بصیرت بڑھتی ہے۔ وہ زیادہ دور تک دیکھ سکتا ہے اور اس کے فیصلوں میں توازن کا عنصر زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن بات پھر وہیں آکر رکتی ہے کہ یہ بات عمومی انداز فکر کی حد تک تو اثر اور افادیت رکھتی ہے مگر ہم اسے اصول کا درجہ نہیں دے سکتے اور اگر ہم ایسا کریں گے تو پھر ہمیں قدم قدم پر نوابزادہ نصراللہ خان جیسے بزرگوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور وضع داروں کی ترکی ٹوپیوں اور منقش حقوں کے احترام میں ایک ایسی بے عمل' تھکی ہوئی' سال خوردہ اور روز ائد المیعاد قیادت کو تسلیم کرنا ہوگا جو اس تیزی سے بدلتی ہوئی ظالم' منہ زور اور سفاک دنیا کے چیلنج کا سامنا شطرنج کے ان کھلاڑیوں کی طرح کرتی ہے جن کے کھیل کا مقصد محض وقت گزاری ہے۔

ہمیں ذاتی طور پر نوابزادہ صاحب یا ان کے طرز سیاست سے کوئی شکایت یا عداوت نہیں کہ وہ وہی کچھ کر رہے ہیں جس کے وہ اہل ہیں گلہ تو ہمیں اپنے ان معاشرتی رویوں سے ہے جس کی وجہ سے یہ بزرگ حضرات ہمارے لیڈر اور رہنما بنے بیٹھے ہیں۔ یہ ساری نسل جس کا نوابزادہ نصراللہ صاحب ایک استعارہ ہیں بزعم خود اس ملک کی تاریخ' جغرافیے اور جمہوریت کی محافظ بنی بیٹھی ہے جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جتنا خطرہ ان تینوں کو ہمارے ان خود ساختہ محسنوں سے ہے اتنا شاید امریکہ اور ہندوستان سے بھی نہیں کہ ان بزرگوں نے اپنے تمام تر سیاسی کیریئر میں جہاد کے نام پر مفاد اور جمہوریت کے نام پر انتشار کو ہوا دینے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ ان کی بصیرت اور سیاست کی اوقات یہ ہے کہ ان کی سیاسی جماعتوں کے عہدیدار تک پورے نہیں ہوتے' انہیں تانگے کی سواریاں بھی کہا جاتا ہے لیکن ہمارے اخبارات اور سیاسی ایوان ان کے فرمودات کو ایسی ایسی شہ سرخیوں کے ساتھ اتنے تواتر سے شائع کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بہت بڑے اہل بصیرت اور صاحبان عمل ہوں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے آصف علی زرداری کے گھوڑوں کا جنہوں نے پیر پگاڑا کے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور یوں اب ان بزرگوار کے پاس صرف پیش گوئیاں باقی رہ گئی ہیں جن کے بل پر وہ سیاست اور خبروں میں زندہ ہیں۔ ہمارے دیگر بزرگ سیاستدانوں کا حال بھی کم و بیش انہی دو بزرگوں جیسا ہے کہ ان کی سیاست میں اور کچھ ہو تو ہو فیض دور

دور تک نہیں ہے۔

دنیا کے بازار میں چلنے والی کرنسی کب کی بدل چکی ہے مگر یہ لوگ ابھی تک متروک شدہ کرنسی کے سکے اپنی جیبوں میں بھرے انہیں کھنکھناتے پھر رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ان بزرگوں کو آرام کرنے دیا جائے کہ پاکستان کی حفاظت کرتے کرتے جہاں تک یہ اس ملک کو لے آئے ہیں وہاں سے واپس مڑنے اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونے میں قوم کو کم و بیش ان ہی جتنی زندگی درکار ہوگی۔

چلتے چلتے محترم نوابزادہ صاحب کا ایک تاریخی جملہ سن لیجئے۔ چند دن قبل ٹی وی پر الیکشن آور کے دوران جب ان سے سوال کیا گیا کہ ان کی پارٹی موجودہ انتخابات میں کتنے امیدوار کھڑی کر رہی ہے؟ تو آپ نے جواب دیا۔

''ابھی میں نے پارٹی آفس سے معلوم نہیں کیا اس لیے صحیح تعداد نہیں بتا سکتا۔''

◆◆◆

دو اچھی خبریں

تعلیم کے حوالے سے ہماری مختلف حکومتوں کی بے حسی اور بے اعتنائی کے ذکر سے تو ہماری پوری قومی تاریخ بھری پڑی ہے مگر گزشتہ چند دنوں میں دو باتیں ایسی ہوئی ہیں جن سے دل کو کچھ ڈھارس سی ہوئی ہے کہ شائد سچ مچ کچھ ہونے والا ہے! شائد ہماری قومی ترجیحات میں تعلیم کو اگر اپنا صحیح مقام نہیں تو کچھ نہ کچھ مقام ضرور ملنے والا ہے اور ہماری یونیورسٹیاں طلبہ اور اساتذہ سیاست اور امتحانات اور ان کے نتائج میں ہونے والی تاخیر در تاخیر کے چکر سے نکل کر اپنے اصلی منصب یعنی ریسرچ، علم کے فروغ اور اہل علم کی حرمت اور عزت افزائی کی طرف متواجہ اور راغب ہو رہی ہیں۔

ہماری اس خوش گمانی کا سبب، قومی تعلیمی کنونشن میں وزیراعظم کی دلچسپی اور تعلیم کے ساتھ اپنی حکومت کی کمٹ منٹ کا وہ اعلان ہے جس میں انہوں نے اپنے سمیت چاروں صوبائی حکومتوں کو نتائج کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور کراچی یونیورسٹی کی طرف سے اعلان کردہ ڈی لٹ کی وہ ڈگری ہے جو جمیل الدین عالی کو ان کی عمر بھر کی علمی اور ادبی خدمات کے صلے میں دی جا رہی ہے۔

جہاں تک تعلیم کے برے میں موثر قومی پالیسی اور اس کی ترجیحی حیثیت کے تعین کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو مسلسل نظر انداز ہونے کی وجہ سے سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا تھا۔ مقام شکر ہے کہ اس بار نہ صرف اس پر بہت سنجیدگی سے کام ہو رہا ہے بلکہ اس کا دائرہ بھی حتی الامکان وسیع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میاں نواز شریف کی ذاتی دلچسپی، وزیر تعلیم سید غوث علی شاہ کی سربراہی اور ڈاکٹر صفدر محمود اور ان کی وزارت کے افسران کی بھرپور محنت اور دلچسپی کے باعث اس پالیسی کا جو ڈرافٹ تیار کیا گیا ہے اسے ماہرین تعلیم کے ساتھ ساتھ پوری قوم کے سامنے مشورے، رہنمائی اور تنقید کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ کام آزادی کے فوراً بعد مکمل کر لیا جاتا اور گزشتہ نصف صدی میں قوم اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کے بعد آج اس پوزیشن میں ہوتی کہ ہم اکیسویں صدی میں سینہ تان کر اور دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر داخل ہو سکتے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام الجھی ہوئی ڈور کا ایک گولہ بن چکا ہے اور اس وقت پورے ملک میں بیک وقت کئی کئی نظام اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔

1972ء تک، چند ایک قدیم پبلک سکولوں (ایچی سن کالج، لارنس کالج، برن ہال اور کانونٹس وغیرہ) کو چھوڑ کر پورے ملک میں عام طور پر دو طرح کے سکول تھے، ایک وہ جو مختلف رفاہی انجمنیں اور تعلیمی ٹرسٹ چلا رہے تھے اور دوسرے وہ سرکاری انتظام میں

چل رہے تھے جن میں میڈیم آف انسٹرکشن یعنی ذریعہ تعلیم 95 فیصد کیسز میں اردو زبان تھی' یہ اور بات ہے کہ اس وقت انہیں از راہ تحقیر "اردو میڈیم" نہیں کہا جاتا تھا۔

قومیائے جانے کے بعد باقی شعبوں کی طرح تعلیم بھی طرح طرح کے تجربات' کمٹ منٹ کی کمی' انتظامی بدمعاملگی اور مشن کے بجائے محض ایک پیشہ بن جانے کے باعث آہستہ آہستہ چوں چوں کا مربہ بن گئی اور اس کی حالت اس گھوڑے کی سی ہو گی جو مختلف ترامیم سے گزرتے گزرتے اونٹ کے شکل اختیار کر گیا جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔

حکومت کی انتظامی ناکامی اور قومی ترجیحات میں تعلیم کی اہمیت میں ہونے والی مسلسل کمی کے باعث وہ ایک برا بھلا نظام بھی جو کسی نہ کسی شکل میں چل رہا تھا ختم ہو گیا اور آبادی کے پھیلاؤ اور تعلیم حاصل کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے رسد اور طلب میں ایک خلا پیدا ہونا شروع ہو گیا جس کی وجہ سے پرائیویٹ سیکٹر میں گلی گلی عجیب وغریب ناموں والے انگلش میڈیم سکول کھلنے شروع ہو گئے اور بعض لوگوں نے اسے ایک فائدہ مند بزنس سمجھ کر شہروں اور قصبوں میں اس طرح کے سکولوں کا ایک جال سا بچھا دیا۔ یہ سکول عام طور پر کرائے کی چھوٹی چھوٹے عمارتوں میں بناء جاتے ہیں جن کا دو تہائی سے زیادہ سٹاف' غیر تربیت یافتہ اور یا سے اساتذہ پر مشتمل ہوتا ہے جن کی اپنی تعلیمی اور تدریسی قبلیت بے حد مشکوک ہوتی ہے' عام طور پر ان سکولوں میں سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن میں ایف اے اور بی اے پاس ایسی لڑکیاں بھرتی کی جاتی ہیں جو غربت یا شادی کے انتظار کے باعث گھروں میں بیٹھی ہوتی ہیں اور اس ملازمت کو تھوڑی بہت آمدنی یا وقت گزاری کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتی ہیں۔ اس نوع کے سکولوں میں نہ تو بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اور نہ اس ڈر سے فیل کیا جاتا ہے کہ کہیں ان کے والدین انہیں سکول سے اٹھا نہ لیں' سو عام طور پر ان سکولوں میں بچوں کو 95 فیصد سے زیادہ نمبر دے کر پاس کیا جاتا ہے۔ ایک ایک پوزیشن پر کئی کئی بچے رکھے جاتے ہیں تاکہ ان کے والدین کو نفسیاتی طور پر بلیک میل کیا جا سکے۔ یہ بلیک میلنگ اساتذہ کی بھی ہوتی ہے یعنی انہیں اصل میں معمولی تنخواہیں دینے کے بعد کاغذات میں ان سے بڑی بڑی رقموں پر دستخط کروائے جاتے ہیں۔

دوسری طرح کے سکول بڑی بڑی فیسوں والے وہ نام نہاد اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں جو شہر کے مہنگے علاقوں میں بڑی بڑی کوٹھیاں لے کر قائم کیے جاتے ہیں۔ یہ ادارے عام طور پر اے لیول اور او لیول کے امتحانات کی تیاری کراتے ہیں اور انگلش میڈیم میں تعلیم دے کر بچوں کو ایک ایسے راستے پر ڈالتے ہیں جہاں سے ان کے امیر والدین (جن کا تعلق عام طور پر جاگیردار' صنعت کار' رشوت خور سرکاری افسران' ناجائز ذرائع سے دولت کمانے والے مختلف پروفیشنلز اور ان نودولتیوں سے ہوتا ہے جو معاشرے میں ہونے والی لوٹ مار میں کسی نہ کسی طرح شامل ہو جاتے ہیں) اور متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ اور معاملہ فہم لوگ انہیں اعلیٰ سرکاری یا مختلف نوع کی

خصوصی نوکریوں کی منزل تک پہنچا سکیں۔ ان تین طرح کے سکولوں کی آگے ذیلی شاخیں بھی ہیں اور یوں ایک ہی ملک میں ایک ہی جماعت کے طلبہ مختلف طرح کے کئی نظاموں کے تحت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جن چند دردِ دل رکھنے والے ادیبوں' دانشوروں اور صحافیوں نے اس صورتحال پر مسلسل لکھا ہے ان میں ایک اہم نام جمیل الدین عالی کا بھی ہے۔ ان کے اخباری کالموں' مختلف تحریروں اور روزمرہ کی گفتگو میں تعلیم اور اس سے متعلقہ مسائل (عالمی تناظر اور اعداد و شمار کی مدد کے ساتھ) جس شدت اور تکرار سے دہرائے جاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک پاکستان کے تمام بنیادی مسائل کا تکرار سے دہرائے جاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک پاکستان کے تمام بنیادی مسائل کا حل کسی نہ کسی طرح تعلیم ہی سے منسلک اور رشتہ آرا ہے' سو اب جو انہیں کراچی یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی ہے تو یہ ایک طرح کا اعتراف خدمت اور نشان سپاس تو ہے ہی مگر اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اپنی تمام تر بے ہمتی اور گراوٹ کے باوجود ابھی تک مثبت اور تخلیقی امکانات سے مکمل طور پر خالی نہیں ہوا اور یوں امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ آنے والے چند برسوں میں ہم تعلیم کو اپنے معاشرے میں وہ مقام دلانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جس کے ساتھ ہماری بقا وابستہ اور ترقی وابستہ اور پیوستہ ہے۔

ایک خوشگوار روایت کا آغاز

کسی بیرونی ملک میں ایک پاکستانی سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ موصوف دن رات کے 24 گھنٹے مسلسل کام کرتے ہیں۔ تفصیل پوچھی تو بولے آٹھ گھنٹے ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں' آٹھ گھنٹے پاکستانی سفارت خانے میں اور باقی کے آٹھ گھنٹے ایک گروسری سٹور پر ڈیوٹی دیتا ہوں پوچھا کہ بھائی سوتے کس وقت ہو؟ تو بولے۔

''آپ کو بتایا تو ہے کہ آٹھ گھنٹے پاکستانی سفارت خانے میں بھی ملازمت کرتا ہوں۔''

یہ واقعہ گذشتہ دنوں اردو کے مشہور ادیب کالم نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی نے اپنے اعزاز میں ہونے والی ایک بہت خوبصورت اور پر وقار تقریب میں سنایا جس کا اہتمام مجلس تقریبات ملی پاکستان نے کیا تھا اور جس میں اہل علم و ارباب ذوق بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے۔ عطاء الحق قاسمی جب سے ناروے کے لیے پاکستان کے سفیر نامزد ہوئے ہیں ان کے اعزاز میں الوداعی پارٹیوں کا جمعہ بازار سا لگ گیا ہے' ہماری سماجی زندگی میں یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا واقعہ ہے کہ کسی سفیر کے آنے جانے پر (اس کے دفتر سے غیر متعلق کسی پلیٹ فارم پر) کوئی تقریب نہ صرف منعقد ہو بلکہ اس کا اس قدر چرچا ہو جیسا کہ عطا کے سلسلے میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ہمارے نزدیک اس خوشگوار تبدیلی اور رسم کے اجراء کی بنیادی وجوہات تین ہیں۔

ا۔ عطاء الحق قاسمی' گزشتہ تیس برس میں بطور ایک منفرد کالم نگار اور ادیب کے نہ صرف ملک گیر بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور اپنی تحریر سے کمائی ہوئی نیک نامی کے باعث ایک ایسی مقبول اور معروف شخصیت بن چکے ہیں کہ ان کا اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہونا کسی بھی لحاظ سے سیاسی یا نامناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۲۔ باقاعدہ ادیبوں میں سے غالباً پطرس بخاری مرحوم کی اقوام متحدہ میں بطور پاکستانی مندوب تقرری کے بعد پہلی بار کسی ادیب کو اس نوع کی ذمہ داری سونپی گئی ہے (اور کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہر دو حضرات تدریس اور مزاح کے شعبوں سے متعلق ہیں)

۳۔ اہل علم و ادب' اپنے ملک کے غیر سرکاری تہذیبی سفیر تو ہمیشہ سے رہے ہیں مگر عطاء الحق قاسمی کی اس تقرری سے ایک خوش آئندہ روایت کا آغاز ہو رہا ہے کہ ہمارے ارباب سیاست نے بھی اس شعبے کی اہمیت کو بالآخر محسوس کر لیا ہے اور یوں اس خوبصورت اور مہذب معاشرے کے قیام کی طرف ایک مثبت قدم اٹھایا ہے جہاں جنرل ڈیگال یہ کہہ کر تاریخ میں امر ہو جاتا ہے کہ

''میں سارتر کو کیسے قید کر سکتا ہوں سارتر تو فرانس ہے۔''

مجلس تقریبات ملی کی طرف سے افتتاحی تقریر کے دوران سید شوکت علی شاہ نے جن خیالات اور توقعات کا اظہار کیا ان کا اعادہ تقریباً ہر الوداعی دعوت میں ہو رہا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جہاں عطاء الحق قاسمی کا یہ اعزاز پوری ادیب برادری کا اعزاز ہے وہاں ان پر عائد بھاری ذمہ داریاں بھی ایک طرح سے ہم سب پر عائد ہو گئی ہیں کہ اپنے فرائض کی ادائی اور اس میں نئی اور مثبت جہتوں کی طرف کامیاب پیش رفت سے ان کا ہی نہیں پوری ادیب برادری کا مان بھی وابستہ ہے۔

دوست احباب اور ہم قبیلہ لوگوں کی ترقی اصل میں ایک مشترکہ ترقی ہوتی ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض احباب' مختلف ذاتی وجوہات کے باعث اس اجتماعی عمل کے حسن کو زائل کرنے کے درپے رہتے ہیں اور اپنی ذاتی کوتاہیوں' کمیوں' نا اہلی' نا آسودہ خواہشوں کے بے عمل دفتر یا محض حسد کی وجہ سے تنقید و اعتراض کا ایک ایسا بازار گرم کر دیتے ہیں جس کی گرمی بازار اصل میں ان کے اپنے ہی اندر کی آگ ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی ہی کا ایک جملہ ہے کہ

''بعض لوگوں کو سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں پاتی کہ جو لوگ ان کے دوست یا جاننے والے ہیں وہ معزز کیسے ہو سکتے ہیں؟''

غالب نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ.......

حسد سے دل اگر افسردہ ہے' گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شائد کثرت نظارہ سے وا ہو!

عطاء الحق قاسمی کے ساتھ ''ہزایکسی لینسی'' کا یہ سابقہ تو شائد ایک محدود مدت کے لیے ہو مگر ادب کی دنیا میں وہ اس اعزاز کو بہت پہلے سے حاصل کر چکے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے قلم کی عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے اس ادبی اعزاز کا بھرم رکھا ہے اسی طرح وہ اپنے اس ''سفارت کاری'' کے امتحان میں بھی نہ صرف پاس ہوں گے بلکہ فرسٹ ڈویژن بھی حاصل کریں گے۔

◆◆◆

سوئی سے ایٹم بم تک

چند برس پہلے امریکہ میں ایک تقریب کے دوران کچھ بھارتی پروفیسروں نے ہمیں گھیر لیا اور مختلف علوم' اعداد و شمار اور دانشورانہ تجزیوں کی مدد سے یہ ثابت کرنے لگے کہ پاکستان غلط بنایا گیا تھا اور اور یہ کہ ہم نے اپنی آزادی کے بعد کی چار دہائیوں میں ثابت کر دیا ہے کہ ہم نہ صرف زندگی کے ہر شعبے میں ناکام رہے ہیں بلکہ آئندہ ہمارے قائم رہنے کے امکانات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کی گفتگو میں فی کس آمدنی' قومی پیداوار' معاشی اہداف' کرپشن' مصنوعی اقتصادیات اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں پسماندگی کے ایسے خوفناک اور ہوشربا حوالے تھے اور وہ اپنی باتوں کی تائید کے لیے ایسے ایسے عالمانہ قسم کے ثبوت فراہم کرتے تھے کہ ہمیں سچ مچ انتوں پسینہ آ گیا۔ ہم نے اس بحث سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر وہ لوگ کسی طور پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ بالآخر ہمیں ایک ایسی ترکیب سوجھی جو اکثر مناظرے باز لوگ استعمال کرتے ہیں یعنی مخالف پر کوئی ایسا غیر متوقع اور جگتی دلیل والا حملہ کرو کہ اسے چند لمحوں کے لیے اپنی بات ہی بھول جائے اور وہ اس دلیل کے رد اور دفاع کی بھسوڑی میں پڑ جائے۔

اعتراض کنندگان میں ایک صاحب بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ "ہمیں دیکھیے ہم بھارت میں سوئی سے لے کر ٹینک تک خود بناتے ہیں' ٹیکنالوجی میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں اور ایک آپ لوگ ہیں کہ اتنا غریب ملک ہونے کے باوجود ہر چیز باہر سے منگواتے ہیں' ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی آپ کی پیش رفت زیرو ہے اور اس پر آپ ایٹم بم کی تیاری پر قومی دولت خرچ کرتے چلے جا رہے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے جبکہ ہم سوئی سے ٹینک تک ہر چیز خود بناتے ہیں اور ہر کام قومی مفاد میں کرتے ہیں۔"

ہم نے کہا...... "کیا آپ کو یقین ہے کہ پاکستان نے مشکل ترین ٹیکنالوجی والا ایٹم بم بنا لیا ہے......!"

بولے۔" بالکل...... مجھے پورا یقین ہے۔

ہم نے کہا...... "تو پھر آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں ہم انشاءاللہ سوئی بھی بنا لیں گے۔"

اس جگتی دلیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ گفتگو وہیں ختم ہو گئی اور وہ لوگ ہم سے منہ موڑ کر کمرے کے کسی ایسے حصے میں چلے گئے کہ دوبارہ ان سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

یہ واقعہ اپنی جگہ پر پر لطف اور دلچسپ سہی لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ ہمیں اپنی کارکردگی کے ساتھ ساتھ ناکارکردگی کے

بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ گزشتہ پچاس برس میں جو گرہیں ہم نے ہاتھوں سے دی تھیں اب انہیں دانتوں سے کھولنا پڑ رہا ہے۔ میاں نواز شریف کی ''قرض اتارو ملک سنوارو'' سکیم ہو یا موجودہ خود کفالتی اور خود انحصاری کی مہم' یہ سب اسی غفلت بھری کہانی کے مختلف ابواب ہیں جنہیں نئے سرے سے لکھے بغیر اس قصے کا آگے چلنا مشکل سے مشکل تر ہوتا رہے گا۔

۲۸ مئی کے بعد سے قوم میں جو حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے وہ اگرچہ بے حد مستحسن ہے لیکن اگر اسے ہمارے قومی مزاج اور تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسے قائم اور برقرار رکھنا ایک مشکل' بہت ہی مشکل کام ہے اور جب تک اس تالی کو بجانے میں دونوں ہاتھ یکساں طور پر استعمال نہیں ہوں گے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ عوام میں سابقہ تجربات اور اخلاقی اور سماجی زوال کے باعث پھیلی ہوئی بیماریوں اور قباحتوں کی وجہ سے ایک ایسی بے حسی' خود غرضی' تنقید برائے تنقید اور بے اعتمادی کی روش جڑ پکڑ چکی ہے جو ہر اچھی چیز' تبدیلی اور امکان کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے اور ہماری مجموعی قومی کارکردگی ایک ارتقائی عمل کے بجائے مختلف طرح کے ہیجانات اور ان کے ماتم کا ایک ایسا منظر نامہ بن جاتی ہے جس میں نہ تو کوئی مستقل سمت نظر آتی ہے اور نہ تسلسل۔

دوسری طرف مختلف وقتوں میں آنے والی حکومتیں بھی اپنے نعروں' پروگراموں اور اہداف کے حصول کے سلسلے میں زیادہ تر زبانی جمع خرچ سے ہی کام لیتی رہی ہیں اور ان مشکلات اور دشواریوں کو حل کرنے کے سلسلے میں کوئی بروقت اور مثبت کارروائی نہیں کرتیں جو ان اقدامات کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں اور یوں اچھے اچھے خواب بھی نیندیں اڑانے کا باعث بن جاتے ہیں۔

اب مثال کے طور پر موجودہ حکومت نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کی جس کی بنیادی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کے ذریعے مالی معاملات میں متوقع خرابیوں اور بدعنوانیوں کا سدباب کیا جائے گا مگر ہوا کیا.......! ایک طرف راتوں رات اربوں ڈالر کی بیرون وطن منتقلی کا سکینڈل ہے اور دوسری طرف بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی بھجوائی ہوئی وہ رقوم ہیں جو یا تو راستے میں تھیں یا گزشتہ پندرہ دنوں میں بھجوائی گئی ہیں۔ ہمارے ایک بینکر دوست نے بتایا ہے کہ ہنڈی کا کاروبار ختم یا کم کرنے کے لیے صرف میاں صاحب کی تقریریں ہی کافی نہیں ہیں ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ ڈالر کے بنک ریٹ اور ہنڈی کے ریٹ کے درمیان فرق کو کم سے کم کیا جائے تاکہ ''جذبے'' کو ''عمل'' کی مدد سے زیادہ موثر اور حقیقت پسندانہ بنایا جا سکے۔ اب ہوا یہ ہے کہ پندرہ دن تک سٹیٹ بنک آف پاکستان نے ملک کے سارے بنکوں کو باہر سے بھجوائی جانے والی کرنسی کی شرح تبادلہ کے بارے میں کوئی پالیسی نہیں دی جس کے باعث نہ صرف بنکوں کے ذریعے روپیہ بھجوانے والوں کو ہزار طرح کی پریشانیاں لاحق ہوئیں بلکہ ہنڈی کی افادیت بھی ان کی نظروں میں بڑھ

گئی ہے‘اس پر مزید قیامت یہ کی گئی کہ ان کے ڈالرز کی ادائیگی ۴۶ روپے کی بجائے سرکاری شرح یعنی ۴۴ روپے ۳۰ پیسے پر کرنے کا حکم جاری کیا گیا ہے۔ یوں ان کے بھجوائے ہوئے ڈالر کی سرکاری قیمت اور بازار میں موجود قیمت کے درمیان فرق تقریباً ۵ روپے کا ہوگیا ہے۔ یہ دونوں باتیں وزیراعظم صاحب کی زرمبادلہ جمع کرنے کی مہم کو کتنا نقصان پہنچا سکتی ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے یقیناً ڈاکٹر محبوب الحق صاحب سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سو ہم یہی عرض کریں گے کہ ایٹم بم کے بعد یہ جو سوئی بنانے کا مرحلہ آیا ہے تو اس کو صرف تقریروں اور خواہشوں کے سپرد نہ کردیا جائے کہ یہ معاملہ بہت احتیاط اور بصیرت مانگتا ہے۔

◆◆◆

تعلیم اور طلبہ سیاست

چند برس پہلے کی بات ہے ہم اپنے کالج کے پرنسپل کے کمرے میں بیٹھے تھے' صورتحال یہ تھی کہ ایک حکومت کی تبدیلی کے بعد دوسری سیاسی پارٹی برسراقتدار آئی تھی اور اس نئی حکومت کی متعلقہ طلبہ تنظیم کالج پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے کلاشنکوفوں' موزروں اور پستولوں وغیرہ سے مسلح ہو کر آئی تھی اور اس وقت اس کے ارکان ''مخالف دھڑے'' کو ''بزور شمشیر'' پسپا کرنے کے بعد کالج کی چھت اور ہوسٹل پر چھاؤنیاں لگائے بیٹھے تھے۔ اسلحے کی عام نمائش جاری تھی اور گھر سے پڑھنے کے لیے آنے والے بچے اساتذہ سے پوچھ رہے تھے کہ اندریں حالات انہیں کیا کرنا چاہیے؟

پرنسپل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور علاقے کے ڈی ایس پی صاحب دھڑدھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ پولیس کی بھاری نفری بھی ہے۔ ڈی ایس پی نے آتے ہی پرنسپل پر چڑھائی کردی کہ آپ لوگوں سے کالجوں کا انتظام نہیں سنبھالا جاتا...... یہاں غنڈہ گردی ہوتی ہے اور طلبہ آئے دن لاء اینڈ آرڈر کے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں جس کی ساری ذمہ داری ان کے اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ پرنسپل بے چارا جو پہلے ہی خوفزدہ اور نڈھال بیٹھا تھا ڈی ایس پی صاحب کے بھاشن کو سن کر بالکل ہی گم سم ہوگیا۔ اس پر وہ پولیس آفیسر اور شیر ہوگیا اور اب اس نے کمرے میں بیٹھے ہوئے اساتذہ کو بھی لتاڑنا شروع کردیا۔ اس پر ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے اس سے چند سوال کیے......

ا۔ کیا آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ جو مسلح نوجوان اس وقت اس کمرے کی چھت پر مورچہ لگائے بیٹھے ہیں اور جن کا اسلحہ باہر سڑک سے گزرنے والوں کو بھی نظر آرہا ہے' اس کالج کے طالب علم ہیں؟

۲۔ وہ کسی بھی کالج کے طالب علم ہیں؟

۳۔ کیا کالجوں کے اساتذہ کو اسلحہ بردار اور پیشہ ور بدمعاشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مطلوبہ تربیت دی گئی ہے کہ وہ ہتھیاروں سے ان عناصر کا مقابلہ کریں؟

۴۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر نئی حکومت کے آنے پر پولیس اپنی نگرانی میں متعلقہ سیاسی پارٹی سے وابستہ طلبہ تنظیم کو کالجوں اور ہوسٹلوں کا قبضہ دلواتی ہے؟

۵۔اگر یہ غنڈہ عناصر اس کالج کے طالب علم نہیں تو کیا کالج ہذا کے اساتذہ کے کہنے یا سمجھانے پر وہ غنڈہ گردی سے باز آسکتے ہیں؟

۶۔ان نوجوانوں کو ہتھیار کون فراہم کرتا ہے؟

۷۔تربیت یافتہ اور مسلح پولیس کی آمد کے باوجود اگر یہ لوگ بدستور موجود ہیں اور اسلحے کی نمائش بھی کر رہے ہیں تو انہیں روکنے یا پکڑنے کا فریضہ اساتذہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں؟

اس کے علاوہ بھی کچھ استفسارات تھے لیکن ان کا تعلق بھی چونکہ انہیں سوالوں کے مختلف پہلوؤں سے تھا اس لیے ہم ان کی تفصیل سے صرف نظر کرتے ہیں۔ڈی ایس پی صاحب کے پاس اول تو ان سوالات کے جواب تھے نہیں اور اگر تھے بھی تو اس غیر متوقع مدافعت کے باعث وہ اتنے پریشان ہو گئے تھے کہ سوائے چند الٹی سیدھی وضاحتوں اور جان چھڑانے کی کوشش کے وہ کچھ نہ کر سکے اور آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے وہاں سے کھسک گئے۔

اس سارے واقعے کو رقم کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ طلبہ سیاست کی اصل صورتحال اور اس کے محرکات کو سمجھا جا سکے اور اس بات پر غور کیا جائے کہ اس مسئلے کی جڑیں کہاں ہیں؟ اسے پانی کہاں سے ملتا ہے؟ یہ کس ہوا میں سانس لیتا اور پھولتا پھلتا ہے اور اس کے ظاہری اور پوشیدہ مالی کون کون اور کہاں کہاں ہیں؟

تحریک پاکستان کے دنوں میں قائداعظم نے طلبہ کو جس طرح اپنے ساتھ لیا اور ان میں اتحاد' ایمان اور تنظیم کے جوہر پیدا کیے وہ تو ہماری تحریک آزادی کا ایک زریں باب اور قابل فخر سرمایہ ہے لیکن ان کے بعد آنے والی لیڈر شپ میں صلاحیت اور وژن کا اس قدر فقدان تھا کہ چند ہی برسوں میں طلبہ نہ صرف قومی دھارے سے کٹ گئے بلکہ غلط' بے جہت اور تجرباتی قسم کے نظام تعلیم کے باعث ہمارے یہاں سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھنے کے باوجود معیاری اور اقداری سطح پر کسی قسم کی پیش رفت نہ ہو سکی سابقہ مشرقی پاکستان میں تو طلبہ کا ردعمل اس قدر شدید تھا کہ اس کی گونج بنگلہ دیش کی صورت میں اب ہماری قومی تاریخ کے ایوانوں میں ایک چیخ بن کر ٹھہر چکی ہے۔جہاں تک موجودہ پاکستان کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء کے بعد طلبہ قوت کا اظہار پہلی بار ملک امیر محمد خان نواب آف کالا باغ کے زمانے میں ہوا جب یونیورسٹی آرڈی نینس کے حوالے سے طلبہ نے احتجاج کیا۔سڑکوں پر نکلے' ماریں کھائیں اور بالآخر نواب صاحب مرحوم کی راج ہٹ کے سامنے وقتی طور پر سرنگوں ہو گئے۔

اس کے بعد کا زمانہ چونکہ ہمارا چشم دید ہے اس لیے ہم اس پر نسبتاً زیادہ اعتماد سے رائے زنی کر سکتے ہیں۔۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی یونین پر پابندی عائد تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا جیسے تعلیمی اداروں سے طلبہ کی اپنی اور قومی دونوں طرح کی سیاست کو دیس نکالا

مل گیا ہے لیکن انہی دنوں میں معاہدہ تاشقند کے حوالے سے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے جنرل ایوب خان کے خلاف تحریک شروع کی (جس کے بطن سے آگے چل کر پاکستان پیپلز پارٹی نے جنم لیا۔) وہ خود بھی جوان تھے اور جوان نسل کی طاقت' اہمیت اور صلاحیت سے بھی بخوبی واقف تھے سوان کے اولین ساتھیوں میں بہت سے لوگ یا تو طالب علم تھے یا کسی نہ کسی حوالے سے طلبہ سیاست سے متعلق رہ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ نہ صرف تعلیمی اداروں میں موجود واحد منظم اور باقاعدہ تنظیم تھی بلکہ اس کے ممبران ایک ایسے مخصوص مزاج' سوچ اور انداز کے بھی حامل ہوا کرتے تھے جو انہیں واضح طور پر دیگر طلبہ سے ممتاز اور ممیز کرتا تھا۔ عمومی طور پر طلبہ سیاست تعلیمی اداروں کی حدود تک محدود تھی اور تشدد اور اسلحہ اگر ناپید نہیں تو انتہائی کمیاب ضرور تھے۔

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ طلبہ سیاست میں اسلحے اور تشدد کی آمد اور فروغ کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟ اور کیا اس کا باعث پیپلز پارٹی کے قیام یا سوشلسٹ خیالات کے حامل طلبہ کی تنظیموں کو قرار دیا جاسکتا ہے یا اس کا تعلق سقوط ڈھاکہ اور اس سے پیدا ہونے والی صورتحال سے تھا؟

ہمارے ذاتی خیال اور اندازے کے مطابق یہ تینوں باتیں جزوی طور پر درست ہیں لیکن سب سے اہم وجہ اسلامی جمعیت طلبہ کا وہ ردعمل تھا جس میں پہلی بار اس کی اجارہ داری کو ایک سچ مچ کا خطرہ لاحق ہوا اور اس نے اپنی تنظیمی قوت' تاریخی برتری اور استعداد کی بنیاد پر ایک ایسا راستہ اپنا لیا جس نے آگے چل کر طلبہ سیاست میں ان بہت سے منفی رویوں کو جنم دیا جن کے باعث ہمارے تعلیمی ادارے اس وقت پیشہ ور طلبہ تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کی پشت پناہی پر پلنے والے نام نہاد طالب علم لیڈروں اور ان کے ساتھی قانون شکن عناصر کے ہاتھوں میں مال غنیمت کی طرح بٹے ہوئے ہیں۔...... اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ طلبہ سیاست کا موجودہ بگاڑ اسلامی جمعیت طلبہ کا پیدا کردہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تنظیم اپنی بہت سی خصوصیات کے باعث اس وقت بھی طلبہ کی واحد تنظیم ہے جو ان کے کردار کی تربیت کو اپنے منشور کا حصہ قرار دیتی ہے اور بہت سی ایسی مثبت روایتوں کی بھی امین اور پاسدار ہے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے مگر جہاں تک طلبہ سیاست کے اس ارتقائی عمل کا تعلق ہے یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلمہ ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ اس ڈرامے کا ایک مرکزی کردار ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ کتاب سے کلاشنکوف تک کا یہ سفر ہمیں کن منزلوں کی طرف لے جارہا ہے اور اس کا راستہ کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے!

(جاری ہے)

◆◆◆

تعلیم اور طلبہ سیاست (۲)

۱۹۷۰ء کی دہائی کے ابتدائی چند برسوں میں جو طلبہ سیاست میں حصہ لیتے تھے ان میں سے بیشتر کا تعلیمی کیریئر اگر بہت اچھا نہیں تو مناسب ضرور ہوتا تھا۔ یہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدگی سے پڑھتے اور امتحانات پاس کرتے تھے اور پولیس کی فائلوں' رپورٹوں اور ایف آئی اروں میں بھی ان کا ذکر خال خال ہی ہوا کرتے تھا۔ پولیس مقابلے' جگا ٹیکس' غنڈہ گردی اور کالجوں پر قبضے کی روایت کے آثار تو کہیں کہیں نظر آتے تھے مگر مخالف تنظیموں سے وابستہ بندے اٹھانے' سر عام فائرنگ کے مظاہرے کرنے یا اخبارات کے پہلے صفحے پر اشتہاری ملزموں کے انداز میں تصویریں چھپوانے کا رواج ابھی نہیں پڑا تھا۔ طلبہ اپنا بڑے سے بڑا جھگڑا بھی ہاکیوں وغیرہ سے طے کرلیا کرتے تھے اور وہ لڑکا تو سکہ بند بدمعاش سمجھا جاتا تھا جس کی جیب میں چاقو یا کوئی آہنی مکہ ٹائپ ہتھیار پایا جاتا تھا۔

ہمارے خیال میں طلبہ سیاست کے بگاڑ کی اصل ذمہ دار ہماری قومی سیاست ہے کہ جب سے سیاسی جماعتوں نے تعلیمی اداروں میں اپنے گڑھ بنانے شروع کیے ہیں طلبہ سیاست اپنے محور سے ہٹ کر ایک ایسے دائرے میں گھومنے لگی ہے جس کا کوئی بھی تعلق کم از کم ان طلبہ مسائل سے نہیں ہے جن کے حل کے لیے تعلیمی اداروں میں یونینز بنائی جاتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں اور ان کے لیڈران کرام کی طلبہ کے معاملات میں اس براہ راست دخل اندازی کا ہی نتیجہ ہے کہ اب طلبہ تنظیموں کے عہدیداروں میں ایسے ایسے نوجوان بھی پائے جاتے ہیں جن کی اگر وقت پر شادی ہوجاتی تو آج ان کے بچے کالجوں میں زیر تعلیم ہوتے۔ ایسے نام نہاد طالب علم بھی ہیں جنہیں کسی کلاس روم کی آخری بار شکل دیکھے پانچ یا اس سے بھی زیادہ برس ہو چکے ہیں۔ بہت سے طالب علم لیڈر ایسے بھی ہیں جو کئی کئی سال ایک ہی کلاس میں گزارتے ہیں اور واضح اور سخت قوانین ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے ''داخلے'' کو قائم رکھتے ہیں۔

اس معاملے کا ایک اور خوفناک بلکہ شرمناک پہلو یہ ہے کہ پولیس اگر کبھی اتفاقاً یا ارادتاً اس نوع کے کچھ نام نہاد طلبہ کو گرفتار کر بھی لے تو شام سے پہلے پہلے ان کے ''مربی'' انہیں تھانوں سے ''باعزت اور باحفاظت'' واپس لے آتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ ایک بہت عام سی بات لگتی ہے لیکن ہم اپنے خاصے طویل تدریسی تجربے کی بنیاد پر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ صرف اس ایک عمل کی وجہ سے درجنوں ایسے طالب علم جنہیں زیادہ سے زیادہ غیر ذمہ دار اور ہنگامہ پسند کہا جاسکتا تھا باقاعدہ بدمعاش' ڈکیت اور قاتل بنے ہیں اور

ان میں سے کئی ایک اب مقتول بن کر اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں کیونکہ یہ احساس تحفظ کہ آپ کوئی بھی جرم کر کے محض سیاسی پشت پناہی کی وجہ سے سزا سے بچ سکتے ہیں' ایک ایسا نشہ ہے جو سیدھا سر کو چڑھتا ہے اور اس کے بعد باقی ساری چیزیں بے معنی اور بے مقصد ہو جاتی ہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے سیاستدانوں کی اس کرنی کے باعث کئی عام' سیدھے سادھے اور ٹھیک ٹھاک لڑکوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔ طاقت' بدمعاشی اور مفت خوری کی یہ چاٹ جب ایک بار منہ کو لگ جاتی ہے تو پھر انہیں کوئی اور ذائقہ یاد نہیں رہتا' تعلیم ان کی آڑ اور تعلیمی ادارے ان کے اڈے بن جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے ''آقاؤں'' کی شہ پر پیشہ ور قاتل اور بدمعاش بنتے چلے جاتے ہیں اور یوں ماؤں کے معصوم بچے' باپوں کی امیدوں کے مرکز اور بہنوں بھائیوں کے مستقبل کے رکھوالے جوان عمری میں ڈھیر ساری بدنامی سمیٹنے کے بعد ایک دن اپنے ہی جیسے کسی کرائے کے قاتل کی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مقتولوں کو اس انجام تک پہنچانے والوں' نوجوانی میں ان کی عمروں کے چراغ گل کرنے والوں اور ان کے ہاتھوں سے کتاب لے کر کلاشنکوف تھمانے والوں کو کون اور کب کڑے اور روکے گا؟

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے کوئی پندرہ برس قبل ہمارے کالج میں ایک معصوم سا دبلا پتلا لڑکا داخل ہوا' ذہانت کے اعتبار سے اگرچہ وہ ایک عام سا طالب علم تھا مگر ڈسپلن' تمیز اور تہذیب کے اعتبار سے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ چند مہینوں میں اس کا جسم اور قد بڑھ گئے اور اس نے پنجابی فلموں کے بدمعاشوں والی داڑھی بھی بڑھا لی پھر معلوم ہوا کہ وہ ایک طلبہ تنظیم کا جونیئر لیڈر بن گیا ہے۔ ایک دن ہم کالج پہنچے تو اس لڑکے کو چند پروفیسروں کے درمیان کھڑے پایا۔ ایک بوڑھا رو رو کر اسے گھر چلنے کو کہہ رہا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ اس کا باپ ہے جو کسی ڈاک خانے میں کام کرتا ہے اور اب پروفیسروں کی وساطت سے اسے گھر چلنے کو کہہ رہا ہے' جو وہ باپ کے ٹوکنے اور بدمعاشی سے منع کرنے کی وجہ سے ایک ماہ سے چھوڑ چکا ہے۔ یہ لڑکا اپنی تمام تر بدمعاشی اور بے راہ روی کے باوجود اساتذہ کا بہت احترام کرتا تھا اور ان کے سامنے ہمیشہ نظریں نیچی کر کے اور آہستہ آواز میں بولا کرتا تھا۔ کچھ دیر تو وہ باپ کی آہ وزاری کو لاتعلقی کے انداز میں دیکھتا اور سنتا رہا پھر اساتذہ کے سمجھانے پر اس نے ایک عجیب سا جملہ کہا جو کچھ یوں تھا۔

''سر' میرا مہینے کا خرچ تین ہزار روپے ہے جو اس کی تنخواہ سے زیادہ ہے۔ اسے کہیں یہ میرا خرچہ اٹھا لے میں اس کے گھر واپس چلا جاتا ہوں۔''

اور پھر چند سال بعد ایک دن اخبار میں آیا کہ اس لڑکے کو طلبہ تصادم کے دوران بہت سی گولیاں لگی ہیں اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا فلاں ہسپتال میں پڑا ہے۔

یہ خبر' ان بہت سی خبروں کا نمونہ ہے' جو آئے دن اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں ماؤں کے جگر گوشے' قوم کا مستقبل' خدا کی مخلوق اور خاندانوں کی امیدوں کے مرکز اسی طرح رزق خاک ہوتے چلے جاتے ہیں اور کوئی ان اصل بدمعاشوں کو پکڑتا یا ان کی نشاندہی نہیں کرتا جو ان بچوں کو روپیہ اور تحفظ فراہم کر کے ان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ کوئی قانون ایسا نہیں جو ان قاتلوں کو پکڑے اور انہیں ان کے کیے کی سزا دے۔

اب حسن اتفاق سے مرکز اور صوبوں میں ایسی حکومتیں بن گئی ہیں جنہیں ہارس ٹریڈنگ اور لوٹا سیاست کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کی مجبوری بھی نہیں رہی سو یہی وقت ہے کہ اس مذموم اور انتہائی خطرناک روش کو روکا جائے۔ تعلیمی اداروں سے بلا استثنا تمام سیاسی جماعتوں کا عمل دخل ختم کر دیا جائے اور اس کا آغاز برسر اقتدار حکمران پارٹی خود اپنی صفوں سے کرے اور ایسی ہر طلبہ تنظیم سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر دے جو کسی نہ کسی حوالے سے ان سے منسوب ہے یا اپنے آپ کو ان سے منسوب کرتی ہے کیونکہ یہی وہ جائز' صحیح اور قابل عمل طریقہ اور راستہ ہے جس پر چل کر دوسری سیاسی جماعتوں اور گروہوں کو ایسا کرنے سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

تعلیم .... ترجیح اور ترقی کے حوالے سے پہلے ہی ہماری قومی پالیسیوں میں افسوسناک حد تک تغافل کا شکار ہے۔ اگر اس میں سیاست کی آلودگی بھی اسی طرح شامل ہوتی رہی تو آنے والے کل میں اگر ہم نے چاہا بھی تو حالات کو بہتر نہیں کر سکیں گے سو ہم اکابرین حکومت سے یہی کہیں گے کہ جہاں وہ اتنے اچھے اچھے کاموں کا ڈول ڈال رہے ہیں کچھ اس طرف بھی توجہ دیں اور اس کارِ خیر کی ابتداء اسی اعلان سے کریں کہ آئندہ سے کسی بھی سیاسی جماعت کو تعلیمی اداروں میں اپنی طلبہ شاخ قائم کرنے یا رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

◆◆◆